DUE DATE

Cl. No ______ *Acc. No.* ______

Late Fine Ordinary Books **25 Paise** per day. Text Book **Re. 1/-** per day. Over Night Book **Re. 1/-** per day.



حالی - آرنلڈ - نذیر احمد خان - محسن الملک - شبلی - وقار الملک

نئی جلد کے تحفے

آج جلد ہشتم شروع ہوتی ہے۔ اور ہم دوستوں سے تحفوں کے منتظر ہیں۔ جن حضرات نے گذشتہ مہینے کی التماس پر توجہ فرما کر نئی جلد پر اظہار مسرت کیا ہے اور نئے خریداروں کے نام بطورِ تحفہ بھیجے ہیں۔ اُن کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ لیکن ابھی بہت سے حضرات ہیں۔ جو شاید تقاضے کے منتظر ہیں۔ ہم اُن سے صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں۔ کہ اگر وہ حقیقت میں **مخزن** کو پسند کرتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ یہ زندہ رہے اور اپنی خوبیوں اور خصوصیتوں میں ترقی کرے تو اسے شاباش دیں اور اس کا حوصلہ بڑھائیں اور اسکی عملی صورت خریداروں کی تعداد بڑھانا ہے۔ ہمت کریں اور کسی دوست کو جو پہلے سے خریدار نہ ہو پرچہ دکھا کر ترغیب تو دیں۔ آگے پرچے کی قوتِ جذب اور قسمت۔ تقاضے کے منتظر نہ رہیں۔ ہم تو ایک آدھ دفعہ بھی ایسی درخواست مجبوراً کرتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ ہمیں خوگرِ سوال نہ بنا دیں

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جسکو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اگر ہمیں پرچے سے نفع حاصل ہونا شروع ہو گیا ہو۔ تو ہم اس قسم کی تحریک کو۔ جو عموماً جائز اور ہندوستان کے خاص حالات کے اعتبار سے حلال طیب ہے۔ اپنے خاص عقیدے کے رُو سے معیوب سمجھیں۔ لیکن چونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں تحفے بھی بن مانگے نہیں ملتے۔ اِس لیئے لب کشا ہوتے ہیں۔

آیئے اور لایئے

بدتصریحات پائی جاتی ہیں۔ کتب ادبیہ میں مذکور ہے کہ ایک دفعہ حسّان بن ثابت کے ایک صغیر السن بچہ کو بھڑ نے کاٹ کھایا۔ وُہ حسّان کے سامنے روتا ہوا آیا۔ کہ مجھ کو ایک جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسّان نے جانور کا نام پوچھا وُہ نام سے واقف نہ تھا۔ حسّان نے کہا اچھا اُس کی صُورت کیا تھی: بچہ نے کہا :-

کَاَنَّہٗ مُلتَفٌّ بِبُرْدَیْ حِبَرَۃٍ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وُہ مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔ بچہ کو بھڑ نے کاٹا تھا۔ اور چونکہ بھڑ کے پروں پر دھاریاں ہوتی ہیں۔ اِس لئے اُس نے مخطط چادر سے تشبیہہ دی۔ حسّان اس کے مُنہہ سے یہ الفاظ سُنکر اُچھل پڑے اور جوش کے جوش میں کہا کہ وَاللهِ صَارَ ابْنِی الشَّاعِرُ یعنے خُدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہوگیا۔ وُہ فقرہ موزُون نہ تھا۔ لیکن چونکہ تشبیہہ اچھی تھی حسّان نے سمجھا کہ بچہ میں شاعری کی قابلیت موجود ہے۔ اِس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے نزدیک شعر کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ابن رشیق قیروانی نے عرب کی شعروشاعری پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ اس میں شُعراء اور علمائے ادب کے جو اقوال نقل کئے ہیں اُن سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ شُعرائے فارس کے نزدیک بھی شاعری دراصل تخیّل کا نام تھا۔ نظامیِ عروضی سمرقندی جو خود بہت بڑا شاعر اور نظامی گنجوی سے متقدم تھا۔ اپنی کتاب چہار مقالہ میں لکھتا ہے :-

"شاعری صناعتے است کہ شاعر بداں صنعت اتساقِ مقدماتِ موہومہ کُند۔ و التیامِ قیاس منتجہ برآں وجہ کہ معنی خورد را بزرگ کند۔ و بزرگ را خورد۔ و نیکو را در لباس زشت وزشت را در حلیۂ نیکو جلوہ دہد۔ و بایہام قوت ہائے غضبانی وشہوانی برانگیزد۔ تا بداں ایہام طبائع را انبساطے وانقباضے بود و امور عظام را در نظامِ عالم سبب گردد"

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ شاعری اس فن کا نام ہے کہ مقدمات موہومہ کی ترتیب سے۔ اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت کیجائے۔ اور محبت وغضب کی قوتیں مشتعل کردی جائیں"۔ یہ تو قُدما کے اقوال وخیالات تھے۔ یورپ کے نکتہ سنجوں نے اس

مسئلہ پر نہایت دقیق بحثیں کی ہیں اور عجیب عجیب نکتے پیدا کئے ہیں - **مِل** نے اس پر ایک نہایت مفصل اور بسیط مضمون لکھا ہے جسکا نہایت مختصر خلاصہ حسب ذیل ہے :-

"انسان کی مدرکات میں سے بعض ایسے ہیں جن سے جذبات انسانی کو کچھ تعلق نہیں ہوتا - مثلاً اگر ہم اقلیدس کا کوئی مسئلہ حل کریں - تو اس سے ہم کو غصہ یا جوش یا رنج نہیں پیدا ہوگا - لیکن اگر ہمارے سامنے کسی شخص کی مصیبت کا حال درد انگیز لفظوں میں بیان کیا جائے تو اس واقعہ کے ادراک کے ساتھ ہم پر ایک اثر طاری ہوگا - اس قسم کے اثروں کا نام جذبات یا احساسات ہے - اور جو چیز ان جذبات اور احساسات کو برانگیختہ کر سکتی ہے - وہی **شاعری** ہے - اس تعریف میں تصویر - تقریر - وعظ بھی شعر کی تعریف میں داخل ہو جاتے ہیں - کیونکہ یہ چیزیں بھی جذبات انسانی کو برانگیختہ کر سکتی ہیں - اسی بنا پر بعضوں نے ان چیزوں کو بھی شاعری میں داخل کر لیا ہے - لیکن مِل صاحب کے نزدیک یہ چیزیں شاعری کے دائرہ سے باہر ہیں - وہ کہتے ہیں کہ "انسان جو کلام کرتا ہے اسکی غرض کبھی تو دوسروں پر اثر ڈالنا ہوتا ہے - مثلاً اسپیچ - لکچر وغیرہ کہ ان سب کا مقصد دوسروں کا متاثر کرنا ہوتا ہے - اور کبھی دوسروں سے مطلق غرض نہیں ہوتی - بلکہ انسان محض اپنے آپ سے خطاب کرتا ہے اور اپنا آپ ہی مخاطب ہوتا ہے - مثلاً اگر کسی شخص کا بیٹا مر جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ نکلینگے اسکی غرض کسی شخص یا گروہ کو مخاطب کرنا نہ ہوگا - بلکہ وہ اپنا آپ مخاطب ہوگا - فرض کرو کہ وہاں کوئی شخص موجود نہ ہو تب بھی وہی الفاظ اس کی زبان سے نکلینگے - شاعری اسی قسم کے کلام کا نام ہے - اس بنا پر شاعری کی تعریف منطقی طور پر کرنا چاہیں تو یوں کہیں گے کہ جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذباتِ انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں - بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو - اسکا نام شاعری ہے"۔

مِل صاحب کی یہ تعریف اگرچہ نہایت باریک بینی پر مبنی ہے - لیکن اس سے شاعری کا

دائرہ نہایت تنگ ہوجاتا ہے۔ اور اگر اسی کو معیار قرار دیا جائے تو فارسی اور اُردو کا دفتر بے پایان بالکل بیکار ہوجائیگا ؛

حقیقت یہ ہے کہ شعر کا دائرہ نہ اس قدر تنگ ہے جیسا مل صاحب کرنا چاہتے ہیں اور نہ اِس قدر وسیع جتنا ہمارے عُلمائے ادب نے کیا ہے۔ شعر کی تعریف جو ارسطو نے کی وُہ نہایت معتدل ہے اور اسی کو اس بحث کا فیصلہ قطعی قرار دینا چاہیئے ؛

ارسطو کے نزدیک شعر ایک قسم کی مُصوّری اور نقالی ہے۔ فرق یہ ہے کہ مُصوّر صرف مادّی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اِس کے شاعر ہر قسم کے خیالات۔ جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے ؛

ایک شخص کا عزیز دوست جُدا ہو رہا ہے۔ اِس حالت میں اس پر جو صدمے گذرتے ہیں اور دل دوز خیالات کا جو طُوفان اُس کے دِل میں اُٹھتا ہے۔ شاعر اس کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ اگر رنج و غم مادی چیزیں ہوتیں اور انکی تصویر کھینچی جاتی تو وہی ہوتی جو شاعر نے الفاظ کے ذریعہ سے کھینچی تھی ؛

اِس بنا پر کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اس شے کی اصلی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے تو اُس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی۔ دریا کی روانی جنگل کا سناٹا۔ باغ کی شادابی۔ سبزہ کی لہک۔ خوشبو کی لپٹ۔ نسیم کے جھونکے۔ دُھوپ کی شدت۔ گرمی کی طپش۔ جاڑوں کی ٹھنڈ۔ صبح کی شگفتگی۔ شام کی دلاویزی۔ یا رنج۔ غم۔ غیظ۔ غضب۔ جوش۔ محبّت۔ افسوس۔ حسرت۔ خوشی۔ اِن اشیا کا اس طرح بیان کیا جائے کہ اُنکی صُورت آنکھوں میں پھر جائے یا وُہی اثر دل پر طاری ہوجائے۔ یہی شاعری ہے۔

ایک اَور پیرایہ میں شاعری کی تعریف کیجاسکتی ہے اور وُہ بھی ارسطو کی تعریف کے قریب قریب ہے۔ دُنیا میں جس قدر قدرت کے مظاہر ہیں۔ خواہ مادّی ہوں۔ مثلاً پہاڑ۔ بیابان۔ باغ۔ دریا وغیرہ خواہ غیر مادّی مثلاً وصل۔ ہجر۔ تحسین۔ نفرین اِن سب سے

دل پر اثر پڑتا ہے اور ہر شخص کے دل پر پڑتا ہے - لیکن اثر کے مراتب متفاوت ہوتے ہیں - بعض اشخاص پر کم - بعض پر زیادہ - اور بعض پر بہت زیادہ ہوتا ہے - جو شخص ان مظاہر قدرت سے عام لوگوں کی نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو بعینہ ادا بھی کر سکتا ہو وہی شاعر ہے +

شاعر کے جذبات اور احساسات نطرۃً نہایت نازک - لطیف اور سریع الاشتعال ہوتے ہیں - دوست کی جدائی ہر شخص پر اثر کرتی ہے - لیکن شاعر اس موقع پر بالکل بیتاب ہوجاتا ہے - دریا کی روانی سے ہر شخص محظوظ ہوتا ہے - لیکن شاعر پر وجد کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے - سبزہ کے دیکھنے سے ہر شخص کو فرحت ہوتی ہے - لیکن شاعر جھومنے لگتا ہے - ممکن ہے کہ اس درجہ کی کیفیت دوسروں پر بھی طاری ہو - لیکن وہ لوگ اس کیفیت کو الفاظ کے ذریعہ سے اس طرح ادا نہیں کر سکتے - جس طرح شاعر کر سکتا ہے - حاصل یہ کہ جو شخص واقعات اور مظاہرِ قدرت سے تمام لوگوں کی بہ نسبت زیادہ متاثر ہو اور اس اثر کو الفاظ کے ذریعہ سے پورا پورا ادا بھی کر سکتا ہو - وہی شاعر ہے +

شاعری کی حقیقت میں یورپ کے محققین کے نزدیک وزن کا ہونا ضرور نہیں - لیکن عرب و عجم کے نزدیک ضروری ہے - اہلِ عرب خطبہ اور شعر کو دو مختلف چیز خیال کرتے تھے - حالانکہ خطبہ اور شعر میں تخیل و معنی کے لحاظ سے کچھ فرق نہ تھا - ارسطو نے بھی کتاب الشعر میں وزن کو شعر کا ایک ضروری جزو قرار دیا ہے - محقق طوسی نے لکھا ہے کہ یونانیوں کے نزدیک شعر کے لئے وزن کی ضرورت نہیں - لیکن یہ غلطی ہے - ارسطو کی کتاب الشعر آج موجود ہے - اور اس میں صراحتہً اس کے خلاف ہے - محقق طوسی کو اس وجہ سے دھوکا ہوا کہ ارسطو نے منطق میں قیاساتِ شعری کا جو ذکر کیا ہے - اس میں وزن کو غیر ضروری قرار دیا ہے - لیکن قیاس شعری اور چیز ہے اور شعر اور چیز - دونوں میں عام وخاص کی نسبت ہے +

شعر کا طبیعت پر اثر کرنا ایک فطری بات ہے۔ شعر دراصل دو چیزوں کا نام ہے۔ مُصوّری اور موسیقی اور یہ دونوں چیزیں فطرۃً انسان کے دل پر اثر کرتی ہیں۔ قُدرت نے انسان میں یہ مادہ رکھا ہے کہ اسکو تصویر اور نقل سے اس قدر مزہ آتا ہے کہ خود اصل شئے سے نہیں آتا۔ ایک چھپکلی یا کھنکھجورے کو تم دیکھو۔ تو تم کو نفرت ہوگی۔ لیکن اگر کوئی شخص کھنکھجورے کی ایسی تصویر کھینچدے کہ اصل کا دھوکا ہو۔ تو تم کو خواہ مخواہ لُطف آئیگا۔ اسی طرح موسیقی اور راگ کا اثر ہے جو فطرۃً طبیعت پر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ جانور بھی اس اثر سے خالی نہیں۔ چُونکہ شعر انہی دونوں چیزوں یعنی مصوّری اور موسیقی کا مجموعہ ہے۔ اِس لئے اس کا دِل پر اثر ہونا ایک فطرتی امر ہے۔ اِس سے یہ نکتہ بھی ثابت ہُوا کہ شعر میں یہ دونوں باتیں کمال کے جس درجہ پر ہونگی۔ اِسی نسبت سے دِل پر اس کا اثر ہوگا +

شِبلی نُعمانی

کارڈ آف ٹیبل

امام غزالی علیہ الرحمۃ نے اپنی مشہور کتاب "اَحیاء العُلوم" میں معاشرت کے جو آداب لکھے ہیں۔ لُطف یہ کہ وُہ ایشیائی طریقہ کی نسبت زیادہ تر مہذب ممالک کے طریقہ سے ملتے ہیں۔ مثلاً کھانے کے آداب میں وُہ لکھتے ہیں:۔ "کھانا کسی اُونچی چیز پر (عربی میں اسکو خوان کہتے ہیں) رکھکر کھانا چاہئے۔ کھانے باری باری سے آنے چاہئیں۔ لطیف کھانا (شوربہ وغیرہ) پہلے آنا چاہئے۔ اگر اکثر مہمان آچکے ہوں۔ اور صرف ایک دو باقی ہوں۔ تو کھانا شروع کر دینا چاہئے۔ کھانے کے بعد میوے۔ یا کوئی شیرینی آنی چاہئے" اسی مضمون میں لکھتے ہیں۔ کہ بعض لوگوں میں طریقہ تھا۔ کہ تمام کھانوں کے نام پرچہ پر لکھکر مہمانوں کے سامنے پیش کئے جاتے تھے۔ اُنکی خاص عبارت یہ ہے۔ "وحکی ان بعض اصحاب المروات انّہ کان یکتب نسخۃ بما یستحضر من الالوان ویعرض علی الضیفان" + اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کارڈ آف ٹیبل کا طریقہ یورپ کی اپنی ایجاد نہیں ہے +

(الغزالی)

(عبدالسلام رفیقی)

سیرِ ایران

ریورنڈ مسٹر ملکم جان۔ حیدر آباد۔ دکن میں عیسوی چرچ کے ایک معزز رکن ہیں۔ ہیں ہندی نژاد اس لئے ہندوستان کی ہمدردی انکے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ دنیا کے جن حصّے کو بھی ہندوستانی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ خصوصاً ایشیائی مذاہب اور خصوصاً اسلام کے مطالعہ کا انہیں موقعہ ملا ہے۔ اور اس لئے مسلمانوں کے حالات سے انہیں غیر معمولی دلچسپی ہے۔

کچھ عرصہ ہوا انہوں نے چند مہینے ایران میں بسر کئے تھے۔ اور آج کل وہ بسبیلِ سیاحت یورپ میں سفر کر رہے ہیں۔ سال بھر کے قریب آکسفورڈ میں مقیم رہے۔ اب کبھی لنڈن میں رہتے ہیں۔ اور کبھی یورپ کے کسی اور مقام کی سیر کو چلے جاتے ہیں۔ انہوں نے زبانی مجھے اپنے حالاتِ سفرِ ایران سنائے تھے۔ میں نے درخواست کی کہ وہ اپنے حالات اور خیالات کو قلمبند فرما دیں۔ تو دوسرے اہلِ وطن کی آگاہی کا باعث ہو۔ انہوں نے مہربانی سے اس درخواست پر توجہ فرمائی جس کا نتیجہ یہ دلچسپ مضمون ہے:۔ (عبد القادر)

سیر و سیاحت ہر انسان کے لئے عموماً اور اس انسان کے لئے جو چشمِ بصیرت رکھتا ہو نہایت مفید مشغلہ ہے۔ اکثر اوقات سیر و سیاحت اور تبدیلِ آب و ہوا سے نہ صرف عام صحتِ جسمانی کو فائدہ ہوتا ہے۔ بلکہ اور ایسے بیشمار فواید اور بیش بہا تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اور دماغی سبق۔ تمدنی و اخلاقی نصائح ملتے ہیں۔ جو جغرافیہ و تاریخ کے کسی مطالعہ کے کرنے میں سالہا سال کے پڑھنے سے حاصل نہیں ہوتے۔ قرآن شریف میں اسی لئے مسلمانوں کو سِیرُوا فی الارضِ کی ہدایت ہوئی ہے۔ سیاحت مختلف اغراض کے لئے ہو سکتی ہے مثلاً:۔

(۱) سائنٹفک یعنی علمی تحقیقات مثل جغرافیہ۔ دریافتِ معدنیات۔ و طبقات الارض۔ یا آثارِ قدیمہ کے مشاہدہ کے لئے۔

(۲) تجارتی سیاحت جسمیں سیاح ہر ملک کے پیداوار فی ولایت نرخ ۔ تبادلۂ اشیاء وغیرہ کی تحقیقات کرتے ہیں +
(۳) مختلف اقوام کی جسمانی ۔ تمدنی ۔ اخلاقی ۔ ملکی و مذہبی حالت کی تحقیقات کے لئے +
(۴) صحت کے لئے +

کسی زمانہ میں مسلمان باوجود اُس زمانہ کے مشکلات سفر کے بھی ۔ بلکہ سفر بصورت سفر تھا ۔ بحر و بر کا سفر مغرب الاقصیٰ سے لیکر مشرق الاقصیٰ تک کرتے تھے اور اپنے سفر کے تجربے اور عجیب و غریب مشاہدے اپنے اہل وطن کو سُناتے تھے ۔ جیسے الف لیلہ میں سندباد جہازی کا عجیب و غریب سفر کسی قدر رنگ آمیزی کے ساتھ مرقوم ہے ۔ اور رحلہ ابن جبیر ۔ بطوطہ ۔ ابن حوقل اور صدہا اور سفرنامے اس کے مصداق ہیں ۔ لیکن اب سِیرُوا فی الارضِ پر اہل یورپ عمل کرتے ہیں ۔ وہ علمی ۔ تجارتی و تمدنی تحقیقات کے لئے بحر و بر کا سفر کرتے ہیں ۔ مردم خوار جزائر اور وسط افریقہ کی قوموں کا [illegible] بنکر جاتے ہیں ۔ قطب شمالی ایسے ناممکن الدخل مقام پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ [illegible] سوئٹزرلینڈ کے خوفناک بلند برفانی پہاڑوں کی چوٹیوں پر چڑھنے کی غرض سے [illegible] پھسلکر مرجاتے ہیں ۔ مگر سیاحت سے باز نہیں آتے ۔ اسی شوق سیاحت کی بدولت کرہ [illegible] جیسے امریکہ اہل یورپ کو ہاتھ لگا ۔ اور ہندوستان ۔ آسٹریلیا ۔ افریقہ پر انکا تسلط ہوگیا ۔ اور اَلسَّفَرُ وَسِیْلَۃُ الظَّفَرِ کا مقولہ ان کے لئے راست آگیا +

مجھ کو بھی لڑکپن سے سیاحت کا شوق دامنگیر رہا ہے ۔ اور ۱۲ برس کی [illegible] کچھ تو زمانہ کی مجبوریوں یعنے والدین کی وفات اور کچھ شوق سیاحت کے [illegible] سب چھوڑ دینا پڑا ۔ باوجود سخت مصائب و مشکلات کے [illegible] مَیں نے کوہ ہمالیہ کی بلند برفانی چوٹیوں سے لیکر راس کماری تک [illegible] ہندوستان کے مختلف حصوں ۔ اختلاف آب و ہوا و مناظر قدرتی [illegible] کے دیکھنے سے مجھے بہت سے فوائد اور سبق حاصل ہو [illegible]

تین سال ہوئے اسی شوقِ سیاحت اور بعض دیگر وجوہات نے مجھے مجبور کیا کہ اب ہندوستان
سے باہر کسی ایسے ملک کا سفر کرنا چاہئے۔ جو بلحاظِ آب و ہوا ہند سے بہتر ہو اور جہاں
کی قوم و گورنمنٹ ہند سے علیحدہ ہو۔ چند دوستوں کے مشورہ کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا
کہ قریب ترین ملک ایران ہے۔ آب و ہوا بھی عمدہ ہے۔ اور زبان بھی آسان ہے۔
چنانچہ وسط مارچ میں حیدرآباد سے براہِ بمبئی بوشہر کو روانہ ہوا تاکہ ایسے وقت میں ایران
پہنچوں جبکہ بہار کا مزہ لوٹ سکوں ایران میں موسمِ بہار ۲۱ مارچ سے شروع ہوتا ہے۔
اور نوروز جمشیدی اسی دن ہوتا ہے۔ اس لئے کہ آفتاب خطِ سرطان میں اس روز داخل
ہوتا ہے اور تمام کرۂ شمالی اور منطقۂ معتدلہ اس کی روشنی و گرمی سے روشن و منور و
تازہ ہوتے ہیں۔

بمبئی سے پانچویں اور کراچی سے دوسرے روز بعد ہم برٹش انڈیا کے حدودِ حکومت
سے باہر ہوئے اور بندر گوادر کے مقابل جو سلطان مسقط کے زیرِ حکومت ہے پہنچے۔
بلوچستان کا کنارہ نہایت ہی خشک و بے شجر نظر آیا لیکن ادھر کے بلوچ و عرب لوگوں کے
چہروں سے ایک ایسی بات محسوس ہوتی تھی جو تمام ہندوستان میں معدوم ہے۔ یعنے ان کے
دلوں میں ہنوز مطلق حکومت کے اس خوف و رعب کے آثار نہیں جو بالعموم ہم ہندوستانیوں
کے دلوں میں بطور سکّے کے جم گیا ہے۔ چھٹے روز بمبئی سے روانہ ہونے کے بعد ہم نے
[illegible] پہاڑی سرزمینِ عرب کا درشن کیا اور بندرگاہِ مسقط میں داخل ہوئے۔ کنارے
[illegible] سخت چٹانی پہاڑ ہیں اور بالکل خشک و بے شجر اور نہایت گرم۔ ان میں سے
[illegible] یہ جو بندرگاہ کے بالکل سامنے ہے سلطان مسقط کا قلعہ ہے اور اس پر
[illegible] ہوئی ہیں۔ یہاں ہر شخص ہنری مارٹینی بندوق سے مسلح ہے اور سب کے
[illegible] بے خوفی و آزادی کے آثار نمایاں تھے جسکو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوتا تھا۔
ساتویں روز ہم ایران جنت نشان کے کنارے کے مقابل آئے اور بندر عباس کے

بلند سیاہ چٹانی پہاڑ کی جانب شمال سے ٹھنڈی ٹھنڈی لطیف ہوا کے جھونکے ہمارے جہاز تک آنے لگے۔ جو ہم ہند کے جھلسے ہوئے۔ سوختہ جانوں اور افسردہ دلوں کے لئے بمنزلہ ایک نسیمِ روح رواں کے محسوس ہوتے تھے۔ بندرِ عبّاس کے آبنائے سے گذرنے کے بعد ہم خلیج فارس میں داخل ہوئے۔ اور جوں جوں ہم آگے بڑھے ایران کی طرف سے شمالی ہوا ہم کو یہ محسوس کراتی تھی کہ اب ہم منطقۂ حارہ سے نکلکے منطقۂ معتدلہ میں ہیں۔ نویں روز بندر لنگہ سے گذرتے ہوئے دسویں روز ہم خلیج فارس کے سب سے بڑے بندر بوشہر میں داخل ہوتے۔ بوشہر میں ایک ہفتہ قیام کے بعد ہم شیراز کو روانہ ہوئے۔ اور بارہ روز کے سخت پہاڑی سفر اور گھاٹیوں اور دروں کے چڑھاؤ اُتار کے بعد خاکِ پاک شیراز کی زیارت نصیب ہوئی۔ جس سے سعدی اور حافظ جیسے لاجواب بزرگ پیدا ہوئے۔ اور جہاں اب وُہ مدفون ہیں۔ انکے مزار پر فاتحہ خوانی کی آبِ رکنی کا مزہ چکھا اور گلگشتِ مُصلّے کا نظارہ کیا۔ شیراز کے اطراف باغات 'دلگشا' 'دُو' و باغِ تخت' وغیرہ کی بھی سَیر کی۔

زوال کے آثار جو تمام اسلامی ممالک میں پائے جاتے ہیں۔ ایران بھی اُس سے مستثنےٰ نہیں۔ اور شیراز کا بھی اب نسبتاً ویسا ہی حال ہے۔ جیسا کہ اس کے اور ہمعصر تاریخی اسلامی شہروں مثل بغداد۔ دمشق و اصفہان و دہلی وغیرہ کا ہے۔ لیکن پھر بھی شیراز کے دیکھنے سے حافظ کے وُہ اشعار یاد آگئے جو عروج کے وقت لکھے گئے تھے۔ ؎

خوشا شیراز و وضعِ بیمثالش — خداوندا نگہدار از زوالش
ز رکنا باد ما صد لوحش اللہ — کہ عمرِ خضر مے بخشد زلالش
میانِ جعفر آباد و مُصلّےٰ — عبیر آمیز مے آید شمالش

شیراز میں ایک ماہ قیام کے بعد ہم اصفہان گئے۔ جو تین سو برس قبل تک شاہانِ صفویہ کا پایۂ تخت تھا۔ اور اصفہان نصفِ جہان مشہور تھا۔ اور شک نہیں کہ مشرق کا پیرس اُس

زمانہ میں ہوگا - اُس کے اُجڑے ہُوئے بازار - سیدھے اور مصفا فرشی پتھروں کی - سڑکیں اُسکے خیابان - مساجد و محل عالیشان - گلزار - باغات - نہریں - فوارے - چمنستان - دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسیوں نے پیرس کی آراستگی میں اصفہان کے نمونے سے بہت فائدہ اُٹھایا ہے -

اصفہان میں چندے قیام کے بعد ہم کاشان قم ہوتے ہُوئے طہران پہنچے - قدیم پایۂ تخت رے (جو طہران سے ۴ میل ہے) کے کھنڈروں کا عبرت ناک نظارہ کیا - اسے آیۂ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی تفسیرِ خاموش کہنا چاہئے -

دار الخلافہ طہران اپنی موجُودہ حالت میں صرف سو برس کا پُرانا شہر ہے - کوہ البرز کے دامن میں واقع ہے - موجُودہ خاندان قاچار نے اٹھارویں صدی کے آخر میں اسکو بسایا اور ناصر الدین شاہ مرحُوم نے اسکی شہر پناہ پیرس کے نمونے پر بنائی ہے - شہر میں ٹرام وے چلتی ہے - اور چھ میل تک ریلوے بھی ہے - آبادی قریب ۵ لاکھ یعنے دکن کے پایہ تخت حیدر آباد کے برابر ہے - پایہ تخت ایران ہونیکی وجہ سے تمام سلاطین کے سفارت خانے یہاں ہیں - اور اس لئے یوروپین طرزِ معاشرت کا اثر یہاں زیادہ ہے - طہران سے ہم نے مشہد - ہمدان کرمان شاہ (کردستان) کا سفر کیا اور وہاں سے بغداد - بصرہ ہوکر قریب ۱۰ ماہ کے سفر کے بعد ہندوستان کو واپس ہوئے -

اِس سفر میں ایک ہندی سیاح کو بہت سے نتائج خیز سبق حاصل ہوتے ہیں اور اس کو یہ موقع ملتا ہے کہ وُہ ہند کی مُلکی و تمدنی حالت اور بالخصوص مسلمانانِ ہند کی تمدنی و اخلاقی حالت کا مقابلہ دیگر اسلامی ممالک و اقوام کی حالت سے کر سکے -

ہند کی وُہ شائستگی جسکو اب یوروپین تمدن و شائستگی کا گھن لگ گیا ہے - ایران میں ہنوز زندہ ہے اور ایک ہندی سیاح کو اپنی قدیم شائستگی کے نمونے ایران میں دیکھنے سے نہایت خوشی ہوتی ہے - اور اُسکو یہ جانچنے کا موقعہ ملتا ہے کہ قدیم و جدید شائستگی میں کیا

نسبت ہے۔ اور کن باتوں میں قدیم شائستگی کو فضیلت ہے۔ ہم آجکل اندھا دُھند یورپین تمدن و شائستگی کی تقلید بلا لحاظ اپنی آب وہوا۔ تاریخ و مقامی حالت کی خصوصیات کے کرتے ہیں۔ حالانکہ قدیم اسلامی شائستگی کا بہت سا حصہ ایسا عمدہ ہے کہ اہل یورپ اسپر آجتک رشک کرتے ہیں۔ میرا عقیدہ مثل جاپان کے بڑے مدبروں کے یہ ہے کہ ہم کو یورپ سے صرف سائنس آلات۔ فن حرب اور موجودہ اصول تجارت سیکھنی چاہئیں۔ باقی اپنی مشرقی شائستگی کو بعد قدرے اصلاح کے زمانہ کی ضروریات وحالات کے لحاظ سے قایم رکھنا چاہئے۔

ایران کی بہار۔ ہم نے بہت کچھ ایران کی بہار کے متعلق سُنا اور کتابوں میں پڑھا تھا۔ لیکن۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ ایران کی بہار کی پوری تصویر کھینچنا نہایت مشکل ہے اور اس کیفیت کو جو موسم بہار میں وہاں انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے۔ بیان کرنا ناممکن ہے۔ بہار میں تمام نیچر شجر سے لیکر حیوان اور حیوان سے لیکر انسان تک مثل ایک عروسِ نو کے آراستہ ہوتی ہے۔ ایک شگفتگی ہر قدم پر ہویدا ہے۔ بادبہاری اور نسیم کے ہلکے اور لطیف جھونکے تمام نیچر کو ایک نئی رُوح بخشتے ہیں۔ اور عورت مرد اور بچوں کے رخسارے مثل گلاب کے کھلنے لگتے ہیں۔ پُر فضا میدانوں کا نظارہ۔ باغہائے خوشگوار کی مہک۔ تر و تازہ سیراب و سرسبز وادیوں کا تماشا۔ سر بفلک پہاڑ جنکی چوٹیاں نورانی برف سے ڈھپی ہوئی ہیں۔ یہ سب منظر دلوں کی افسردگی کا علاج ہیں اور فرحت وانبساط کا مژدہ لاتے ہیں۔ اِدھر بلبلیں نازک شاخوں پر سے جو پھولوں سے لدی ہوئیں چہچہا رہی ہیں۔ اور اپنی سُریلی وشیریں منقاروں سے ہارمونیم و پیانو کی سریلی آوازوں کو مات کر رہی ہیں۔ اور انسانی طبیعتوں میں جو ولولے اور اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان کی مثال کسی اور آب وہوا میں کمیاب ہے۔

ایران کی آب وہوا بالخصوص بہار کا سماں اور نسیم دلکشا ایرانیوں کے خوش اور

بشاش چہرے - چاروں طرف آزادی و خودمختاری کے آثار ہندی سیّاح پر آناً فاناً عجب اثر پیدا کرتے ہیں -

ایرانی باوجود اپنے ملک کی زوال پذیر حالت کے ذاتی آزادی میں فرنگی کا بھائی معلوم ہوتا ہے اور جیسے ایک فرنگی اپنے حقوق ذاتی کی حفاظت سفر، حضر دونوں میں کرسکتا ہے اور کبھی دوسری قوم کے شخص سے دب کر چلنا پسند نہیں کرتا۔ وہی رنگ ایک حد تک ایرانی میں موجود ہے - بوشہر میں مَیں نے دیکھا کہ ایک فرنگی سیّاح کشتی سے اُترا - اور ملّاح کو اس کے حق سے کچھ کم دیکر چلنے لگا - ملّاح پیچھے دوڑا - اُس سیّاح نے بہت آنکھیں لال پیلی کیں - ملّاح نے بلاخوف و خطر اُسکا ہاتھ پکڑ لیا اور جھٹکا دیکر کہا "سید ہی کہ نمیدہی"؟ اس پر صاحب بہادر نے چپکے سے باقی پیسے دیدیے -

خوراک یہاں عموماً مقوی اور صحت بخش ہے اور غربا بھی خوش خوراک ہیں - بادشاہ سے لیکر گدا تک نانِ گندم و گوشت دنبہ کھاتا ہے - اور ادنیٰ سپاہی سے لے کر شہنشاہ تک کوئی ایران کے کسی غریب سے غریب کو بھی مذہبی یا قومی ذلت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتا - ایران میں دیسی اور فرنگی میں کچھ فرق نہیں - نہ وہاں کسی یوروپین کو یہ جُرأت ہے کہ کسی ایرانی سے بُرا برتاؤ کر سکے - کسی زبردست سے زبردست غیر سلطنت کا ایران پر تسلّط پالینا یا براہِ راست حکومت قائم کرلینا مشکل معلوم ہوتا ہے - ایران مثل افغانستان کے نہایت پہاڑی ملک ہے - علاوہ اس کے بلوچستان سے لیکر آذربیجان تک جو روسی کوہ قاف کے قریب ہے - اور خراسانِ مشہد سے لیکر بصرہ تک تمام ایرانی ایک قوم - ایک زبان - ایک مذہب اور ایک لباس رکھتے ہیں - یہ یکرنگی اور اتحاد ایران کے استحکام و قومی بقا کا راز ہے - اور برخلاف اس کے دولتِ عثمانیہ کی بڑی کمزوری یہی ہے - کہ اس کی رعایا نہ بحیثیت قومی ایک ہے - نہ ایک زبان بولتی ہے نہ ایک لباس اور طرزِ بود و باش کی عادی ہے - یہی اختلافات ہیں جو ہندوستان میں وقتاً فوقتاً

لاینحل عقدے پیش کرتے ہیں - مگر ایران اس بارہ میں بہت خوش قسمت ہے - علاوہ اس قومی - لسانی اور مذہبی یونیفارمٹی (یکرنگی) کے ایرانی بہت سی ایسی مشرکانہ اور دیگر قابلِ اعتراض رسُومات سے بری ہیں - جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو من حیث القوم مفلوج کر رکھا ہے - اگرچہ ایرانی مذہب شیعہ رکھتے ہیں - لیکن مَیں نے محرّم میں نہ وہاں تعزیے دیکھے نہ باجے نہ ڈھول - نہ شیر چیتے کے سوانگ جو حیدر آباد میں ہوتے ہیں - نہ وہاں پیر پرستی ہے نہ قبر پرستی - ہاں عشرۂ محرم میں تمام قوم سیاہ پوش ہو جاتی ہے - اور ہر قسم کے جشن و جلسہ بند - مرثیہ خوانی و نوحہ خوانی عموماً سلیقہ سے ہوتی ہے اور بعض سرگرم مذہبی جوش میں سینہ کوبی بھی کرتے ہیں -

شادی بیاہ ایران اور دیگر اسلامی ممالک میں نہایت سادہ رسُومات سے ہوتے ہیں - ہند کے سے باجے گاجے - رنڈیوں کا ناچ اور اور فضُول تباہ کُن رسومات ان ممالک میں نہیں پائی جاتیں -

ایران کی سوشل حالت ہند کے مُسلمانوں سے بدرجہا بہتر ہے - وہاں سید تو البتہ تعظیم کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں - لیکن شیخ - مُغل - پٹھان وغیرہ کی مزید امتیاز نہیں ہے - جو اور تفریقاتِ حسب و نسب و پیدائش و کسب پر مبنی ہیں مطلق پائی نہیں جاتیں - نہ کوئی انکو باعثِ فخر خیال کرتا ہے - ایک کفش دوز - نداف - نقاد - سراج - طباخ - قصاب - سبزی فروش کسی لحاظ سے عام سوسائٹی میں ذلیل نہیں سمجھا جاتا - ایک پیشہ ور بڑے سے بڑے آدمی کی لڑکی سے شادی کی تجویز کر سکتا ہے - اور اسی طرح اس کے برعکس بڑے سے بڑا مجتہد و شاہزادہ بلا خیالِ تحقیر ادنے سے ادنے طباخ یا قصاب کی لڑکی سے شادی کرتا ہے - معیارِ شرافت و عزّت شرافتِ ذاتی ہے - ایران میں ہر فردِ بشر حتّٰی بھی کوئی نہ کوئی پیشہ سیکھتے ہیں - اور پہلا سوال اجنبی مسافر سے یہی ہوتا ہے بے ہُنر و بے پیشہ کو بدمعاش چور اور بے اعتبار سمجھا جاتا ہے اور پیشہ

میں کُرسی ملتی ہے ! ہمارے ہندوستان میں مرزا بھی ایک ذات بنگئی ہے - حالانکہ ایران میں مرزا منشی کو کہتے ہیں -

جس طرح ہمارے ایرانی بھائی بلحاظ سوشل حالات کے ہندی مسلمانوں سے بہتر ہیں اسی طرح ہماری ایرانی بہنیں ہندی بہنوں سے بدرجہا بہتر حالت میں ہیں - ہند کا سا سخت پردہ ایران میں نہیں - اُمرا سے لے کرادنےٰ عورتوں تک برقعہ کے ساتھ بازار میں اپنی پسند کا سودا خریدنے خود جاتی ہیں - دوکان پر کپڑے اور دوسری اشیا کی دیکھ بھال کرتی ہیں - اُسوقت رُوبند جو عموماً سفید ململ کا جالیدار ہوتا ہے اُسکو سر کے اُوپر کی طرف کر لیتی ہیں - تاکہ آنکھوں - ناک اور منہ سے چیز کو دیکھ - سونگھ اور چکھ سکیں -

مسجدوں میں نماز کو جاتی ہیں - اور اکثر پچھلی صفیں عورتوں کی ہوتی ہیں عُلما رکا وعظ سنتی ہیں - اور مرثیہ خوانی کی مجلسوں میں شریک ہوتی ہیں - شام کو باغات میں تفریح کے لیئے ملکر جاتی ہیں - جو قدرے خوشحال ہیں وُہ اپنے خاوندوں یا عزیزوں کے ساتھ سفید ایرانی گدھوں پر بیٹھ کر دو یا چار میل شہر کے باہر ہوا خوری کو نکل جاتی ہیں -

اگرچہ ہند میں ایجاب و قبول مرد و عورت میں نکاح کے وقت بطور ایک رسم کے ہوتا ہے - لیکن فی الحقیقت لڑکی کو ہند میں ایسا موقع بہت کم ملتا ہے کہ وُہ اپنے شوہر سے قبلِ نکاح بات چیت کر سکے - یا اپنا فیصلہ آپ خود کر سکے - ایران میں ۹۵ فیصدی نکاح مرد و عورت کے بالکلیہ براہِ راست رضامندی سے ہوتے ہیں - اور شرع ہمیشہ مظلوم و کمزور کی محافظ رہتی ہے - کیا مجال ہو کہ کوئی کسی عورت پر بیجا ظلم کر سکے - یا اُس پر خواہ مخواہ بدگمانیاں کرے - ہند میں مردوں کا تشدّد شرعی اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے - اور ایسا معلوم ہوتا ہو کہ اُن بیچاریوں کی قوتِ ارادی کو مردوں نے بالکل زائل کر رکھا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہماری ہندی نسل کمزور و بُزدل پیدا ہوتی ہے - ماں کا تخیل بچوں پر بہت اثر کرتا ہے - اور ماں کی گود بچوں کے لیئے پہلا مدرسہ ہے - کیا وجہ ہے کہ تُرک تمام

دُنیا میں بہادر سپاہی ہے۔ اصلی سبب تُرکوں کی مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو اس شرط پر دُودھ پلاتی ہیں۔ کہ وُہ اس دُودھ کا حق جہاد کے وقت میدانِ جنگ میں ادا کریں۔ مُسلمان عورتوں کی حالت تمام اسلامی ممالک میں باستثنا ہند کے بہتر ہے۔ اور وُہ اپنے شرعی حقوق سے بخُوبی واقف ہیں۔ جوان بیوہ کا ایران یا دُوسرے اسلامی ممالک میں بغیر نکاح ثانی کے رہنا شاذ و نادر ہے۔ وہاں بغیر نکاح رہنا معیُوب سمجھا جاتا ہے۔ ایران میں مذہب شیعہ کے موافق دو قسم کے عقد ہوتے ہیں۔ ایک عقد دائم۔ اور دُوسرا عقدِ منقطع۔ عقد دائم میں مُدت نہیں ہوتی۔ اور مُدت منقطع میں ایک مُدتِ معینہ ٹھہر جاتی ہے۔ باقی عدت کے قانون ایک ہی ہیں۔ اکثر لوگ مختلف وجُوہات سے عقد منقطع کرتے ہیں۔ اخلاقاً تو یہ معیُوب عقد ہے۔ مگر جو بُرائیاں نئی تہذیب کے سبب مغربی دُنیا کے بعض حصّوں میں ہے۔ وُہ اِس عقد کی بدولت یہاں قریب قریب مسدود ہیں۔

ایران کی آب وہوا۔ گورنمنٹ اور سوشل حالت پر اس سرسری نظر کے بعد چند سطریں ایران کے حُسن و ملاحت پر لکھنا بیجا نہ ہوگا۔ یہ بات تمام دُنیا میں مشہور ہے۔ کہ جارجیا یعنے وُہ حصّہ جو رُوسی کوہ قاف کے قریب ہے۔ جس کے حدود ایک طرف بحرِ اسود اور بحرِ اخضر ہیں۔ اور دُوسری طرف آرمینیا اور کردستان۔ بلحاظِ حُسن کے تمام دُنیا میں بہتر ہے۔ اِس کی تصدیق مجھے ایران کی سیاحت میں ہُوئی۔ قُدرت نے حُسن تُرک اور ایرانیوں کے حصّے میں دیا ہے۔ ہمارے نوجوان یورپ جاکر وہاں کی گوری رنگت پر مرنے لگتے ہیں۔ اور وہاں کے لوگوں ہی کو دُنیا میں سب سے زیادہ حسین سمجھتے ہیں کاش اُنہوں نے ایسے ایشیائی ممالک کا سفر کیا ہوتا تو دیکھتے کہ قدرت نے خود ان کے براعظم میں انہی کے بھائی بندوں کو کیا کیا خوبیاں اور نعمتیں دی ہیں۔ اور دُنیا کے وُہ بہترین حصّے انکو میراث میں دیئے ہیں۔ جہاں بقولِ اہلِ کتاب خدا نے باغِ بہشت بنایا تھا۔ اور اس باغِ عدن میں ہمارے پہلے ماں باپ آدم وحوا کو بسایا تھا۔ جاؤ اور اپنی

ان "خوذ مقصوراتٌ فی الخیام" کی تصویریں دیکھو۔ اگر یورپ کے نقشِ دل سے محو نہ ہو جائیں تو سہی۔

آخر میں چند باتیں اپنے تجربے سے ان لوگوں کی آگاہی کے لئے لکھتا ہوں جو ایران کے سفر کا شوق رکھتے ہوں۔ وقتِ روانگی ہندوستان سے ایران جانے کے لئے بہترین مارچ کا شروع ہے۔ اور واپسی کے لئے اکتوبر بہتر ہے۔ اِس لئے کہ ایران کا سرما نہایت سخت ہے۔ جیساکہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ بمبئی سے بوشہر دس دن اور کراچی سے سات دن کا راستہ ہے۔

حاجی زین العابدین یعنے پرشین اسٹیم ناویگیشن کمپنی کے جہاز سے جانے میں بہت آرام ہے۔ خط لکھ کر تاریخِ روانگیِ جہاز پوچھ سکتے ہیں۔ بمبئی سے بوشہر تک درجہ دوم کا کرایہ معہ خوراک ساٹھ روپیہ ؎ ہے۔ اور درجہ سوم میں بلا خوراک صرف دس روپیہ ؎ ہے۔ خوراک کا انتظام جہاز پر کرلینا چاہئے۔ ۱۲ روپیہ روز میں اچھا کھانا مل سکیگا۔ مگر نشست برخاست۔ سونا سب ڈیک پر ہے۔ کم استطاعت و تکلیف کے عادی لوگوں کے لئے یہ درجہ سوم کا بہت سستا سفر ہے۔ ایران میں بوشہر سے طہران اور مشہد جانے اور بغداد بصرہ واپس آنے کے لئے کفایت شعار شخص کے لئے ایک ہزار روپیہ کافی ہے۔ اگر ڈیڑھ ہزار کا بندوبست کر سکے تو نسبتاً آسایش سے سیر ہو سکتی ہے۔

تمام ایران میں سفر خچر گدھے یا گھوڑے پر ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایک اچھا گدھا ایک سو روپیہ میں خریدے اور قافلہ کے ساتھ سفر کرے تو بہت کفایت ہے۔ مگر یہ آزمودہ کار آدمی کا کام ہے۔ میں اس مضمون میں یہ باتیں بالاجمال ہی درج کر سکتا تھا۔ اگر کسی صاحب کو تفصیل کی ضرورت ہو تو حیدرآباد۔ دکن کے پتے سے مجھ سے خط و کتابت فرما سکتے ہیں کیونکہ غالباً میں عنقریب عازمِ ہندوستان ہونگا +

ملکم جان (از پیرس)

"روما کے تماشے"

جوں جوں اہل روما مغرور اور عیش پسند ہوئے۔ انکی یہ کیفیت ہوگئی کہ جب تک کوئی انہیں تفریح طبع کے لئے تماشے نہ دکھلاتا وہ اُس سے کبھی راضی نہ ہوتے۔ کسی شخص کو سرکاری عہدے کی تمنا ہوتی تو یہ معمولی بات تھی کہ وہ اہل شہر کو دلپسند تماشے دکھا کر خوش کیا کرتا۔ اب بھی وہاں جہاں پہلے زمانے میں اہل روما کی بڑی بڑی بستیاں تھیں۔ ایسے تماشا گاہوں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ جن میں اہل شہر سیر دیکھنے اور لطف اُڑانے کے لئے جمع ہوا کرتے تھے۔ یہ تماشاگاہیں کہیں تو پہاڑ کے بیچ میں تراشی گئی ہیں اور کہیں میدان میں زمین کھود کر بنائی گئی ہیں۔

اس قسم کی سب سے زیادہ مشہور اور نہایت شاندار عمارت روما کی تماشاگاہ ہے شہنشاہ ویسپیسین اور اس کے بیٹے ٹائیٹس نے اسے روما کی سات پہاڑیوں کے بیچ میں ایک وادی کے اندر بنوایا تھا۔ یہودیوں نے جنہیں یہ باپ بیٹا یروشلم سے قید کر کے لائے تھے۔ اس کے بنانے میں محنت کی تھی۔ اِس عمارت کا مصالحہ جو باہر سنگ سُرخ ہے اور اندر سنگ سفید ایسا پختہ ہے کہ حالانکہ اس پر اتنی صدیاں گذریں اس کی صورت میں فرق نہیں آیا۔ اسکا بیضوی شکل کا احاطہ پانچ ایکڑ زمین گھیرے ہوئے تھا۔ اِس پر محرابوں کی قطاریں کی قطاریں اوپر نیچے بنی ہوئی تھیں۔ اور اندر نشستگاہیں۔ اور نیچے عین وسط میں ایک وسیع دنگل تھا۔ جب روما کے شہنشاہ نمائش پسند ہوگئے۔ تو اُنہوں نے دنگل کو طرح طرح کی دھاتوں کے بُرادے سے قرمزے اور بیش بہا پتھروں کے چُورے سے سجانا شروع کیا۔ تاہم بہتر یہی سمجھا جاتا تھا کہ بجائے ان تکلفات کے ایک قسم کے ملائم سفید پتھر کے باریک باریک ریزے دنگل میں بکھیرے

جائیں۔ اِن سے ڈنگل بالکل ایسا نظر آتا تھا گویا صاف شفاف اچھوتی برف پڑی ہوئی ہے۔
اس احاطہ کے گرد تازہ ستھرے پانی کی ایک نہر بہتی تھی۔

تماشا گاہ کے نیچے کے درجے میں کسی قدر اونچائی پر شہنشاہ کے لئے تخت مجسٹریٹوں اور مشیروں کے لئے سونے چاندی اور ہاتھی دانت کی کرسیاں اور راہب عورتوں کے لئے نشست گاہیں تھیں۔ اس سے اوپر اہل شہر کی نشستگاہیں اور سب سے اوپر خواتین کے بیٹھنے کی جگہیں تھیں۔ اس عالیشان عمارت میں کوئی ۸۷۰۰۰ آدمی سما سکتے تھے۔ چھت اس پر کوئی نہ تھی۔ لیکن جب کبھی بارش ہوتی یا دھوپ تیز ہو جاتی تو زربفت اور ریشم کے سائبان تان دیئے جاتے تھے۔ رنگ ان سائبانوں کا عموماً ارغوانی ہوتا تھا۔ جس وقت دھوپ پڑتی تھی۔ تو سفید ڈنگل اور سفید پوشاکوں پر عجب خوش نما گلابی رنگ کا عکس پڑتا تھا۔

تماشا پسند لوگ دن دن بھر بیٹھے رہتے تھے۔ عوام سب سے پہلے جمع ہو جایا کرتے تھے۔ اس کے بعد بڑے بڑے اہلکار آتے تھے اور بیٹھتے جاتے تھے۔ ان کے آنے پر آفرین یا نفرین کا نعرہ بلند ہوتا تھا۔ آفرین اہلکار کی ہر دلعزیزی اور نفرین اُن کی نسبت ناراضی کا نشان ہوتا تھا۔ جب شاہنشاہ شامیانے کے نیچے مسند پر متمکن ہوتا تھا تو زور سے نعرے بلند ہوتے تھے۔ مرحبا صد مرحبا! تیرا اقبال بلند ہو! شہنشاہ کے بیٹھ جانے کے بعد تماشا شروع ہوتا تھا۔ بعض دفعہ سب سے پہلے ایک بڑا ہاتھی آتا تھا اور ایک رسّی پر چڑھتا اور اُترتا تھا۔ پھر ایک ریچھ آتا تھا۔ معزز خاتونوں کا لباس پہنے ہوئے۔ ایک ڈولی میں بیٹھا ہوا جسے دو کہار اٹھائے ہوتے تھے۔ یہ خواتین کی سواری کی نقل ہوا کرتی تھی۔ پھر ایک اور ریچھ آتا تھا وکیلوں کا لباس پہنے ہوئے جو پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر ایسے اشارات کیا کرتا تھا گویا مقدمے کی وکالت کر رہا ہے۔ پھر ایک شیر نکلتا تھا۔ سر پر مرصع تاج۔ گلے میں الماس کا کنٹھا۔ ایال اور سجوں پر سنہری

کام۔ جو ایک چھوٹے سے خرگوش کے ساتھ طرح طرح کی بیشمار دلپسند حرکات کیا کرتا تھا۔ اور خرگوش اُس کے آگے مزے سے لے لے کر ناچا کرتا تھا۔ پھر بارہ ہاتھی آتے تھے۔ چھ مردوں کے لباس میں چھ عورتوں کے بھیس میں مُنہہ پر نقاب پڑی ہوتی تھی۔ اگر کوچوں پر ایک ہاتھی دانت کی میز کے گرد بیٹھ جاتے تھے۔ اور بیٹھ کر نہایت سلیقہ کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ ساتھ ہی ہنسی ہنسی میں قریب کے لوگوں پہ گلاب چھڑکتے جاتے تھے۔ پھر اپنی ہی جنس کے مہمانوں کا اُٹھ کر استقبال کرتے تھے اور اُن پر سے پھول نثار کرتے تھے۔ اس کے بعد سب مل کر ناچتے تھے۔ یہ ناچ ہمیشہ ناچ کے مقررہ لباس میں ہوا کرتا تھا۔

بعض اوقات دنگل میں پانی چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک جہاز تیرتا ہوا آتا تھا اور بیچ میں آکر ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا تھا۔ اس میں سے عجیب و غریب جانور نکلتے تھے۔ بعض دفعہ زمین پھٹتی تھی اور بلند بالا درخت نمودار ہوتے تھے۔ ان پر سونے کے میوے لگے ہوتے تھے۔

اس کے بعد جنگلی درندے چھوڑے جاتے تھے۔ گینڈے اور چیتے سانڈ اور شیر تیندوے اور جنگلی سور۔ اور لوگ بڑے مزے سے بیٹھے ہوئے لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے اور جوش میں آتے تھے۔ یہ جانور لڑتے لڑتے تھک جاتے تھے تو انہیں طرح طرح سے اُبھارتے تھے۔ سانڈوں کو سُرخ رنگ دکھایا جاتا تھا۔ سوروں کو سفید رنگ۔ بعض کے جسم میں سُرخ کئے ہوئے آنکس گھوپ دیئے جاتے تھے۔ بعض چابکوں سے پٹتے تھے۔ یہ تمام کھیل لوگ بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے تھے اور بجائے مرعوب ہونے کے خوش ہوتے تھے۔

ان وحشیانہ تماشوں کے لئے بیشمار جانور باہر سے منگائے جاتے تھے۔ دُور دور کے عمال فرض سمجھکر شیروں ہاتھیوں شتر مُرغوں تیندووں کے غول کے غول تحفۃً بھیجا کرتے تھے۔ جتنا زیادہ جانور تندخو ہوتا تھا۔ اُتنا ہی اچھا خیال کیا جاتا تھا۔

اِن عیاشانہ پن میں ایک عجیب نزاکت تھی۔ وُہ یہ کہ خُون کی بُو ناپسند خیال کیجاتی تھی اسی لئے سارے پتھر کے فرش کے نیچے نلیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے طرح طرح کی خوشبوؤں کے ابخرات سارے دنگل میں پہنچائے جاتے تھے۔

پھر صرف یہی مہیب کھیل کافی نہ سمجھے جاتے تھے۔ آدمیوں اور درندوں کی کشتیاں بھی ہوتی تھیں۔ بعض اُن آدمیوں میں سے مسلح ہوتے تھے۔ اور عموماً جانوروں پر غالب آجاتے تھے۔ بعض دفعہ نہتے شکاری آتے تھے۔ اور اپنی چالاکی اور پھُرتی سے شیر کے سر پر کپڑا ڈال کر یا اُس کے حلق میں پہونچا ٹھونس کر شیر کو مغلُوب کر لیتے تھے۔ پھر بڑے بڑے مُجرم شیروں کی ضیافت کے لئے چھوڑے جاتے تھے۔ ایسے مجرموں میں بعض دفعہ کوئی غریب عیسائی بھی ہوتا تھا۔ اِس کا قتل لوگ بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے۔ اور یہ کھیل عموماً سب کے بعد دکھایا جاتا تھا اور سب کھیلوں سے عمدہ سمجھا جاتا تھا

ان جانوروں کی لاشیں خادم لوگ لوہے کے کانٹوں میں پھنسا پھنسا کر دُور کھینچ لے جاتے تھے۔ دنگل پر تازہ صاف سُتھری ریت بچھائی جاتی تھی۔ خوشبوؤں کے بُقّے کے بُقّے چھوڑے جاتے تھے۔ اور اِس کے بعد قد آور قوی ہیکل نوجوانوں کا ایک گروہ نکلتا تھا۔ جن میں سے بعض کے پاس تلوار اور برچھی ہوتی تھی۔ بعض کے پاس ترسول اور جال۔ کوئی ہلکی سی زرہ پہنے ہوتا تھا۔ کوئی پُورے سپاہیانہ ساز و سامان سے آراستہ ہوتا تھا۔ کوئی گھوڑے پر سوار کوئی رتھ میں اور کوئی پیدل۔ یہ سب لوگ ملکر شہنشاہ کے آگے آتے تھے اور تسلیم بجالا کر ہم آہنگ ہوکر پکارتے تھے۔ "بادشاہ سلامت مرنے والے تجھے سلام کہتے ہیں"۔ یہ لوگ شمشیر زن ہوتے تھے۔ انہیں ایسے ہی تماشوں کے لئے تربیت کرتے تھے۔ یہ غریب عموماً غلام ہوتے تھے۔ جنہیں فوجی مدرسوں میں تعلیم دیجاتی تھی۔ مگر بعض اوقات ان میں ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو اپنی خوشی سے دنگل کی لڑائی اپنا پیشہ قرار دے لیتے تھے۔ جو شمشیر زن موت سے بچ جاتے تھے۔

خدمت سے معذور سمجھے جاتے تھے۔ اور بڑھاپا آرام کے ساتھ بسر کرتے تھے۔

اُن لوگوں کی لڑائیاں طرح طرح سے ہوتی تھیں۔ کبھی ہلکی زرہ والے سپاہی اور جال بردار کا جوڑ لڑتا تھا۔ کبھی بھالا بردار اور برچھی بردار کا اور کبھی دو پورے مسلح جنگجوؤں کا۔ بعض دفعہ دست بدست لڑائی نہ ہوتی تھی۔ ہلا بول دیا جاتا تھا۔ جب کوئی شمشیرزن مدمقابل کو زخمی کر دیتا تھا تو حاضرین کی طرف خطاب کر کے پکارتا تھا "وہ مارا" اور اسکا منتظر رہتا تھا کہ حاضرین اُسکا مارا جانا پسند کرتے ہیں۔ یا چھوڑا جانا۔ اگر لوگ انگوٹھے بلند کر دیتے تھے تو مغلوب کو موقع دیا جاتا تھا۔ کہ پھر اُٹھ کر وار کرے۔ اگر وہ انگوٹھے نیچے کر لیتے تھے تو یہ مغلوب کے قتل کا نشان سمجھا جاتا تھا۔ غریب مغلوب آخری وار لینے سے اگر کچھ کراہت ظاہر کرتا تھا تو ہر طرف سے تحقیر کے طعنے بلند ہوتے تھے۔

مقدس راہب عورتیں نرم دل باتیں نیکدل حاکم اور مشیر سب اس بیرحمی کو معصومانہ کھیل سمجھتے تھے۔ خاص لوگ جنگل میں جاکر جانکنی کا تماشا دیکھتے تھے۔ اور لاش کے گھسیٹے جانے سے پیشتر خاص خاص بہادروں کے خون کو چکھا کرتے تھے۔

شمشیرزنوں کا کھیل اہل روما کے لئے بڑا دلچسپ کھیل تھا۔ یہ کھیل اُس وقت تک بھی برابر رائج رہا جبوقت غیر ملک کے حملہ آوروں نے روما پر حملے کرنے شروع کئے۔

آہ! "ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری"۔

سید نذیر حسین

قومی زندگی

ہمارے مکرم دوست شیخ محمد اقبال صاحب ایم۔ اے موسم گرمی کی تعطیلوں میں اپنے برادر معظم شیخ عطا محمد صاحب سب ڈویژنل آفیسر ایبٹ آباد کے پاس تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کے اصحاب نے اصرار (سے) شیخ صاحب سے ایک لکچر لکھوایا۔ اس لکچر کا خلاصہ ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:۔

قوموں کی تاریخ میں یہ ایک بڑا نازک وقت ہے جو اس بات کا متقاضی ہو کہ ہر قوم نہ صرف اپنی موجودہ حالت پر غور کرے۔ بلکہ اگر اسے اقوام عالم کے دفتر میں اپنا نام قائم رکھنا منظور ہے۔ تو اپنی آیندہ نسلوں کی بہبودی کو بھی ایک موجودہ واقعہ تصور کرے اور ایسا طریق عمل اختیار کرے جسکے احاطۂ اثر میں اس کے اخلاف کا تمدن بھی شامل ہو۔ ایک زمانہ تھا۔ جب کہ اقوام دنیا کی باہمی معرکہ آرایوں کا فیصلہ تلوار سے ہوا کرتا تھا۔ اور یہ فولادی حربہ دنیائے قدیم کی تاریخ میں ایک زبردست قوت تھی۔ مگر حال کا زمانہ ایک عجیب زمانہ ہے جس میں قوموں کی بقا انکے افراد کی تعداد انکے زور بازو اور ان کے فولادی ہتھیاروں پر انحصار نہیں رکھتی۔ بلکہ ان کی زندگی کا دارومدار اس کاٹھ کی تلوار پر ہے جو قلم کے نام سے موسوم کیجاتی ہے۔ آجکل کی جنگوں کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ قومیں ہتھیار بند ہوں اور ایک خاص میدان میں آراستہ ہوکر جدال و قتال کا بازار گرم کریں۔ نہ آج کل یہ ضروری ہے۔ کہ کوئی قوم کسی ہمسایہ قوم پر فتح پانے کے لئے اس کے ملک پر چڑھائی کرے۔ یہ تمام سامان زمانۂ قدیم کے ساتھ مختص ہے۔ ہمارے زمانے میں ایک اور خاموش قوت ہے۔ جس پر قوموں کی بقا و فنا انحصار رکھتی ہے اور جس کے بل پر ایک قوم گھر بیٹھے دوسری قوم کو ہمیشہ کے لئے صفحہ عالم سے حرف غلط کی طرح مٹا سکتی ہے۔ ہاتھوں کی لڑائی کا زمانہ گذر چکا۔ اب دماغوں تہذیبوں اور تمدنوں کی ہنگامہ آرایو(ں)

کا وقت ہے اور یہ جنگ ایک ایسی جنگ ہو جسکے زخم رسیدہ زنگاری اور کافوری ہم سے ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے - ظاہری فاصلہ جو قوموں کے خلا و ملا میں بمنزلہ ایک سدِ سکندری کے تھا - اب ریل اور پیام برقی کی حیرت انگیز ایجادوں سے گویا بالکل معدوم ہو گیا ہے اور وُہ ممالک جو کبھی ناپیداکنار سمندروں کی وجہ سے ایک دُوسرے سے اِس قدر دُور تھے کہ ایک کو دُوسرے کی ہستی کا بھی علم نہ تھا - موجُودہ صدی میں فنِ جہازرانی کی تعجب خیز ترقّی سے ایک شہر کے دو محلّوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں - جس سے دُنیا کی تمام قومیں ایک دوسری کی تہذیب و تمدّن سے روز بروز متاثّر ہوتی ہیں - برق جسکی مضطربانہ چمک تہذیب کے ابتدائی مراحل میں انسان کے دِل میں مذہبی تاثرات کا ایک ہجُوم پیدا کر دیا کرتی تھی - اب اسکی پیام رسانی کا کام دیتی ہے - سٹیم اس کی سواری ہے اور ہوا اس کے پنکھے جھلا کرتی ہے - آفتاب جس کی عظمت و جلال نے نہ صرف ابراہیم کی باریک بین نگاہوں کو دھوکے میں ڈالدیا تھا بلکہ ایک مہذّب قوم کے دل و دماغ کو بھی متاثر کر دیا تھا - اب اپنی حرارت اور روشنی کو حضرتِ انسان کے اشارے پر صرف کرتا ہے - غرضیکہ نظامِ قدرت کے وہ تمام محض قوائے جنکے ناقابل تشریح عمل سے مرعُوب ہو کر قدیم قومیں انہیں رُبوبیّت کے لباس سے مزیّن کر کے انکے لیے عظیم الشان معابد تعمیر کیا کرتی تھیں - موجُودہ علوم کی وساطت سے انسان کے دست بستہ غُلام ہیں - اور ظلوم و جہُول اس عظیم الشان امانت کا بار اُٹھائے - جسکے اُٹھانے سے پہاڑوں نے بھی انکار کر دیا تھا - اپنے اشرف المخلوقات ہونے پر بجا ناز کر رہا ہے - اسکی مستفسرانہ نگاہیں قدرت کے سربستہ رازوں کو کھول رہی ہیں - اور اسکا دماغ انہی علمی فتوحات کے سہارے پہاڑوں سمندروں دریاؤں حتّٰی کہ چاند سُورج اور ستاروں پر بھی حکومت کر رہا ہے - یہ ہے وُہ حیرت انگیز تغیر جو زمانۂ حال کو زمانۂ ماضی سے متمیّز کرتا ہے اور جسکی حقیقت اس امر کی متقاضی ہو کہ تمام قومیں جدید رُوحانی اور جسمانی ضروریات کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے انہی اپنی

زندگی کے لئے نئے سامان بہم پہنچائیں - میرا منشا یہ ہے کہ اس تغیر کے لحاظ سے اقوام ہندوستان اور خصوصاً مسلمانوں کی موجودہ حالت پر ایک نظر دوڑاؤں اور اس امر کو واضح کروں کہ زندگی کی کٹھن راہ میں ہمیں کون کون سی مشکلات درپیش ہیں اور ہمیں ان کے ازالے کے لئے کیا کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئیں - میرا مقصد زیادہ تر ناظرین کے دل و دماغ کو قومی زندگی کے اہم اور ضروری سوال کیطرف متوجہ کرنا ہے - اور اگر ناظرین سے کسی ایک فرد کو بھی اس ضروری مسئلے پر سوچنے کی تحریک ہوگئی تو میں سمجھونگا کہ یہ مضمون لاحاصل نہیں گیا -

واقعاتِ عالم کے مشاہدے سے حکما اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ زندگی کی مختلف صورتوں یعنے انسانوں حیوانوں پودوں وغیرہ میں ایک قسم کے عالمگیر جنگ شروع رہتی ہے - گویا نظامِ فطرت کارزار زندگی کا ایک دردناک نظارہ ہے - جس میں ہر طبقے کے حیوان اپنے ہمسایہ طبقوں سے برسرپیکار رہتے ہیں - اس کشمکش حیات میں کامیاب ہونے کے لئے ہر طبقہ زندگی مصروف رہتا ہے - لیکن فتح صرف اسی طبقے کو حاصل ہوتی ہے جس میں رہنے کی قابلیت ہو یعنے جس نے زندگی کے متغیرہ حالات کے ساتھ موافقت پیدا کر لی ہو - صدہا اقسام کے عجیب غریب چوپائے اور پرندے کبھی روئے زمین پر اور سمندروں میں موجود تھے - مگر اب انکا نام و نشان بھی نہیں ہے - اس کی وجہ یہ ہے کہ جوں جوں زندگی کے حالات اور اس کے شرائط تبدیل ہوتی گئیں - یہ حیوان فنا ہوتے گئے - کیونکہ یہ اس انقلاب کے مختلف مراحل میں حالات کے ساتھ موافقت پیدا نہ کر سکے - یہ قانون جس کو حکماء حال نے کمال محنت سے دریافت کیا ہے ایک عالمگیر قانون ہے - انسان حیوان چرند پرند درخت غرضکہ زندگی کی کوئی ایسی صورت نہیں - جو اس کے اثر سے آزاد ہو - لیکن میں اسوقت یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس زبردست قانون نے طبقۂ انسانی کے نشو و نما اور اس کے ارتقا پر کیا عمل کیا ہے اور اب کیا کر رہا ہے - کیا موجودہ انسان

ابتدا سے ہی ایسا تھا جیسا اب ہے؟ نہیں ہرگز نہیں - نوعِ انسان وموجودہ نسل ان زبردست قومی تہذیبوں اور تمدّنوں کی یادگار ہے - جو زندہ رہنے کی کوشش میں فنا کا شکار ہوئیں اور فنا بھی اس طرح ہوئیں کہ اسوقت انکا نام ونشان تک صفحۂ ہستی پر موجود نہیں ہے اہرامِ مصری کے بانی ہزارہا سال ہُوئے مٹ گئے - یُونانیوں کے اشراقین اور مشائین کے فلسفے رہ گئے - لیکن قوم کا نام ونشان تک بھی دُنیا میں نہیں ہے - افریقہ کی وُہ زبردست قوم جس کے دلیر فوجی افسروں نے ممالکِ مغرب کو پامال کرکے اہلِ رُوما کی عظیم الشان سلطنت پر حملے کئے تھے - اب کہاں ہے؟ کیا اس قوم کی کوئی یادگار باقی ہے؟ صدہا قومیں پیدا ہوئیں - پھلیں پھُولیں - اور آخر کار اس اٹل قانون کے عمل سے متاثر ہو کر خاک میں مل گئیں - نوعِ انسان کی موجودہ ترقی جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے - کوئی سستے داموں کی چیز نہیں ہے - سیکڑوں قومیں علمی اور تمدنی ترقی کی حسین دیوی کے لئے قُربان ہوتی ہیں - اور ہزاروں افراد کا خُون اس کے خوفناک قربانگاہ پر بہایا جاتا ہے - جنگیں وبائیں اور قحط اس ہمہ گیر قانون کے عمل کی عام صُورتیں ہیں اور اگر انکو ارتقاءِ نوعِ انسانی کے اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ واقعات جو بظاہر آفاتِ سماوی معلوم ہوتے ہیں - طبقۂ انسانی کے لئے ایک برکت ہیں جسکا وجُود نظامِ قدرت کی آراستگی کے لئے انتہا درجہ کا ضروری ہے - اس قانون کا اثر اقوامِ انسانی تک ہی محدود نہیں ہے - بلکہ بزمِ ہستی کے کسی حصّے کی طرف نگاہ کرو اسکا عمل جاری نظر آئیگا - سیکڑوں مذاہب دنیا میں پیدا ہُوئے - بڑھے - پھلے پھُولے اور آخر کار مٹ گئے - کیوں؟ اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان کے عقلی ارتقا کے ساتھ ساتھ جدید روحانی ضروریات پیدا ہوتی گئیں - جنکو ان مذاہب کے اصُول پُورا نہ کرسکے - یہی سبب ہے کہ اہلِ مذہب کو وقتاً فوقتاً نئے نئے علم کلام ایجاد کرنے کی ضرورت پیش آتی رہی - جن کے اصُول کے رُو سے انہوں نے اپنے اپنے مذاہب کو پرکھا اور ان کی تعلیم کو ایسی صُورت

میں پیش کرنے کی کوشش کی جو علمی اور رُوحانی زندگی میں انسان کی راہ نما ہو سکے ۔ علیٰ ہذا القیاس ایک زمانہ تھا ۔ جب یونانی لاطینی اور سنسکرت وغیرہ زندہ زبانیں تھیں مگر اب ایک عرصے سے یہ زبانیں بیجان ہو چکی ہیں ۔ اِنکی موت کا راز اس قانون کا عمل ہے اور خود پنجابی زبان جسکو ہم روزمرہ استعمال کرتے ہیں ۔ اِس سے روز بروز متاثر ہو رہی ہے ۔ سیکڑوں الفاظ ہیں جو تعلیم یافتہ لوگوں کے روزمرہ استعمال میں ہیں مگر اس زبان میں موجود نہیں ۔ اظہارِ خیالات کے جدید طریق ہماری عقلی ترقی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ زبان ان کے ادا کرنے سے قاصر ہے ۔ ایسے حالات میں لازم ہے کہ اس زبان کا حشر بھی وُہی ہو جو اَور قدیم زبانوں کا ہوا ہے ۔ حال کی قوموں کی طرف نظر دوڑاؤ تو معلوم ہوگا کہ امریکہ اور آسٹریلیا کی اصلی قومیں ایک اعلیٰ تر تمدن و تہذیب کے سیلِ رواں کے آگے قریباً قریباً نیست و نابود ہو گئی ہیں اور ممالکِ ایشیا میں چینی ایرانی اور وسط ایشیا کی قومیں اس قانون کے عمل سے روز بروز متاثر ہو رہی ہیں ۔ یہانتک کہ حکماء کے خیال میں ان اقوام کی آئندہ حالت نہایت مخدوش ہے ۔ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصائبِ ہستی نوعِ انسان کی ترقی کے لئے ضروری ہے اور یہ نہال صرف اس صورت میں بار آور ہو سکتا ہے ۔ کہ ہزاروں چھوٹے چھوٹے پودے اُس کے نمو کی خاطر بادِ سموم کی نذر ہو جائیں ۔ جس طرح نوعِ انسان کی مجموعی ترقی کے لئے مختلف اقوام کا نیست و نابود ہونا ضروری ہے ۔ اِسی طرح یہ بھی لازم ہے کہ کسی خاص قوم کے ارتقار کے لئے کئی افراد نذرِ اجل ہو جائیں ۔ یا اور قوم کے نشوونما کی خاطر اُن کے ذاتی حقوق کی کوئی پرواہ نہ کیجائے ۔ لیکن یہاں ایک عجیب اور مشکل سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جس صورت میں کسی خاص فرد کو قوم کی آئندہ نسلوں کی بہبودی اُنکی عظمت و جلال اور انکے عقلی اور تمدنی ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے تو کیوں اس کے ذاتی حقوق پر قومی ارتقار کو ترجیح دیجائے ؟ کیا میں آج سے سو سال بعد

زندہ ہونگا ؟ نہیں پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنے آپ کو قوم کے لئے قربان کرلوں اور اپنی نیند حرام کر کے قوم کی آئندہ بہبودی کے لئے بے خواب راتیں بسر کروں ! یہ بیچین کرنے والا سوال ہے ۔ جو کسی قوم کے افراد کے دلوں میں پیدا ہونا ممکن ہے اور جسکا کوئی عقلی جواب ہمارے پاس نہیں ہے ۔ لیکن اس خطرناک شبہہ کے رفت مذہب اپنی دستگیری کرتا ہے اور ہمیں بتاتا ہے کہ ایثار یعنے اوروں کے نفع کو اپنے ذاتی نفع پر مقدم رکھنے کی بنا عقل نہیں ہے ۔ بلکہ یہ نیکی جو ارتقاء نوعِ انسانی اور قومی کے لیے سخت ضروری ہے ایک فوق العادت اصول پر مبنی ہے ۔ آوازِ نبوت کا اصلی زور اور اسکی حقیقی وقعت عقلی دلائل او براہین پر مبنی نہیں ہے ۔ بلکہ اسکا دارومدار اس روحانی مشاہدے پر ہے ۔ جو نبی کی غیر معمولی قوائے کو حاصل ہوتا ہے اور جسکی بنا پر اُس کی آواز میں وُہ ربانی سطوت جبروت پیدا ہو جاتا ہے ۔ جس کے سامنے انسانی شوکت ہیچ محض ہے ۔ یہ ہے نمودِ مذہب کا اصلی راز جسکو سطحی خیال کے لوگوں نے نہیں سمجھا اور اسے غلطی سے اُنہوں نے اصولِ مذہب کو خونریزیوں اور عالمگیر جنگوں کا محرک تصور کیا ہے ۔ یہی حقیقت ہے قربانی کی ۔ جسکو تمام دُنیا کی قوموں نے وقتاً فوقتاً مختلف صُورتوں میں اختیار کیا ہے ۔ باریک بین لوگ جانتے ہیں ۔ کہ اگر قبائلِ انسانی کو ایثار کی تعلیم نہ دیجاتی تو یقیناً ارتقاءِ انسانی کا سلسلہ ٹوٹ جاتا اور موجُودہ تہذیب و تمدن کی وہ صُورت مطلق نہ ہوتی جو آج ہے ۔ اگر ارتقاءِ تمدن و تہذیبِ انسان کو ایک درخت سے تعبیر کیا جاوے تو مذہب اسکا ایک پھل ہوگا ۔ اور پھل بھی ایسا پھل جس کا کھانا قومی زندگی کے لئے ایسا ہی ضروری ہے ۔ جیسے پانی ہوا اور غذا کا استعمال جسمانی بقا کے لئے لازم ہے مذہب کچھ تعلیم ایثار کی رُو سے ہی ارتقاءِ انسانی کا ممد نہیں ہے ۔ بلکہ اسکا ایک اور پہلو بھی ہے ۔ جسکو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔ اہل نظر جانتے ہیں ۔ زمانۂ قدیم میں غلامی تمدن انسانی کا ایک ضروری جُزو تصور کی جاتی تھی ۔ یہانتک کہ افلاطون جیسے فلسفی

نے بھی اسے اپنی کتاب المملکت میں جائز قرار دیا ہے ۔ اس جواز کی ایک وجہ بھی ہے اور وُہ یہ ہے کہ اس زمانے میں کسی سے اُجرت پر کام کرا لینے کا خیال بھی انسانی ذہن میں نہیں آسکتا تھا ۔ ملازمت ایک آزاد معاہدہ نہیں تصوّر کی جاسکتی تھی ۔ اور چونکہ نظامِ تمدن اصُولِ ملازمت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا تھا ۔ اسواسطے غلامی کو جائز قرار دینا لازمی ہوا اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ انسانی کی ایک بہت بڑی تعداد بیجان اشیار کی طرح ملکیت سمجھی جانے لگی ۔ اور آخر کار اس آزاد جنگ کے میدان سے خارج ہو گئی ۔ جو ارتقار انسان کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ سب سے پہلے نبی عرب نے انسان کی فطری آزادی کی تعلیم دی اور غلاموں اور آقاؤں کے حقوق کو مساوی قرار دیکر اس تمدنی انقلاب کی بنیاد رکھی جس کے نتائج کو اسوقت تمام دُنیا محسُوس کر رہی ہے ۔ ایسا کرنا گویا نوعِ انسانی کے ایک کثیر حصّے کو اس آزاد مقابلے کے میدان میں واپس لے آنا تھا ۔ جس کے اثر سے تمدن و تہذیب کی اعلیٰ صورتیں پیدا ہوتی ہیں اور جو دُنیا کی تمام تہذیب و شائستگی کی بیخ و بنیاد ہے ۔ حکیمِ عرب کی اس مُبارک تعلیم کا نتیجہ کیا ہُوا ۔ مسلمانوں میں غلام بادشاہ ہُوئے ۔ غلام وزیر ہُوئے ۔ غلاموں کو اس کی تعلیم دی گئی ۔ غلاموں میں فلسفی اور ادیب پیدا ہُوئے ۔ غرض کہ اس قبیح امتیاز کے مٹ جانے سے ہر غلام ایک اعلیٰ خاندان کے آدمی کے ساتھ عقلی مقابلہ کر سکتا تھا اور اس مقابلے میں کامیاب ہو کر سلطنت کے اعلیٰ ترین مناصب پر پہنچ سکتا تھا ۔ اس تعلیم کا سب سے اعلیٰ نمونہ جناب فاروق نے پیش کیا ۔ جب کہ وُہ بیت المقدس کے فتح کے لئے جا رہے تھے ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے دُنیا کی کسی قوم کی تاریخ ایسی مثال پیش نہیں کر سکتی اور مسلمان اس تعلیم پر جس قدر ناز کریں بجا ہے ۔ علیٰ ہذا القیاس عورتوں کے حقوق کا نازک مسئلہ ہے جس کے متعلق حکیمِ عرب نے ایسی ہی آزادانہ تعلیم دی ۔ مگر چونکہ یہ مضمون نہایت وسیع اور بحث طلب ہے اسواسطے میں اسے یہاں نظر انداز کرتا ہُوں ۔ البتہ مناسب مقام پر اس کی طرف چند اشارات کرونگا

لیکن شرائطِ زندگی کے متعلق ایک اَور غور طلب بات ہو۔ کیا وُہ تمام حالات جنپر کسی قوم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ انسانی کوشش سے ایک خاص ترتیب میں جمع ہو سکتے ہیں؟ بالفاظِ دیگر قوم کی زندگی قوم کے اختیار میں ہے۔ یا پودوں اور حیوانوں کی طرح افراد انسانی کی زندگی بھی قوائے فطرت کے غیر اختیاری عمل پر منحصر ہے؟ اگرچہ زندگی کی اصلیت مخلوقات کی صُورت میں وُہی ہے۔ تاہم انسان اپنی عقلِ خداداد کی وجہ سے آفرینش کی ہر صُورت سے متمیز ہے۔ اللہ تعالےٰ نے اسے ایک ایسی قوت دی ہے۔ جس کے وساطت سے یہ شرائطِ زندگی کو سمجھ سکتا۔ اور ہر انقلاب کے لوازم پر غور کر سکتا ہے۔ اسکی گرفت ایسی زبردست ہو کہ یہ قدرت کے محض قوائے کو معلوم کر کر ان سے فائدہ اُٹھا سکتا اور اپنی ارتقار کے رُخ کو متعین کر سکتا ہے۔ جب یہ دیکھتا ہے کہ آبادی کی افزائش کے ساتھ زمین کی پیداوار قدرتی اسباب سے کم ہو رہی ہے تو یہ ان اسباب کا مقابلہ کرتا ہے اور مختلف اقسام کی ایجادوں سے ان کے مخالف کو روک کر اپنی زندگی کے سامان بہم پہنچاتا ہے۔ اگر انسان عقل کے زیور سے معرا ہوتا تو ترقی تہذیب و تمدن کے لئے کوشش کرنا بالکل بے سُود ہوتا۔ ہماری زندگی حیوانوں اور درختوں کی طرح ہوتی۔ ہم کسی انقلاب کا مقابلہ نہ کر سکتے اور ہماری بقا و فنا کا انحصار محض قدرتی اسباب پر ہوتا جنکی قوت کے سامنے ہم بالکل بیکس ہوتے۔

یہانتک تو مَیں نے شرائطِ زندگی پر زیادہ تر نظری لحاظ سے بحث کی ہے۔ اب مَیں واقعات کی طرف آتا ہوں۔ جن سے مَیں چند ایسے نتائج پیدا کرنے کی کوشش کرونگا جو اہلِ ملک و قوم کے لئے عملی لحاظ سے مفید ہوں۔ اگر ہم متمدن دُنیا کی گذشتہ اور موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقوام قدیمہ میں سے صرف چار قومیں ایسی ہیں۔ جو قوانین زندگی کی تیز تلوار سے بچکر بری بھلی حالت میں اب تک صفحہ ہستی پر قائم ہیں یعنی چینی ہندو بنی اسرائیل اور پارسی۔ حال کی قوموں میں سے دیگر مغربی اقوام کے

علاوہ ایشیا میں جاپانی اور فرنگستان میں اہل اطالیہ دو قومیں ایسی ہیں - جنہوں نے موجودہ تغیر کے مفہوم کو سمجھ کر اپنے تمدنی اخلاقی اور سیاسی حالات کو اسکے مطابق کرنیکی کوشش کی ہے لیکن چونکہ ہندوؤں اور چینیوں کی قومی زندگی کے اسباب اسرائیلیوں اور پارسیوں کی قومی زندگی کے اسباب سے بالکل مختلف ہیں - اور جہانتک مضمون زیر بحث کا تعلق ہے ہمیں کوئی عملی فائدے ابھی نہیں دے سکتے - اسواسطے میں ان دونوں قوموں کے دلچسپ اور حیرت انگیز سرگذشت کی طرف اشارہ نہیں کرونگا - اگرچہ یہ ساری قومیں قومی زندگی کے اصل مفہوم کو ادا نہیں کرتیں - تاہم یہ بات کچھ کم تعجب خیز نہیں ہے - کہ باوجود تمام خارجی یورشوں کے جو ان کے ممالک پر وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں - باوجود صدہا سال کی غلامی اور دیگر ارضی و سماوی آفات کے جو ان قوموں نے برداشت کیں - انکا نام و نشان اب تک قایم ہے - بنی اسرائیل کی تاریخ ایک دردناک کہانی ہے - جسکو ایک دردمند دل سن بھی نہیں سکتا - تاہم یہ قوم اپنے فطرتی قواے کے لحاظ سے اس قدر حیرت انگیز ہے کہ کوئی مشرقی اور مغربی قوم سوائے ہندوؤں کے اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی - دنیا کا سب سے پہلا مقنن اور توحید مطلق کے پہلے اُستاد حضرت موسیٰ علیہ السلام تھے - علیٰ ہذا القیاس زمانہ حال میں توحید وجود کا پہلا اُستاد بھی ہالینڈ کا ایک یہودی تھا - تعجب ہے کہ حقیقت اشیاء کے یہ دو اصول جو بظاہر ایک دوسرے کے نقیض ہیں اور جو دنیا کی تہذیب و تمدن میں سب سے بڑی قوتیں ہیں - ایک ہی قوم کے دل و دماغ سے کس طرح پیدا ہوئے - اگرچہ توحید وجود کا مسئلہ آل یافث کی ایشیائی شاخ یعنے ہندوؤں میں ایک حیرت انگیز ترقی پا چکا تھا تاہم یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ہالنڈ کے یہودی یعنے سپائی نوزا کی تعلیم ویدانت کے دقیق فلسفے سے بالکل متاثر نہیں ہوئی - سینکڑوں پیغمبر اس برگزیدہ قوم میں مبعوث ہوئے سینکڑوں شہنشاہ اور ہزاروں مقنن پیدا ہوئے - جنہوں نے قوم کے تمدن اور اسکی تہذیب کو معراج کمال تک پہنچایا - مگر آخر قہر الٰہی نے قوانین حیات کی صورت میں اپنا عمل کیا -

اور یہ قوم غلامی کی خوفناک مصیبتیں اُٹھاتی وطن سے بے وطن ہوئی۔ نہ وہ عظمت رہی نہ وہ سلطنت نہ وہ شوکت نہ وہ تہذیب نہ وہ تمدن غرضکہ پریشان اور خستہ حال ہو کر مغربی ممالک میں منتشر ہو گئی اور اب تک غیر اقوام کی سختیاں اُٹھا رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس قوم کی ایک شاخ یعنے قوم افاغنہ ایشیا کے ایک کوہستانی حصے میں آزاد حکومت کر رہی ہے۔ تاہم قوموں کے عروج و زوال کے اسباب پر غور کرنے والے اس بات کو جانتے ہیں کہ اگر افغانوں نے موجودہ انقلاب کے مفہوم کو نہ سمجھا اور اپنی آزاد حکومت سے تمدنی فواید نہ اُٹھائے تو یقیناً یقیناً اُنکا وہی حال ہو گا جو وسط ایشیا کی موجودہ قوموں کا ہو رہا ہے۔ باوجود ان تمام مصائب کے جو قوم بنی اسرائیل نے زمانے کے ہاتھوں برداشت کئے۔ حیران کر دینے والی بات یہ ہے کہ یہ قوم اب تک زندہ ہے اگرچہ قومیت اور حکومت نہیں رہی تاہم دولت کا یہ حال ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتیں اس قوم کی مقروض ہیں۔ اور اس دولت کے بل پر یہ قوم ایک عرصے سے اس تجویز کو عملی صورت دینے میں مصروف ہے کہ سلطنتِ عثمانیہ سے اپنا آبائی وطن خرید کر اپنی پرانی عظمت و جلال کی از سرِ نو بنیاد رکھے۔ یہودیوں کو چھوڑ کر پارسیوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالو۔ ایک زمانے میں عظیم الشان قوم تھی۔ یہودیوں کی طرح اس قوم میں بھی پیغمبر مبعوث ہوئے۔ کیانی تہذیب و تمدن انتہائی نقطہ تک پہنچا۔ اور آخرکار شہنشاہ یزدجرد کے عہد میں عربی تلواروں نے کیانی شائستگی کو صفحۂ عالم سے معدوم کر دیا۔ اور موبدوں کی آواز ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ آتشکدے ویران ہو گئے اور پیروانِ زرتشت وطن سے بے وطن ہو کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے۔ لیکن کیا یہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ گئی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں قوموں نے اس انقلاب کے مفہوم کو کسی قدر سمجھ لیا ہے۔ جس کی سب سے بڑی خصوصیت صنعت و تجارت ہے دنیا کی تجارت کا ایک کثیر حصہ ان کے ہاتھوں میں ہے۔ اور یہی وجہ ان کے سنبھل جانے کی ہے

اِصلاحِ حسرت

جناب ایڈیٹر صاحب۔ آپ کے اخلاقِ حسنہ نے ہم لوگوں کا تو ناک میں دم کر دیا ہے ع
ہماری جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔ موہانی صاحب ہیں کہ بار بار مخزن پر بیجا و بیجا حملے کیئے جا رہے ہیں۔ اور آپ ہیں کہ پروا تک نہیں کرتے۔ کوئی اس قدر بھی صلح کُل ہوتا ہے؟ آپ نے شاید چاہا ہوگا کہ حسرت جیسے دشمن کو آشتی سے دوست بنا لیں مگر وہ ایسے دن پیدا ہی نہیں ہوئے کہ اُنکے ساتھ نرمی کا برتاؤ فائدہ دے۔ لاتوں کے دیو ہیں باتوں سے کب ماننے ہیں؟

جب مخزن میں پنجابی اور اقبال نے موہانی صاحب کو لتاڑ بتائی تو آپ نے کچھ اس قسم کے معذرت آمیز سے فقرے لکھے تھے کہ ہم مخزن کو میدانِ کارزار بنانا نہیں چاہتے اور تو تو میں میں کے شغل کو پسند نہیں کرتے۔ وغیرہ وغیرہ صاحب! یہ درست فرمایا مگر جب ایک شخص کی جانب سے چھیڑ چھاڑ کی ابتدا ہو اور وہ آپ پر حملہ کرے اور بار بار حملہ کرے اور حملہ بھی صریحاً حاسدانہ اور گستاخانہ۔ اُس سے آپ ایک دفعہ درگذر کر سکتے ہیں دو دفعہ درگذر کر سکتے ہیں مگر بار بار درگذر کرنا عوام کالانعام میں کچھ اور ہی معنے رکھیگا کہ گویا آپ نے شکست مان لی۔ یہ بات کم از کم اس بندۂ درگاہ کو تو سخت ناگوار ہے۔

آپ کے صلح کل ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور آپ دُنیا میں کسی سے تعرض نہ کریں۔ لیکن از راہِ کرم اجازت دیجیے کہ حضرت حسرت سے اور اس نیاز مند سے کچھ تھوڑی سی نازو نیاز کی باتیں مخزن ہی کے صفحات میں وقتاً فوقتاً ہو جایا کریں۔ اُنکے دماغ کو سلامت اور صحت پر لانا نہایت ضروری ہے اور وہ ہیں کہ روز بروز زیادہ ہی زیادہ مخبوط الحواس ہوتے جاتے ہیں۔ دکن میں نو پروفیسر نقاد نے نہایت قابلیت سے سلسلۂ اصلاحِ اُردو کے متعلق شروع کر رکھا ہے اور مجھے اُن کے کام سے ہر طرح سے ہمدردی ہے۔ مگر میں بھی وقتاً فوقتاً اُن کا ہاتھ بٹا کر خاص

اڈیٹر اُردوئے معلّٰے کی نظم و نثر کو اصلاح دیا کرونگا - پروفیسر نقاد کی باضابطہ جماعتِ طلبہ میں اُردوئے معلّٰے کے نامہ نگار بھی داخل ہیں - وُہ کیا اڈیٹر اور کیا نامہ نگار سب کو پڑھاتے ہیں اور آجکل ابجد شروع کرا رکھی ہے - مَیں صرف اڈیٹر صاحب کے خارجی وقت کا اُستاد ہونگا -

یہ تکلیف مَیں اپنے اُوپر گوارا نہ کرتا اگر دو خوفناک مرضوں کو روز بروز حضرت حسرت پر مسلط ہوتے نہ دیکھتا اوّل مخزن اور اہلِ مخزن سے حسد دُوسرے جہلِ مرکّب -

موہانی صاحب کا مخزن سے حسد کرنا بالکل تحقیق ہو لفظِ تنقید کے مفہوم کو دیکھئے اور تنقید کی ذیل میں زیادہ تر جو کچھ مخزن کے بارے میں کہا جاتا ہے اُسکو دیکھئے - حالانکہ اور رسالوں کے بارے میں عموماً خوبیاں ظاہر کر دی جاتی ہیں اور کوتاہیاں چھپا لی جاتی ہیں مگر مخزن کی بُرائیاں (واقعی یا خیالی) گنوا دی جاتی ہیں اور خُوبیوں پر خاموشی کا پردہ ڈالدیا جاتا ہو - یہ حسد نہیں تو اَور کیا ہے ؟ مخزن ماہِ اگست سنہ ۱۹۰۴ء کے اغلاط کی ایک فہرست مرتب کرکے اُردوئے معلّٰے ماہِ ستمبر سنہ ۱۹۰۴ء میں چھاپی گئی ہو - اُسی فہرست کے بعد اسی عنوانِ تنقید کی ذیل میں گلدستہ بہار کی خوبیاں ہی خُوبیاں لکھدی ہیں کوتاہیاں ندارد - حالانکہ اسی نمبر گلدستہ بہار میں گھٹیا غزلیں اور لچر اشعار اور غلط نثر بھی موجود ہو جسکی تفصیل یہاں کرتا ہُوں تو گلدستہ مذکور سے خواہ مخواہ کی پرخاش ہوتی ہو - اور مجھے صرف حضرت حسرت کو کچھ سکھانا منظور ہو مطلب صرف اس قدر ہو کہ حسرت صاحب کو گلدستہ بہار کی خوشامد ہو یا کم از کم اُس سے حسد نہیں اس لئے اُس کی کوتاہیاں نظر نہ آئیں البتّہ مخزن کی بُرائیاں دماغ پر ایسی مستولی ہوئیں کہ سر چکرا گیا اور عقل خبط ہو گئی - اُدھر حسد کا پردہ تو آنکھوں پر پڑا ہوا تھا ہی پھر خُوبیاں کیا نظر آتیں؟

اب غضب یہ ہو کہ جو فہرستِ اعتراضات اُردوئے معلّٰے ماہِ ستمبر میں چھپی ہو اُسکو طُول بنانے کی غرض سے کاتب کے سہو تک صاحبِ مضمون کی طرف منسوب کر دئے ہیں حالانکہ کاتبوں کے مظالم سے وُہ سب لوگ واقف ہیں جنہوں نے مطابع کی عملی کارروائی کبھی ذرا بھی دیکھی ہو یا کبھی بھی کوئی چیز چھپوائی ہو - خصوصًا ایسے مطابع میں جہاں کام کی کثرت ہو - مثلاً دو اعتراض

کی بنا صریحاً سہو کاتب ہے۔ "مبارک دیتے ہیں" "کتاب پرشیا کا ترجمہ"۔

اب لیجے جملہ اعتراضات نمبروار اور اُن کے جوابات بطریق اختصار :-

"جُوں جُوں سمندر میں نکلتے گئے"۔ آپ فرماتے ہیں "نکلتے گئے" کے لئے "ہم" کی ضرورت تھی حالانکہ پہلے فقرے میں "میں" ہے۔ گویا جناب کے ذہنِ مخبوط میں صاحبِ مضمون نے ضمیرِ فاعل اس لئے حذف کی ہے کہ فقرہ متصلہ ماقبل میں مذکور ہو چکی ہے اور چونکہ اس قسم کا حذف وہیں جائز ہوتا ہے جہاں دونو فقروں میں ایک ہی ضمیر ہو اور یہاں فقرہ دوم میں ضمیر جمع ہے اور فقرہ اول میں واحد۔ لہذا حذف غلط ہے۔ یہی ہے نہ آپ کی مختصر سی سمجھ کے اندر؟ اور یہی بالکل غلط ہے۔ یہاں تو حذف ضمیر فاعل اُردو کے اس عام محاورے کے مطابق ہے جیسے کہدیا کرتے ہیں "جب شراب پیتے ہیں تو آنکھوں میں سرسوں پھُول جاتی ہے"۔ یہاں "پیتے ہیں" کا فاعل محاورے میں محذوف ہی رہتا ہے حتیٰ کہ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس فعل کا صیغہ متکلم کا ہے یا غائب کا یا حاضر کا اسی طرح "نکلتے گئے" کا فاعل محذوف ہے۔ ایسا حذف وہیں جائز ہوتا ہے جہاں قرینہ کلام سے فاعل صاف ظاہر ہو۔ چنانچہ یہاں قرینہ کلام سے اہلِ جہاز یا ہم فاعل ہے۔ لہذا حذف عین مطابق محاورہ ہے۔

کئی دنوں کو لئے جاتے تھے آپ کئی کو مہمل کہتے ہیں۔ مگر آپکے کہنے کا کیا گلہ ہے؟ غالباً آپ تو اگر تعزیراتِ ہند کا کوئی جرم بھی کریں تو بربنائے اختلالِ حواس بری ہو جائیں۔ آپ کا یہ قول بے دلیل ہے لہذا قابلِ جواب نہیں۔

آپ فرماتے ہیں "ریشمیں کا املا غلط ہے ریشمی چاہئے" یہ مُلّا خطرہ ایمان آپکے خواب میں کبھی کیوں آیا ہے کہ "ین" زبانِ فارسی میں حرفِ نسبت ہے جو اشیائے مادی کے ناموں کے آخر میں آکر صفت کے معنی کا فائدہ دیتا ہے زرین۔ سیمیں۔ نمکین۔ آہنیں۔ چوبیں وغیرہ وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔ آپ کچھ دنوں تک کسی اُستاد سے فارسی پڑھئے کا پھر اعتراض کرنیکی جرأت کیجئے گا۔ آپ کی علمیت تو اسی سے ظاہر ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ ریشم سے صفت ریشمیں نہ آنا چاہئے بلکہ ریشمی آنا چاہئے آپ کہتے ہیں کہ املا غلط ہے۔ واقعی آپکا مبلغ علم املا ہی تک ہے۔ آجکل پروفیسر نقاد کی

شاگردی میں املا سیکھا جا رہا ہے اس لئے املا ہی املا سوجھتا ہے۔

سنہری فرش۔ آپ فرماتے ہیں سنہری نہیں سنہرا چاہئے۔ سنہری یہاں بالکل ٹھیک ہے، اور قاعدۂ زبان کے مطابق یائے معروف نسبتی لگا کر ایک رنگ کے لئے یہ لفظ وضع کیا گیا ہے جیسے دھانی چمپئی۔ سنہرا ایک مُردہ لفظ ہے جسکو اہلِ ذوق سلیم کے کان سُننا تک گوارا نہیں کر سکتے۔ ناسخ مرحوم کے خاندان کے فخر جناب حکیم سیّد ضامن علی جلاؔل لکھنوی سلمہ بھی یہی لکھتے ہیں کہ سُنہری صحیح ہے مذکر و مؤنث دونو معنوں میں۔ روپہری البتہ غلط ہے۔ اور بھلا دیکھنا جب آپ جانتے تھے کہ سنہری کے بارے میں اختلاف ہے تو آپ نے کیوں اعتراض کیا؟ اِس سے زیادہ آپ کے حسد کا کیا ثبوت ہوگا؟

ہنستی ہنستی جہاز کی طرف دوڑتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں "ہنستی ہنستی" کے بجائے "ہنستی ہوئی" ہونا چاہئے۔ کوئی وجہ؟ کوئی دلیل؟ آپ جیسے مخبوط الحواس مبتدی کے اعتراض کو کوئی بلا دلیل کبھی مان سکتا ہے؟ جب آپ مدلّل اعتراض کرینگے تو ہم مدلّل جواب دینگے فی الحال یہی جواب ہے کہ فقرہ صحیح ہے اور اعتراض غلط۔

واپس ہوتا ہُوا دم لینے کے لئے رستے میں بیٹھ گیا۔ آپ فرماتے ہیں "واپسی کے وقت" یا "واپس ہوتے ہُوئے" چاہئے۔ افسوس آپنے کچھ پڑھا لکھا ہی نہیں اگر آپ کو سمجھائیں بھی تو کونسا سمجھ جائے گا۔ اے حضرت "واپس ہوتا ہوا" بھی درست ہے اور "واپس ہوتے ہوئے" بھی۔ فقرے کے معنے دونو صورتوں میں ایک ہی رہینگے صرف الفاظ متنازعہ کی نحوی حیثیت ایک دُوسرے سے مختلف ہے اور یہی وُہ نکتہ ہے جو آپ کے پست دماغ سے بہت بالا ہے۔ لیکن کوشش کیجے شاید سمجھ میں آجائے۔ "واپس آتا ہُوا" کہینگے تو "واپس آتا ہُوا" حال ہوگا۔ اور "میں" فاعل محذوف ذوالحال ہوگا۔ "واپس ہوتے ہُوئے" کہیں گے تو وُہ بہ معنی "واپسی کے وقت" ہوگا اور مفعول فیہ ظرف زمان ہوگا۔ ہائے ری سمجھ! تو مولانی کے حصّے میں کیوں نہ آئی!

سیر کو ہی نکلوں۔ فرماتے ہیں ہی کا استعمال غلط ہے سیر ہی کو چاہئے۔ مَیں کہتا ہوں

کہ اگر سیر ہی کو کہیں تو بیشک بہتر ہے اور اہلِ زبان کا قاعدہ یہی ہے۔ مگر جو سیر کو ہی کو غلط کہے اُسے اپنی سمجھ پر رونا چاہئے۔ اے بھائی ہی حرفِ تخصیص ہے اور جس لفظ کے ساتھ آتا ہے اُس پر زور دیتا ہے اب آپ یہ فرمائیے کہ کو کے بعد ہی کے آنے سے زور کسی اور لفظ پر جا پڑا یا اُسی لفظِ سیر پر رہا؟ اگر سیر ہی پر رہا تو آپ کا کیا بگڑ گیا؟ البتہ اگر ہی کے کو کے بعد آنے سے معنی کا یہ خبط پیدا ہوتا کہ بجائے سیر کے کسی اور لفظ پر زور جا پڑتا تو غلط کے درجے تک جا پہنچتا۔ اب اس کو غلط کہنا نقطِ غلط ہے غلط طور پر سمجھنا ہے۔

مجھ کو اس شخص نے مذکورہ بالا الفاظ کہے۔ میں مانتا ہوں کہ مجھ کو کے بجائے مجھ سے ہونا چاہئے۔

غصہ کا وُہ زہر جو ہاتھ اور بازو کے ذریعہ نہ نکلا۔ واقعی املا اسی طرح ہونا چاہئے جس طرح آپ فرماتے ہیں۔ اور مَیں خوش ہُوں کہ اب آپ کو املا کے قواعد تو ٹھیک آ چلے ہیں۔ آیندہ اُمید ہے کہ آپ کچھ نہ کچھ اَور بھی سیکھ جائینگے۔ مُبتدیوں سے صحتِ املا ہی بس غنیمت ہے۔ مگر بھائی میں آپ کے اِملے اور اِنشے سے تو اتفاق کر نہیں سکتا ان غریب الوطن لفظوں کی اصلی عزت و توقیر قائم رہنے دیجئے کیوں آپ انکو گلیوں اور بازاروں کے لفظ بنائے دیتے ہیں؟ آپ لکھنے ہیں اِملے کی یہ غلطی عام ہے۔ یہ پھر وُہی پُرانا قصہ چھڑا اور پھر آپکے سر میں سودے کی تغیر ہونے لگی۔ اِس سے آگے جو اعتراضات آپ نے اُس نوٹ پر کیے ہیں جو پٹنے اور مولانا شاد کی نسبت ہے اُنکا جواب عرض کرتا لیکن جناب ایڈیٹر مخزن کی ایک اڈیٹرانہ مصلحت مانعِ لب کشائی ہے۔ لہٰذا اس معصرت سے محرُوم رہتا ہُوں۔

تعارفی غالبًا سہوِ کاتب ہے۔ اگر نہیں تو واقعی غلط ہے۔ تعارف چاہئے۔

پہلو پہ جس کے چھا رہا ایک سبزہ زار تھا۔ فرماتے ہیں چھا رہا تھا کے بجائے چھایا ہُوا تھا چاہئے۔ یہ پھر وُہی اعتراض ہے جو آپ کمال نافہمی سے حالی کے اس مصرع پر کر بیٹھے تھے ع اِختلافِ قوم و ملت گُھل رہا تھا جس میں زہر۔ آپنے وہاں بھی ارشاد فرمایا تھا کہ گُھل رہا تھا کے بجائے

کھلا ہوا تھا چاہئے اس کی نسبت آپ کے شفیق اُستاد پروفیسر نقاد آپ کو ایک سبق دے چکے ہیں۔ یہ شک بھی اُنہی سے حل کر لینا۔ یہاں بھی آپ بر سرِ غلط ہیں۔ اب رہا چھار ہا میں رہا کے الف کا دبکر نکلنا۔ یہ قصہ بہت دُور دراز ہی اور اگر چھڑ گیا تو خُدا جانے کن کن اُستادوں کے کلام میں کون کون سے حروفِ علت دب دب کر نکلیں پھر آپ اس بوجھ سے ایسے دبیں گے کہ اُبھرنا مشکل ہوگا فی الحال جتنا سبق دیا جاتا ہی اُتنا ہی یاد کر لیجے شرح اور تفسیر پھر سکھا دینگے۔ سبق یہ ہی کہ الف کا اس طرح دب کر نکلنا جائز ہے اور اُستادوں کے کلام میں اسکی بہت سی مثالیں ہیں۔

اس کو طہارت کے مصدر سے مشتق سمجھا جاتا ہی۔ آپ فرماتے ہیں کہ فعلِ مجہول کے ساتھ کو کا لانا غلط ہی۔ مگر آپ نے کبھی غور بھی کیا ہی کہ کو آتا کیوں ہی؟ میں خود بھی سمجھتا ہوں کہ اگر کو نہ لائیں تو بہتر ہو۔ اور عربی جملوں کے نمونے کا پُورا خاکہ اُتر آئے۔ مگر کو کا لانا جو اہلِ زبان میں اس قدر کثرت سے مروّج ہی اسکا علاج کیا؟ آپ نے خود ایک مضمون میں کچھ عرصہ ہوا شکایت کی تھی کہ البشیر اور فلاں اور فلاں برابر فعل مجہول کے ساتھ "کو" لکھتے ہیں اسکا علاج ہونا چاہیے۔ البشیر غریب تو پنجابی نہیں ہی اسکو فعل مجہول کے ساتھ "کو" لانا کس نے سکھا دیا؟ حقیقت یہ ہی کہ اہلِ زبان لکھتے ہیں اور لکھینگے اور یہ کوئی بڑا ظلم بھی نہیں۔ یہ عمل قاعدہ اور عقل کے مطابق بھی تصور ہو سکتا ہی کہ کو علامت ہی مفعول کی۔ سمجھا جاتا ہی فعل متعدی مجہول ہی" اُس مفعول ما لم یُسمّ فاعلہٗ قائم مقام فاعل ہی۔ ذرا اس عبارت کو سمجھ لیجے اس میں عربی کے کئی لفظ آ گئے ہیں اور آپ ہیں کہ اپنی روزمرہ کی اُردو بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مفعول ما لم یُسمّ فاعلہٗ۔ مفعول اس فعل کا جسکے فاعل کا نام نہیں لیا گیا۔ پس کو اگر آیا تو مفعول کے ساتھ آیا کونسا ظلم ہو گیا۔ اگر کوئی بجائے میں گیا کے مجھ کو گیا کہہ دیتا تو علامتِ مفعول کو فاعل کے ساتھ لا کر ایک صریح ظلم کرتا اب کونسا غضب ڈھا دیا؟ علامتِ مفعول آئی تو مفعول کے ساتھ آئی حق بہ حقدار رسید۔ آپ کہینگے کہ یہ تو فاعل ہی۔ فاعل نہیں ہی فاعل کا قائم مقام ہی۔ فاعل کا تو "نام نہیں لیا گیا" (لم یُسمّ فاعلہٗ)۔ کیا سمجھے؟

قدرت نے ایک فینہ رکھا ہوا ہی۔ یہ واقعی غلط ہی۔ "قدرت کا رکھا ہوا ہے" کہنا چاہیے

قدرت نے رکھا ہے۔[له] چنانچہ میرے نزدیک بھی مؤنث ہے۔

"وہ خیالات زور سے میرے دل میں جاگزین تھے۔ آپ فرماتے ہیں" زور سے جاگزین تھے"

بے معنے ہے۔ یعنی آپ کی مختصر سی سمجھ کے اندر اس کے معنے نہیں سما سکے۔ خدا آپ کے حال

پہ رحم کرے۔ آئیے ہم سمجھائیں۔ جاگزین تھے کے معنے ہوئے جمے ہوئے تھے۔ بیٹھے ہوئے

تھے۔ پھر یہ کہ ایسے جمے ہوئے تھے کہ ہٹائے نہ ہٹتے تھے۔ یعنی مضبوطی سے دل میں جمے

ہوئے تھے۔ یہ زور کے ساتھ جاگزین ہونا نہیں تو اور کیا ہے؟ ہائے ری سمجھ! تجھے حسرت

سے کس قدر نفرت ہے!

آہ! کوئل کی یہ تانیں یہ پپیہے کا الاپ۔ فرماتے ہیں" الاپ" مؤنث ہے۔ حضرت یہ اردو

ہے خالہ اماں کا گھر نہیں ہے۔ موہان ضلع اناؤ میں الاپ کو مؤنث بولتے ہونگے۔ اہلِ زبان

کے ہاں بکثرت مذکر بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اساتذۂ لکھنؤ میں سے قدرت نے لکھا ہے۔[سه]

ایک ہی پردے کے تم سمجھو تو ہیں یہ سب الاپ گر صدائے بانگ ہے اور نغمۂ ناقوس ہے

اب ذرا دیکھئے کہ آپ نے دو چار صحیح اعتراضوں کے ساتھ ایک آدھ درجن غلط اعتراض

کرکے کتنی خفت اٹھائی۔ اگر یہی اعتراض جو ٹھیک تھے بیان کر دیتے تو ہم آپ کے ممنون ہوتے

اور نہ لڑائی تھی نہ جھگڑا۔ اب ہم کو شروع سے آپ کو ابجد خواہ مخواہ بھی سکھانی پڑی۔

آپ نے لکھا ہے کہ فی الحال ہم نے ان غلطیوں کو "معمولی صورت میں پیش کیا ہے آئندہ

مفصل اور مدلل طور پر کچھ لکھینگے۔ ہم نے بھی اکثر جوابات "معمولی صورت میں پیش کئے ہیں" آئندہ

جب آپ لکھینگے تو ہم بھی مفصل اور مدلل طور پر کچھ لکھینگے۔

آخر میں آپ نے لکھا ہے" البتہ اگر ہماری رائے غلط ہو یا ہماری تحریر میں بھی کچھ غلطیاں

[له] میری ذاتی رائے تو قطعی طور سے یہی ہے۔ لیکن پروفیسر محمد حسین آزاد کی سند اس طرز بیان کی تائید میں موجود ہے۔ ملاحظہ ہو

[سه] "طرے اغزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے۔ بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے۔ (خسرو امن کا دربار)

پس جو لوگ اس سند کی پیروی کریں انکو قطعی غلط کہنے کا اختیار ہم کو حاصل نہیں ہے +

انکو نظر آئیں تو بلا تکلف ہم کو ٹوک دیں" بھلا آپ بنفسِ نفیس فرمائش کریں اور یہ نیازمند سراپا نیاز تعمیل نہ کرے؟ یہ کبھی ممکن ہی؟ لیجیے ضیافتِ طبعِ سامی کا کچھ تھوڑا سا سامان حاضر ہے۔

برگِ سبز است تحفۂ درویش چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اوّل اوّل جب آپ نے تمام دُنیا پر اعتراض کرنے شروع کئے اور آپ پر کسی نے اعتراض نہ کیا تو آپ کو ضرور خیال ہوگیا ہوگا کہ اس چار دانگ ہندوستان میں ہمارا مدمقابل کوئی نہیں بس ہم ہی ہم ہیں اور کوئی ہم پر اعتراض کرے بھی تو کیونکر ہم میں عیب ہی کوئی نہیں۔ لیکن اُمید ہے کہ پروفیسر نقاد کی تحریروں نے کچھ کچھ تغیر آپ کے خیالات میں پیدا کیا ہوگا۔ جب نقاد نے اُردوئے مُعلّے کے ہر ایک پرچے کے اغلاط کی فہرست شائع کرنی شروع کی تو آپ سے بھی سوائے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ لیکن پروفیسر نقاد نے ہنوز آپکے قلمِ خاص کی نظم و نثر کو نہیں چھیڑا۔ مجھے آپکے نامہ نگاروں سے تعرّض نہیں صرف ذات والاصفات سے عقیدت خاص ہو۔ آپ ہی کی نظم و نثر کے مزے لوٹونگا۔ اب ذرا اُردوئے معلّے ماہ ستمبر ۱۹۰۳ء ملاحظہ فرمائیے

صفحہ ۲۔ "اس موقع پر منشی نول کشور کی قدردانی اہلِ کمال کا ذکر نہ کرنا ایک ظلم صریح ہوگا یعنی انکی سلطنت اودھ کے آخر وقت میں اور اُس کے بعد بھی مروت اور شرافت کا جیسا برتاؤ خصوصًا بعض شعرائے وقت کے ساتھ آپ سے ظاہر ہوا اُس کی بہت کم مثالیں ملینگی"۔

اوّل الفاظ "یعنی اس لئے کہ" قابلِ ملاحظہ ہیں۔ جن دو جملوں کے درمیان لفظ "یعنی" واقع ہوا کرتا ہے اُن میں سے پہلا مبہم محتاجِ تفسیر اور اس لئے اصطلاحِ نحو میں مُفسَّر ہوتا ہی دُوسرا اُس کی تفسیر ہوتا ہی۔ مفسّر اور تفسیر ملکر ایک جملۂ تفسیریہ ہو جاتا ہی۔ اگر آپ کے دونو جملوں کو اس نوع کا سمجھیں تو "اس لئے" بے معنے اور زاید۔ کہ "بے معنی اور زائد"۔ "یا یعنی" کو چھوڑ دیا ہوتا صرف "اس لئے" کافی تھا اس صورت میں جملہ اول معلّل اور جملہ ثانی تعلیل۔ معلّل تعلیل سے ملکر جملہ تعلیلیہ ہو جاتا۔ آپ کا جملہ کیا ہوا؟ جملہ تفسیریہ تعلیلیہ بیانیہ۔ یعنی شتر گاو پلنگ۔ یہ ہے نتیجہ اُس خصوصیت انداز کا جو خاص خاندان نسیم دہلوی کی شاخ موہانیہ کا حصہ ہی۔ کیا اچھا ہوتا کہ نہ یعنی لکھتے نہ اس لئے

نہ کہ۔ تینوں کو اُڑا دیجئے تو دونوں جملوں کا ربط ٹھیک ہو جائیگا اور عبارت کا آدھا بھدّا پن فوراً کافور ہو جائیگا۔ صرف آدھا رہ جائیگا پھر بھی آدھا کیوں رہ جائیگا۔ وُہ اس لئے کہ موہانی صاحب کے انداز تحریر سے بھدّے پن کو وُہ نسبت ہی جو گُل کنیر سے اُس کی بُو کو ہے۔ دونو لازم و ملزوم ہیں۔ آپ ذرا دیکھئے تو یہ فقرہ ثانی کس قدر لایعنی ہی "مروّت و شرافت کا جیسا برتاؤ" یہاں تک لکھا تھا کہ آگے لکھدیا "خصوصاً بعض شعرائے وقت کے ساتھ"۔ اب تخصیص تو معلوم ہو گئی مگر تعمیم کا بیان ندارد۔ اگر الفاظ زیر خط کو اُڑا دیں تو فقرے کی لایعنیت صاف عیاں ہو جاتی ہی اور طبیعت پوچھتی رہ جاتی ہی کہ شرافت کا برتاؤ کس کے ساتھ؟ چاہئے تھا کہ ظاہر ہوتا کہ عموماً فلاں فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ اور خصوصاً فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ اور خصوصاً فلاں قسم کے لوگوں کے ساتھ مروّت کی گئی۔ مگر یہ تو وُہ کرے جس کے سر میں عقل ہو۔ اسوقت یہ فقرہ سراپا لایعنی ہی۔

صفحہ ۲۔ "مرزا نسیم مرحوم جس زمانے میں کہ دہلی سے لکھنؤ تشریف لائے ہیں"۔ یہاں کہ زائد اور بے معنی ہی۔ اس کے بغیر ہی فقرہ مکمل ہی اور پُورے معنے دیتا ہی۔ اِس کے آنے سے معنی میں کوئی ترقی یا تغیر نہیں ہوا۔

صفحہ ۴۔ "اس شاگردی کی بنا چونکہ اخلاص پر ہوتی تھی اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ مرزا نسیم کیساتھ اُن کے تلامذہ کی گرویدگی بلا مبالغہ عشق کے درجے تک پہنچی ہوئی نظر آتی ہی"۔ کیساتھ کا املا غلط ہی کے ساتھ چاہئے۔ ورنہ لکھا کیجئے "حسرت کیلئے" بلکہ "حسرتکیلئے" آپ تو اوروں کو املا سکھاتے ہیں یہ آپ کے ہاں املا غلط کیوں؟ نیز ایک وعدہ کرتا ہوں کہ آج تو فرصت کم ہی کسی دن صرف آپ کے املا کے اغلاط کی فہرست نذر کرونگا اُس میں سوائے املا کے اور کسی شے کا ذکر نہیں آئیگا پھر آپ پر املا کی حقیقت کھلیگی۔ فی الحال املا سے ذرا بالاتر باتیں سُنئے۔ یہ آپ کا چونکہ نہایت بے معنی اور بے موقع ہی۔ جس طرح چونکہ اب واقع ہی اُس صورت میں قطعی لازم ہی کہ اسلئے کے بعد کے جملے کا مسندالیہ بنا ہو جو چونکہ سے پہلے واقع ہی ورنہ چونکہ بے معنی ہی۔ مثلاً صحیح استعمال کی ٹھیک مثال یہ ہی: "دریا چونکہ چڑھا ہوا نہ تھا اِسلئے پایاب تھا"

یا یا بی تھا مسند دریا مسند الیہ۔ اگر موجودہ عبارت کو آپ صحیح رکھنا چاہتے ہیں تو چونکہ کو اڑا دیجئے یا فقرے کے اوّل میں رکھد یجئے۔

صفحہ ۵۔ ''پانچویں شعر کو دیکھئے کس قدر اچھوتا مضمون کتنے اچھوتے الفاظ میں ادا کیا گیا ہے''۔ واقعی تحسین ناشناس اسی کا نام ہے شعر کی داد دینے کا شوق تو چرایا مگر داد دی غلط الفاظ میں۔ کتنے اچھوتے الفاظ کے کیا معنے؟ کتنے الفاظ یا کتنے اچھوتے؟ یہ کتنے کونسے معنی میں ہے مقداری معنی میں یا عددی معنی میں؟ اگر کہئے مقداری معنی میں ہے تو عددی میں کیوں نہیں یا اگر کہئے عددی معنی میں ہے تو مقداری میں کیوں نہیں؟ یعنی کونسا قرینہ ہے جس سے کوئی بھلا آدمی سمجھے کہ دو ممکن معنوں میں سے یہاں لازمی طور پر فلاں معنی مراد ہیں؟ ایسا مبہم لفظ بول کر فقرہ بے معنی کر دیا۔ ابہام دور کرنے کا کوئی ذریعہ آپ کے فقرے کے اندر موجود نہیں ہے کتنے کاٹ ڈالئے کیسے بنا ہے۔

صفحہ ۱۶۔ ''وضع قوانین کے معاملے میں نہایت غور وفکر کے ساتھ دلچسپی رکھتی ہے'' معاملے میں دلچسپی رکھنا'' بے معنی ہے'' معاملے سے دلچسپی رکھنا'' چاہئے۔

صفحہ ۱۸۔ گذشتہ ۱۵ یا ۱۶ سال کے عرصے میں ان باتوں کو جن معمولی کوششوں کے ذریعے سے ہم نے حاصل کیا ہے اُس کے دیکھتے ہوئے کسی کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں''۔ اُس کے بے معنی ہے۔ معلوم نہیں کس کے؟ ''اُس'' کا مرجع ''کوششوں'' ہو نہیں سکتا۔ کہ واحد اور جمع کا فرق ہے اور کوئی مرجع نظر نہیں آتا۔ غرض مثل حسرت سراپا بے معنی ہے۔

صفحہ ۲۰ ''مثلاً دادا بھائی نوروجی سر ولیم ویڈربرن وغیرہم کے موجود ہونے کی بھی اُمید ہے'' سید صاحب اُردو کا ہر روز کا وغیرہ لکھ دیتے تو کوئی کچھ نہ کہتا۔ آپ نے عربی الاپنی شروع کر دی بھلا جس کو اُردو نہیں آتی اُسکو عربی تو کا ہے کو آئی تھی وغیرہم بصیغہ جمع غلط ہے۔ بصیغہ تثنیہ وغیرہما کہیے دو ہی تو نام لئے ہیں نوروجی اور ویڈربرن پھر یہ ہم کہاں سے ہنک کر آ کودا؟

صفحہ ۲۰۔ کیا عجب ہے کہ جلد اس خطہ تاریک میں بھی کچھ جوش وخروش قائم ہو جائے''۔

کیسا بھونڈا تخیل ہے! ایک تو خطۂ تاریک واقع ہوا ہے پھر اُس میں ہو جائے جوش و خروش۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ اندھیرے میں جُوتا چلے گا اور سر پھوٹینگے۔ غالباً خطۂ تاریک کے لئے کوئی شعاع نُور لگی ہوتی! مگر غریب کیا کرے حواس میں خبط ہے۔

صفحہ ۲۱۔ "یہ حال تھا کہ ہال اور اُس کے ملحقات اس کی سیڑھیوں حتّٰی کہ اُس کے سامنے کی زمین پر تِل رکھنے کی جگہ نہ تھی"۔ حرف جار پر کا عمل چار لفظوں پر ہو ہال۔ ملحقات۔ سیڑھیوں اور زمین۔ ہال کے ساتھ پر غلط ہے ہال میں ہونا چاہئے۔

صفحہ ۲۵۔ "بانیانِ جلسہ کے لئے ضروری ہوا کہ یا تو جلسے کو ملتوی کر دیں یا اُسے میدان میں منعقد کریں"۔ یہاں "اُسے" کس قدر بھدّا اور بھونڈا اور خلافِ روشِ زبانِ اُردو ہے۔

صفحہ ۲۵۔ "باقی تمام حاضرین چاروں طرف پھیلے ہُوئے تھے"۔ اسے کہتے ہیں اُردو کو اُلٹی چھُری سے حلال کرنا۔ یہ پھیلے ہُوئے تھے ملاحظہ کیجے۔ اس لفظ میں انتشار کا خیال اور انتشار میں بکھرنے اور الگ الگ ہونے کا خیال مضمر ہے۔ اور آپ بیان کر رہے ہیں ایک ایسے مجمع کا کھڑا ہونا جس میں کہیں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ یہاں حاضرین کا "پھیلنا" قطعی غلط ہے "صف بہ صف کھڑے تھے" کہئے۔ "پرے جمائے کھڑے تھے" کہئے۔ صرف "کھڑے تھے" کہئے۔ مگر آپ تو عقلِ سلیم کے پیچھے ڈنڈا لئے پھرتے ہیں۔

یہ چند (صرف چند) مثالیں آپ کی نثر کی غلطیوں کی ہیں اب آپ کی غزلیں بتاتی ہیں۔

صفحہ ۴۸۔ غزلِ حسرت موہانی :۔

ہجومِ بیکسی کو وجہِ لُطفِ بیکراں پایا کرم نے آج اُس نامہرباں کو مہرباں پایا

واللہ کیا بے معنی شعر کہا ہے! ارے میاں کس کی بیکسی کو وجہِ لُطفِ بیکراں پایا؟ اپنی یا اپنے یار کی؟ آپ کے لفظوں کی رُو سے دو معنوں کا امکان بالکل برابر ہے اور کوئی قرینہ نہیں جس سے ایک معنی کو دوسرے کے مقابلے میں اختیار کر لیں۔ شاید آپ کو جو بہت بیکسی کی حالت میں دیکھا تو آپ کے یار کو آپ کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ یا یُوں ہُوا کہ پہلے تو آپکا

یار آپ کو گانٹھتا نہ تھا کیونکہ ہر وقت آپ کے دو چار رقیب اُس کے گرد رہتے تھے اب جو سب نے اُسکو چھوڑ دیا اور وُہ بیکس رہ گیا تو آپ کی قسمت جاگ گئی اور وُہ ناچار کس مپرسی سے تنگ آکر آپکے گلے کا ہار ہوگیا۔ کونسے معنے سمجھے جائیں اور کیوں؟ ادھر لفظ بیکراں چلا چلا کر کہہ رہا ہے کہ مجھ ناکردہ گناہ کو اِس لئے بیگار میں پکڑا ہے کہ قافیے کی ضرورت ہے۔ تُک بندی کی مرمت میں میں مارا گیا ورنہ معنی میں میرا کوئی حصّہ نہیں۔ واللہ باللہ ثم باللہ میں حشو محض ہوں۔

گر تھا رنگ بزم یار میں نیرنگِ عالم کا　　کسی کو سرنگوں دیکھا کسی کو شادماں پایا

ہائے رے لاچاری! پربت سے بھاری! شادماں کے مقابلے کے لئے کوئی لفظ زبان بھر میں دستیاب نہ ہوا آخر سرنگوں کے آگے سر جھکایا کہ بھائی اللہ تم ہی چل بیٹھو وزن تو پورا ہوجائے گا۔ حالانکہ شادماں اور سرنگوں میں مطلق کوئی تضاد یا تقابل نہیں ہے۔ سرنگوں کے معنے میں افسردگی اور رنجیدگی کا خیال لازم نہیں ہے۔ جس کو سرنگوں دیکھا کیا ضروری ہے کہ وُہ بمقابلۂ شادماں رنجیدہ یا افسردہ خاطر ہی ہو؟ شاید نشے میں یا نیند کے غلبے میں ذرا اونگھ گیا ہو۔ یا گہرے خیال میں سر جھکائے سر بگریبانِ تفکر کچھ سوچ رہا ہو۔ اِس صورت میں شادماں سے کیا خاک مقابلہ ہوا۔ اور نیرنگِ عالم کے رنگ کا کیا ثبوت ہُوا؟ کس قدر بودا اور بے معنی شعر ہے!

نہ پا سکتے کبھی پابند رہ کر قید ہستی میں　　سو ہم نے بے نشاں ہوکر تجھ کو بے نشاں پایا

کیا بھدّا اور بھونڈا تخیّل ہے۔ ادھر تو ہستی کا ایک پھندا تیار کیا اور اُس میں اپنا پاؤں پھنسا بیٹھے۔ سو اُس کے مقابلے میں چاہئے تھا کہ اس پھندے سے چھوٹنے کا ذکر آتا اور قید اور پابند کے مقابلے میں آزاد ہوجانے کا ذکر کرتے۔ مگر اُدھر چُپکے سے بے نشان ہوگئے۔ ظالم! اگر بے نشاں بننے کی دل میں تھی تو مصرع اوّل میں نام و نشان کا ذکر کیا ہوتا۔ اگر مصرع اوّل میں ہستی کا ذکر کیا تھا تو مصرع ثانی میں عدم یا نیستی یا نابُودی کا ذکر لازم تھا اور قید اور پابند

کے استعارے کا جواب استعارے میں ضروری تھا - المختصر اگر کچھ کہنے کو اُٹھے تھے تو شعر کے رنگ کو نباہا ہوتا - مگر ان باتوں کو تو وہ سمجھے جسے شعر سے کچھ مس ہو -

---

نہ جانے کوئی میری وضع رسوا پر کہ اے حسرت
کمالِ شاعری نے مجھ کو یکتائے زماں پایا

واللہ اس شعر نے تو لغویت کا خاتمہ ہی کر دیا - پایا ضرور پایا - کس نے پایا؟ کمالِ شاعری نے کس کو پایا؟ حسرت کو - کیسا پایا؟ یکتائے زماں - ہیں؟ یکتائے زماں کس جانور کو کہتے ہیں؟ یعنی کھول کر کہو کس چیز میں یکتائے زماں؟ ورنہ ہم کیا سمجھیں کس چیز میں یکتا لغویت میں - حماقت میں - لیاقت میں - جہالت میں - صداقت میں - آخر کس امر میں؟ بس یہی تو اس شعر کی لغویت کا ثبوت ہے کہ خدا جانے کس چیز میں یکتا پایا! مگر پایا یکتا - گویا ممکن ہے کہ یہ شعر آپ کی مذمت میں ہو ممکن ہے مدح میں ہو - اس ابہام کے صدقے اس نے شعر کو کس قدر لایعنی بنا دیا -

بس آج اسی قدر اصلاح کافی ہے آئندہ کے لئے یار زندہ صحبت باقی +

تحقیق

النّدوہ یہ رسالہ ۲۶×۲۰ تقطیع کے بتیس صفحوں پر انجمن ندوۃ العلما کی سرپرستی میں شاہجہانپور سے شائع ہوتا ہے - اسکا مقصد قدیم اسلامی علوم کا احیا اور علوم قدیمہ جدیدہ کا موازنہ ہے - چونکہ اسکی ترتیب شمس العلما مولوی شبلی صاحب نعمانی اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی جیسے دو مستند عالموں کے ہاتھ میں ہے اس لئے ہمیں امید ہے کہ اسے اپنے مقصد میں ضرور کامیابی ہو گی - علاوہ اور خوبیوں کے لکھائی چھپائی بھی پاکیزہ ہے - **قیمت** اوّل قسم کے کاغذ پر چار روپیہ (للعہ) مع محصول ڈاک - دوم قسم کے کاغذ پر تین روپیہ (لعہ) خریداری کے متعلق خط و کتابت سید عبدالحی صاحب منیجر النّدوہ شاہجہانپور سے ہونی چاہیے +

تحفۂ گلاب

جناب حافظ سید فضل حق صاحب آزاد عظیم آبادی کے کلام سے تو ہم بارہا مستفید ہو چکے ہیں۔ مگر جو لطف اس نظم میں جو آج شائع ہوتی ہے۔ آیا۔ وہ ہمیشہ سے نرالا ہے۔ ممکن ہے اس لطف میں ظاہری اسباب بھی شریک ہوں۔ کہ لندن میں بیٹھے۔ وطن سے ہزارہا میل کے فاصلے پر۔ سمندروں کے پار۔ وطن کا تحفہ پایا۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اصل میں یہ نتیجہ خود کلام کی اندرونی خوبیوں کا ہے۔ گلاب کا مضمون ہمارے علم ادب میں پامال مضمون ہے۔ مگر اس میں کیسی جدت پیدا ہوئی ہے۔ اور کس خوبی سے ادا ہوا ہے کہ کوئی پہلو تخیل کا جو گلاب کے پھول کو دیکھ کر پیدا ہو سکتا ہے۔ باقی نہیں رہا۔ اس پر زبان کتنی سلیس اور پیاری ہے اور پھر سلاست کو کس طرح عالی خیالی کے ساتھ نباہا ہے۔ کہ بے اختیار آزاد کے قلم جادو رقم کی تعریف کرنی پڑتی ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر تو اپنی کم بضاعتی پر افسوس ہوتا ہے۔ کہ نہ ہوئے شاعر۔ ورنہ ایسے تحفے کا شکریہ خشک نثر میں نہ کرتے۔ اور اب بھی رکھے پھیکے الفاظ سے یہ بہتر ہے کہ دل کو شکریہ کا کام سپرد کر کے ہم اس تحفے کو اپنے ہندوستان کے دوستوں کو بھیجیں:۔ (عبدالقادر)

بوٹے سے تیرے قد پر کیا حسن چھا رہا ہے
در پردہ حسن قدرت جلوہ دکھا رہا ہے

پروان چڑھ رہی ہے ہستی پلٹ کے کایا
کس حسن کی پری کا تجھ پر پڑا ہے سایا

کیا تھا خدا کی قدرت۔ کیا چیز ہو گیا تو
اک سبز چار پتے بس! اور کچھ نہ تھا تو

خود رنگ تھا نکالا آخر کو پاؤں تو نے
آنکھوں میں ہے۔ دکھائی جو دھوپ چھاؤں تو نے

سب میں نکھر کے نکلا کیا رنگ روپ تیرا
اک جیب دکھا کے تو نے رخ کو ہوا کے پھیرا

سبزہ زمیں کی رونق اب ہے ترے ہی دم سے — گلشن میں چہچہے ہیں تیرے ہی دم قدم سے
نشو و نما کی کھیتی تجھ سے ہری بھری ہے — جس بھیس میں ہے ظالم تو حور یا پری ہے
رضواں نے بھی نہ پائی شاید یہ خندہ روئی — غلماں غریب کو ہے خود فکر چارہ جوئی
نوبادگی میں ایسی کب تازگی کوئی ہے — جو تجھ میں ہے نزاکت وُہ جانِ نازکی ہے
اُٹھتا ہے پیار دل میں کیا بار بار تیرا — مُنہہ چُومتی ہے آ کر خود نوبہار تیرا
یہ ہلکی ہلکی رنگت یہ بھینی بھینی خوشبو — چُبھتے ہُوئے ہیں فقرے چلتا ہوا ہے جادُو
ہر پنکھڑی ہے تیری اک گلستانِ معنیٰ — ہر ہر ادا ہے تیری جان و جہانِ معنیٰ
گلدستۂ معانی ایک ایک پھول تیرا — مقبولِ جملہ عالم حُسنِ قبول تیرا
صلِّ علیٰ ہیں تجھ میں کیا کیا صفاتِ عالی — غنچوں کی مٹھیاں بھی زر سے نہیں ہیں خالی
پھولوں کو دیکھتا ہُوں کہتی ہے طبع جویا — چھٹکے ہُوئے ہیں تارے اک آسماں میں گویا
شمعوں کی جھلملاہٹ شاید ہے شہ نشیں میں — یا لعل جڑ دیئے ہیں بُرجِ زمُرّدیں میں
غنچے کھلے ہیں گُل وُہ ہنستے ہیں کھلکھلا کر — تخت آ رہا ہے پریوں کا اِک طرف ہوا پر
نازک سی ٹہنیوں میں کیا پھول پھُولتے ہیں — نوزادگانِ گلشن جھُولوں میں جھُولتے ہیں
یہ زر بکف ہے حاتم یا جمشید ایاغ بر کف — کسریٰ ہے تاج بر سر - زنگی چراغ بر کف
چہرہ کا یہ کس نے پوڈر کس نے ملا یہ غازہ — بچھڑے ہوؤں کی تجھ سے دل میں ہے یاد تازہ
آنکھوں کو تجھ سے ٹھنڈک دِل کو سرور تجھ سے — نامِ خدا وُہ جوبن شرمائے حُور تجھ سے
اس گُلستاں میں تیری باندھی ہُوئی ہوا ہے — کانٹا سا پھر جو کھٹکے تیرا قصور کیا ہے
گو کامیاب تجھ سے ہیں سر بسر نگاہیں — کچھ اور ڈھونڈھتی ہیں یہ منتظر نگاہیں
اس حُسنِ قدرتی سے یُوں سرفراز ہونا — ہے تیرے حق بجانب سرمستِ ناز ہونا
کیفیتیں کہاں ہیں وُہ بادہ و سبُو میں — نیرنگیاں جو دیکھیں اک تیرے رنگ و بو میں
یہ جھومنا لچکنا یہ پھُولنا پھبکنا — یہ اینٹھنا - سمٹنا - یہ پھیلنا - بہکنا

مرکز میں اپنے کیا کیا ہے دوڑ بھاگ تجھ کو　　اس بیخودی میں بھی ہے آپے سے لاگ تجھ کو
ہشیاریاں چھپی ہیں بیہوشیوں میں تیری　　گویائیاں ہیں مضمر خاموشیوں میں تیری
ہے زیر بار ہو کر ثابت قدم کہاں تک　　تو نے بھی بار اُٹھایا ہے اُٹھ سکا جہاں تک
رنج و خوشی سے خالی ہستی نہیں ہے تیری　　کچھ اس جہاں سے باہر بستی نہیں ہے تیری
جیسے جہان فانی ہستی بھی تیری فانی　　سب سے الگ نہیں کچھ قانونِ زندگانی
گردوں نے چھیڑنے کو جب چھیڑ چھاڑ رکھی　　تُو نے بھی گرد اپنے کانٹوں کی آڑ رکھی
دیکھے ہوا کے تیور جھٹ پتیاں سنبھالیں　　جُھڑنے پہ آ گیا جب شاخیں نئی نکالیں
سرچشمہ ہے جو صافی کب ہو سکا ہے گدلا　　سال اس طرف نہ بدلا تو نے لباس بدلا
صبر و رضا کی دولت بگڑی کو بھی سنوارا　　چھٹ چھٹ کے اور جُھڑ بٹ شاخوں نے تیری مارا
اہلِ نظر کرینگے کچھ تیری قدر دانی　　کانٹوں میں تو نے کھینچکر کاٹی ہے زندگانی
شبنم نے لاکھ تجھ پر گوہر کئے نچھاور　　رکھا قدم نہ تو نے زنہار حد سے باہر
دن کی طرح ہے روشن نظم و نسق ہے تیرے　　محرومِ محض کب ہے تو نورِ آگہی سے
رُوحوں کو تجھ سے باہم اور ربط زندگی کو　　پانی کے تیرے چھینٹے پھر غش کہاں کسی کو
نرمی نہ چھوڑی تو نے کیا کیا کڑی اُٹھائی　　اللہ ری نزاکت تو بھی کڑی نہ پائی
پھولوں میں تجھ کو سب سے نازک حسین جو پایا　　خوشبو کی رال ٹپکی اور رنگ رنگ لایا
کیا کیا پھسل پڑا ہے چکنی زمین پا کر　　پھسلن بھی چل پڑی ہے چلنی چمک دکھا کر
بے لاگ کہ رہا ہے یہ آتے آتے آنا　　تھا دسترس سے باہر یکسر قدم جمانا
یہ رنگ کیا ہے گویا اک رنگ کا ہے سایا　　نیرنگ دستِ قدرت اس رنگ نے دکھایا
کچھ سُرخ زرد نیلا آبی نہ ہے شہابی　　اس رنگ کو تو کہتے ہیں صاف ہم گلابی
یاروں کی اب سمجھ میں کچھ آئے یا نہ آئے　　خوشبو گلاب کی پھر چھپتی ہے کب چھپائے
ہے یہ گلاب آزاد اپنے چمن کا تُحفہ　　لندن کے دوستوں کو یعنی وطن کا تحفہ

غربت امراض کو بھی ساتھ لگا لاتی ہے

ہم کو اس عالمِ بالا کی خبر ہے معلوم جسکی مدت سے ہر دُنیا میں پڑی ایسی دھوم
بیش ازیں نیست کہ کشمیر کی ہوگی اک نقل وہ بھی دھندلی سی پریشاں سی مثالِ موہوم
جب میں سمجھونگا کہ مرائی تمنا ہے دل ایک کشمیری ہو خنجر ہو مرا ہو حلقوم
ہے جو لا یعنی صنم اُن کی پرستش ہونی منع نہیں کشمیر میں اصنام پرستی مذموم
پاؤں پر دخترِ دہقاں کے وہ سر رکھ دیتا کبھی کشمیر میں آ جاتا اگر قیصرِ روم

میں بھی اے کاش کسی وادی ہی میں کھو جاؤں
یا کسی حُسن کی دیوی پہ فدا ہو جاؤں

یلدرم (از بغداد)

مراثیٔ شاد

حال میں جو مرثیہ تین سو بندوں کا حضرت شاد نے تصنیف فرمایا ہے - ابتدا میں قریب تیس بندوں میں وحی والہام کی حقیقت بطور فلسفہ وادآئیہ کے بیان فرمائی ہے جو دیکھنے ہی کے لائق ہے - اس وقت تک واقعی اس صراحت و وضاحت سے وحی کا بیان سُنا نہیں گیا آغاز میں یہ بند تمہیداً تصنیف کئے ہیں :-

اے صدق و صفا آئینہ نفس میں گھر کر اے پرتوِ الہام مرے دل میں گذر کر
ساقی ہے کرم عام ترا مجھ پہ نظر کر پیاسا ہوں کوئی جام پلا آج تو بھر کر
ہے کب سے تحیّر مری حیرت کو گھٹا دے

بے پردہ اسرار تو للہ ہٹا دے

اِس بزم میں آنیکا سبب جان تو لُوں میں ۔۔۔ لینے کو نہ لُوں کچھ مگر ایمان تو لُوں میں
سمجھاتا ہے جو نفس اُسے مان تو لُوں میں ۔۔۔ دھوکا نہ کوئی ہو تجھے پہچان تو لُوں میں
اچھا نہ کسی راز سے یُوں مجھ کو خبر کر
حسرت ہو کہ کیا یاد کرونگا تجھے مر کر

اِنساں پہ صفت نفس کی کُھلتا ہے یہ مشکل ۔۔۔ سارے حکماء اس میں ہیں اب تک متامل
دُنیا میں کٹھن سب سے سوا ہے یہی منزل ۔۔۔ موقوف اِسی پر ہے تمیز حق و باطل
دریافت کریں نفس کی حالت یہ کدیں ہیں
کیا کیا صفتیں اس کی ہیں کیا اسکی حدیں ہیں

اسکے بعد نفس کی حالتیں اور ابہام دوئی کی حقیقت بیان کی ہے۔ [illegible] مثنوی میں گرمی کی کیفیت جب ہندوستان میں لوگوں کو خبر ہوئی ہے

ممکن نہیں اُس دن کی جو گرمی کا ہو مذکور ۔۔۔ گلخن کی طرح آگ سے وہ دشت تھا معمور
افراط حرارت سے برودت یہ ہوئی دور ۔۔۔ گرمی میں بڑھا مُشک سے بھی رتبۂ کافور
جل جل کے دھواں دیتے تھے ڈالے شجروں کے
انگار کی طرح خشک تھے خوشے ثمروں کے

وہ جیٹھ کی گرمی وہ کڑی دھوپ وہ میدان ۔۔۔ وہ ریت کا تپنا کہ پُھکا جاتا تھا انساں
وہ لُو وہ حرارت کہ جگر ہوتا تھا بریاں ۔۔۔ تر تھے جو گریباں تو جبیں عرق افشاں
مُنہ دھوپ کی شدت سے جُھکا لیتے تھے گھوڑے
رہ رہ کے قدم اپنے اُٹھا لیتے تھے گھوڑے

کچھ کام نہ کرتی تھی نظر دھوپ کے مارے ۔۔۔ آنکھوں میں چمک اُٹھتے تھے رہ رہ کے ستارے
پوشیدہ تھے کثرت سے پرندوں کے کچھار ۔۔۔ سب مُردہ صفت بیٹھے تھے دریا کے کنارے
پانی پہ دم ارباب جہاں دینے لگے تھے
کھولے ہوئے دریا بھی دُھواں دینے لگے تھے

کالا ہوا گرمی سے جہاں رنگ تھا کاہی ۔ کھولا تھا یہ پانی کہ گلی جب تی تھی ماہی
گر پڑتا تھا غش کھا کے ہوا جب کوئی راہی ۔ دبکے ہوئے تھے آڑ میں گھوڑوں کی سپاہی
زرہوں کے زِ سینے فقط اس لون سر چھپنے تھے
مغفر بھی سُلگتے ہوئے تنّور سے تپتے تھے

ہر شے کو تب و تاب تھی تھا ظہر کا ہنگام ۔ جل جاتے تھے گرتے ہی زمیں پر ثمرِ خام
چوپائے بھی پانی سے نہیں ہٹتے تھے دو گام ۔ کٹتے صبح سے منہ ڈالے ہوئے منتظرِ شام
بغلوں میں چھپائے تھے طیور اپنے سروں کو
پتّوں میں چھپے جاتے تھے پھیلائے پروں کو

سایہ بھی درختوں کی نگاہوں سے ہوا اوجھل ۔ جو شاخ بریدہ ہے وہ سُلگی ہوئی مشعل
گر پڑتا ہے کُملا کے بڑھا پھول جو جب پل ۔ جو برگ ہرا اخگر ہے جو تھالا ہے وہ منقل
نقصاں جو بڑے آگ کے لگنے سے سہے ہیں
کہسار بھی اجزائے دروں پھینک رہے ہیں

زر میں بھی پگھلتی تھیں وہ اس دن تھی کڑی دھوپ ۔ تیورا کے گرا خاک پہ وہ جب پڑی دھوپ
تھرّاتا تھا خود مہر کہ ہے آج بڑی دھوپ ۔ کیا منہ تھا کسی کا کہ سہے ایک گھڑی دھوپ
ذی روح جھکائے ہوئے سر ہانپ رہے تھے
جتنے تھے جمادات وہ سب کانپ رہے تھے

سرسبز شجر سوکھ گئے باغ کے بالکل ۔ منہ زرد تھا اور غرق پسینے میں ہر اک گل
منقار کو کھولے ہوئے تھرّاتی تھی بلبل ۔ پڑتی تھی کڑی دھوپ تو بل کھاتا تھا سنبل
تھی بند ہوا عقل تھی گم چرخِ کہن کی
خس خانے کے اندر تھی زمیں صحنِ چمن کی
جھک پڑتے تھے پانی کی طرف سروِ لبِ جو ۔ قمری کو فراموش ہوا نالۂ کو کو

بن میں صفتِ مُشک سیہ فام تھے آہو شبنم تھی یہ تشنہ کہ پئے جاتی تھی آنسو
بُو اُڑ گئی گھبرا کے گلوں کی چمنوں سے
پتّوں کی بھی باہر تھیں زبانیں دہنوں سے

دھرتی ماتا

اَے میری دھرتی ماتا مائی اے سارے سنسار کی دائی بُوڑھے بچّے پالنے والی [illegible]
بچّے بچّے پالنے والی آدم و حوّا کی اولادیں [illegible]
تیرے پیٹ پہ دوڑیں گا دیں ناہیں کودیں شور مچاویں [illegible]
طوطے مینا شاما بلبل کالی گھٹا میں ساتھ تیرے [illegible]
باغ میں ہے ہریالا تیرا گاتی ہے بلبل [illegible]
اور پپیہا شور مچاوے کالی [illegible]
کیوڑا [illegible] بیاہا [illegible]
[illegible]
کیا [illegible]
قُدرت کی اے راج دُلاری اے سارے سنسار کی [illegible] مجھ کو [illegible]
میرا دل بہلانے والی اے میری جان [illegible] میرے [illegible]
ایک زمانہ تک تو کتنی میری نظروں میں تھی پیاری آہ [illegible]
وُہ میرا بھولا بھالا زمانہ جب میں واقف بھی نہ تھا اس سے جینا کیا ہے [illegible]
اور وہ میری بے فکر جوانی غفلت میں جو میں نے کاٹی لیکر [illegible]

[illegible] سیر و تفریح — پھرتا تھا میں مارا مارا — تری محبت میں آوارہ
[illegible] ابتک — کتنی تو دلچسپ تھی جبتک — سبزہ تیرا فرش تھا میرا
[illegible] — تیرے باغ اور تیرے جنگل — تیرے اکھاڑے تیرے دنگل
[illegible] بلبیں — تیری کانیں تیری سبیلیں — برسوں میں نے اُنمیں گھوما
[illegible] نالا — تیری نہر کا بہتا پانی — برسوں دیکھی اُسکی روانی
[illegible] بناکر — پانوں پانی میں لٹکا کر — وہ تیری پُر تفریح ترائی
برسوں میں نے ہوا ہے کھائی — کھیلا ہوں میں کرکٹ اکثر — تیرے گیندے کے گیند بناکر
[illegible] پھلواریاں تیری — وہ بیلے کی جھاڑیاں تیری — پھرتی ہیں یوں میری نظر میں
[illegible] گھر میں — یاد ہے مجھ کو جب میں چڑھ کر — ایک پہاڑی کی چوٹی پر
[illegible] بیٹھا — کرتا تھا میں تیرا نظارا — کوسوں تک وہ تیرا سبزہ
[illegible] — [illegible] — [illegible] صاف چٹیلے میدان
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] — [illegible] — [illegible] سلوں میں
[illegible] — [illegible] — [illegible] قدرت کی [illegible]
[illegible] — [illegible] — یعنی دنیا کی آبادی
[illegible] — رونق گاؤں اور بستی [illegible] — اس [illegible] میں جب میں تھا
[illegible] کہ گویا — کوئی مجھ کو کھینچ رہا ہے — چونک پڑا میں کون ہے کیا ہے
[illegible] جانا میں نے — تجھ کو نہ تھا پہچانا میں نے — اب جو میں نے ہوش سنبھالا
[illegible] تجھ کو دیکھا بھالا — کھل گئی تیری ظاہرداری — دھوکہ بازی اور مکاری

یعنی کشش وہ تیری ہی تھی   تو ہی مجھ کو کھینچ رہی تھی

آخر تو نے گرا کر چھوڑا

خاک میں مجھ کو ملا کر چھوڑا

او مسری جھوٹے وعدوں والی   چکنی چپڑی باتوں والی   جسکی دوست اُسی کی دشمن
جسکی مولد اسی کی مدفن   جسکو سنوارے اسکو بگاڑے   جسکو پالے اُسی کو مارے
جانی دشمن اچھی خاصی   جان کی بھوکی خون کی پیاسی   لاکھوں چڑیا چنگل کھائے
لاکھوں نقشیں منہہ میں دبائے   لاکھوں پالے لاکھوں مارے   لاکھوں تو نے لاکھوں گاڑے
جھگڑے پیدا کرنے والی   فتنے برپا کرنے والی   لڑوا دینا کام ہے تیرا
بس بھرا بسوہ نام ہی تیرا   تیری ذات کا سارا جھگڑا   آئے دن کا خون خرابا
جسکو تو نے آہ ہنسایا   آٹھ آٹھ آنسو اُسکو رلایا   راجہ پرجا اور سپاہی
سادھو جوگی اور سنیاسی   اول اول ریجھے تجھ پر   پھر جو دیکھے تیرے چلتر
ایسے ایسے چرکے کھا کر   وہ وہ صدمے دل پہ اُٹھا کر   خون کے آنسو اُٹھے رو کر
ایسے گئے ناخوش ہو کر   پھر نہ تیری صورت دیکھی   اور نہ اپنی شکل دکھائی

نادر علیخان نادر (کاکوری)

چاندنی

کشمیر میں جہاں اور دلفریبیاں اور دلآویزیاں دلوں پر قبضہ کر لیتی ہیں شب ماہ کا دلکش منظر بھی خصوصاً ماہ اگست میں اہل دل کے لئے ایک خاص لطف رکھتا ہے۔ انہی دنوں جب

بتقاضائے حسنہ سے حسن نیچر کی کشش ہمارے مکرم آنریبل مسٹر شاہ دین صاحب ہمایوں کو بھی کھینچ کر لے گئی چنانچہ ایک دعوت کی تقریب پر جہاں جناب ہمایوں اور جناب چودہری خوشی محمد صاحب ناظر اور دیگر علم دوست اصحاب بھی موجود تھے۔ حضرت صادق نے پچاس شعر کی ایک نظم پڑھی جس میں سے چند شعر ہم ناظرین مخزن کی نذر کرتے ہیں:-

واہ کیا دلکش ہے تیرے دم سے منظر چاندنی
تو نے جادو کر دیا شاعر کے دل پر چاندنی

ہاتھ لگ جاتا ہے اس کے جب کوئی دامانِ ابر
منہ چھپا لیتی ہے کیا پہلو بدل کر چاندنی

اس لئے کھینچا ہے حق نے کوہساروں کا حصار
تا نہ جانے پائے اس وادی سے اڑ کر چاندنی

ہم کو ایوانوں سے مطلب جب سے ہیں صحرا نشیں
ہے زمیں اپنا بچھونا اور چادر چاندنی

پھول کرتے ہیں سحر کو اپنی خوش رنگی پہ ناز
شب کو رکھ لیتے ہیں جیبوں میں چرا کر چاندنی

جا لپٹتی ہے جوانانِ چمن سے بار بار
چومتی پھولوں کو ہے نظریں بچا کر چاندنی

شعلۂ جوالہ ساں ارض و سما پر ہے محیط
بحرِ فطرت کی ہے گویا موجِ مضطر چاندنی

اچھے اچھے اہلِ دانش کی بھلا دیتی ہے ہوش
ہے نکلتی رات کو جب بن سنور کر چاندنی

ہیں جو بالاتر سدا رکھتے ہیں پستوں کا خیال
آسماں پر چاند ہے اور ہے زمیں پر چاندنی

دامنِ کہسار میں کبکِ دری ہنستا ہے کیوں
چاند کا پیغام لائی مسکرا کر چاندنی

توڑ کر نکلا کوئی دیوانہ زنجیرِ جنوں
ڈھونڈتی پھرتی ہے اس کو آج گھر گھر چاندنی

تشنہ کامِ بحرِ قدرت آئے اور دیکھے یہاں
بہ رہی ہے مثلِ موجِ آبِ کوثر چاندنی

دیکھ انوارِ لطافت فلسفی اور دم نہ مار
سانس لینے سے نہ ہو جائے مکدر چاندنی

سبزے پر بکھرا ہے یہ کوئی ستارہ ٹوٹ کر
باغ میں آتی ہے یا شاخوں سے چھن کر چاندنی

ایسی ٹھنڈک۔ یہ ہوا۔ یہ بوئے دلکش اور یہ نور
کر رہی ہے بارشِ کافور و عنبر چاندنی

لوریاں دیتا ہے اسکو آبشاروں کا الاپ
یا ہوئی پانی کے تاروں پر نوا گر چاندنی

ہو مبارک جلسۂ یارانِ اخوان الصفا
جلوۂ نورِ خدا اندر ہے باہر چاندنی

ذرہ ذرہ میں ہوئی حسنِ ازل کی سی نمود　　بسکہ ہے دشت وجبل میں جلوہ گستر چاندنی
کاش انگلیں کہیں نیرنگ اور اقبال بھی　　وہ بھی سنتے ہیں۔ کہیں تیرے ثنا گر چاندنی
کام آیا اے ہمایوں تیری خاطر کا طلسم　　آگئی تحریر کے شیشے میں اُڑ کر چاندنی
صادقِ بیدل پڑے ہیں گوشۂ کشمیر میں　　جیسے جاڑوں میں رہا کرتی ہے شب بھر چاندنی

صوفیانہ رنگ کے پردے

مَیں غش ہوا جو پردہ اُٹھا روئے یار کا　　پردہ ڈھکا رہا مرے صبر و قرار کا

(سرور)

حسنِ معنی جو ہوا پردہ کشائے نیچر　　چٹکیاں لینے لگی دل میں ادائے نیچر
تیری قدرت جو ہوئی جلوہ فزائے نیچر　　ماہ و خورشید ہوئے محوِ لقائے نیچر
پھر تو بے پردہ تجلی نظر آئی تیری
دل کے آئینے میں تصویر اُتر آئی تیری

آشکارا ہوئی وحدت تری کثرت بنکر　　نظر آنے لگی خلوت تیری جلوت بنکر
تو جو ظاہر ہوا پردے سے حقیقت بنکر　　پھر تو اُڑنے لگی شہرت تری نکہت بنکر
بنکے جب کارگہِ دہر میں اُستاد آیا
لئے اِک بوقلموں پردۂ ایجاد آیا

تیری شوخی نے اُٹھایا جو حیا کا پردہ　　نظر آیا عجب اِک حسنِ ادا کا پردہ
اُٹھ گیا صاف۔ جو حائل تھا خفا کا پردہ　　رُخ کا پردہ تھا نہ اب زلفِ دوتا کا پردہ
بنکے آئے نظر ایام و لیالی دونوں
تھے تری جلوہ نمائی سے نہ خالی دونوں

اپنے بندوں سے جو پردہ تجھے ستّار نہ تھا   کوئی بندہ ترا حسرت کشِ دیدار نہ تھا
درمیاں میں جو ترا پردۂ اسرار نہ تھا   آئینہ تشنہ لبِ جلوۂ انوار نہ تھا

لاکھ پردوں سے نظر تو مرے ستّار آیا
حسن بنکر ترا یوسف سرِ بازار آیا

تری صورت میں عجب عالمِ یکتائی تھا   ایک عالم تری صورت کا تماشائی تھا
تو نہ کب تشنہ لبِ انجمن آرائی تھا   برق بے پردہ نہ کب پردۂ رعنائی تھا

شوخئ حسن ازل کہتی تھی دلہن بنکر
میں رہونگی نہ چراغ تہِ دامن بنکر

تو اٹھاتا نہ اگر پردۂ انوارِ شہود   دیکھتا کون تجلّی تری یاربِّ ودود
پردۂ غیب سے ہوتا کسی شے کا نہ وجود   ہیں کرشمے ترے جلوے کے یہ سب یا معبود

تو نہ پردے میں اگر پردہ کشائی کرتا
کس کو قدرت تھی کہ پیدا یہ خدائی کرتا

محتجب پردۂ وحدت میں جو کثرت ہوتی   پردہ داری جو ترے حسن کی عادت ہوتی
تو خدائی تری ہوتی نہ یہ خلقت ہوتی   اور ہی عالمِ ایجاد کی صورت ہوتی

چاند سورج نہ یہ ہوتے نہ یہ تارے ہوتے
تیری قدرت کے نہ آنکھوں کو نظارے ہوتے

گھر سے بے پردہ نکلتی جو نہ وحدت تیری   بیٹھی ہوتی کہیں سمٹی ہوئی کثرت تیری
منہ چھپا لیتی دلہن بنکے جو قدرت تیری   کس پہ کھلتی مرے ستّار حقیقت تیری

رخ سے پردہ جو حیا کا نہ اٹھایا ہوتا
بنکے یوسف سرِ بازار نہ آیا ہوتا

تو اٹھاتا نہ اگر پردۂ اخفائے عدم   دیکھنے والے تجلّی کے تری کون تھے ہم

تو اٹھاتا نہ اگر جلوۂ انوار حرم کس پہ کھلتا میرے ستار ترا رازِ قدم
پوجتی پاؤں ہر اک بت کے خدائی تیری
شکر ہے - ہم کو تجلی نظر آئی تیری

حسن باطن کو جو پردے میں بٹھا رکھا ہوتا نور تیرا ترے آغوش کا پالا ہوتا
طور پہ برقِ تجلی کو سنبھالا ہوتا گھر سے بے مقنع و بیپادر نہ نکالا ہوتا
آنکھ موسٰی سے جو تو نے نہ لڑائی ہوتی
طور پہ برقِ تجلی نہ گرائی ہوتی

حسنِ ایجاد کا پردہ تو اٹھاتا نہ اگر تیری صنعت کے نمونے نظر آتے کیونکر
وہ عناصر کا ہیولا جسے کہتے ہیں بشر بطنِ مادر کے نہ پردے سے نکلتا باہر
برق بے پردہ جو گرتی تری چلمن بنکر
بیٹھ جاتی کہیں شوخی تیری دُلہن بنکر

جلوہ فرما نہ ترا حسن تماشا ہوتا کہ خود آئینہ تو اور آئینہ سیما ہوتا
اپنے بندوں سے جو یارب تجھے پردا ہوتا آ کے دُنیا میں ترا حسن نہ رسوا ہوتا
تجھ کو تشہیر کیا تیری خود آرائی نے
کر دیا عام تجھے جلوۂ ہرجائی نے

[illegible]

ناظم

نواب محمد یوسف علیخاں بہادر مرحوم رئیس رام پور مراد آباد نواب محمد سعید خاں بہادر کے فرزند ارجمند تھے - ۵ ربیع الآخر ۱۲۳۲ھ ہجری سالِ ولادت ہے - دس برس چار مہینے گیارہ روز مسادہ آرائے ریاست رام پور رہے - ۲۴ - ذیقعدہ ۱۲۸۱ھ ہجری کو رحلت فرمائی - ریاست کے نظم و نسق میں اپنی

نکر صاحب سے اصلاحات پسندیدہ کیں - باغات اور تعمیرات سے شہر کی رونق بڑھائی - غدر ۱۸۵۷ء کے پرآشوب زمانہ میں رام پور کو شر و فساد سے محفوظ رکھا بلکہ حسب ایمائے سرکار انگلشیہ ضلع مراد آباد کا انتظام بھی اپنے ہاتھ میں لیا اور فیروز شاہ کو پسپا کیا۔ جس کے صلہ میں دولت برطانیہ نے ایک قطعہ ملک خراجی ایک لاکھ اٹھائیس ہزار پانسو روپیہ محاصل ریاست اور اختیار فیصل جملہ مقدمات دیوانی و فوجداری عطا فرمایا اور [illegible] سے ستارۂ ہند اور خطاب فرزند دلپذیر بھی مرحمت ہوا - جملہ علوم و فنون مشرقیہ میں مہارت تھی - بالخصوص منطق کی جانب میلان طبعی تھا - ذہین، بر طباع، رنگین طبیعت، خوش صحبت تھے - فن شعر کے قدردان تھے - منشی مظفر علی خاں اسیر، جناب امیر مینائی، مرحوم منشی سید اسمٰعیل حسین منیر، شیخ امداد علی بحر، مرزا محمد رضا برق، منشی احمد حسین عروج کو طلب فرمایا اور تمہ زندگانی کی ہمیشہ علمی مباحث اور سخن آفرینی کے مشغلے رہتے تھے - چنانچہ ایک غزل میں مقطع کہتے ہیں - ؎ شعر کا چرچا ہو اور شاعر کی قدر - ہوش میں ہوتے ناظم کے ہم دربار سے - خود بھی شعر فرماتے تھے - ابتدا میں جب دلی میں تھے تو مومن مرحوم کو کلام دکھاتے تھے پھر مرزا غالب سے مشورہ ہوا اور بعد رحلت مرزا منشی مظفر علی خاں اسیر لکھنوی سے استفادہ فرمایا - دیوان جو ملاحظہ مرزا غالب مرحوم میں گذرا ہے وہ مطبع حسنی رام پور میں ۱۲۸۲ھ ہجری میں بلطافت محمد کریم اللہ خوشنویس طبع ہوا ہے اس دیوان میں علاوہ غزلیات کے ایک خمسہ یعنی غزل کا اور تین سہرے اپنے بھائی نواب حیدر علیخاں مرحوم کی عقد مناکحت کے اور نو سلام اور رباعیات اور ایک قطعہ تاریخ عطائے ملک جاگیر یہ سرمایہ ہے - ہر صنف شعر میں جدت ترکیب نوی الفاظ تازگی مضمون شوخی ادا اور تمام خصوصیات کلام مرزا کی پائی جاتی ہیں - اور خوب دیوان ہے -

انتخاب جو میں نے اس دیوان کا کیا ہے - وہ بعد نظر ثانی جناب ثاقب رسالہ مخزن میں پیش کرتی ہوں - امید کہ مقبول معنی سنجان دقیقہ یاب ہو +

راقمہ

عفت عاصیہ

منتخبات از دیوانِ ناظم

اُترے گا سرو گلے سے جو ہار — پیرایۂ نوبہار ہوگا۔

پیرایۂ نوبہار۔ اچھی ترکیب ہے۔

تو نہ آیا پر اجل وقت سے پہلے آئی — آدمی اس کی اگر اتنی تمنا کرتا
گر پڑے ہیں میکدہ سو بار مگر کیا — بھر دیتے ہیں گرے سے تو مینا نہیں اُٹھتا

مینا نہیں اُٹھتا۔ کیا ضعف ہے۔

کیا ہم بھی یہاں آئے تو بُت بنگئے ناظم — بُتخانے سے دیتک قدم اپنا نہیں اُٹھتا
دل کے لینے میں یہ قدرت اسے اللہ نے دی — جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا
کہاں کی نیند ادا جب یہ اسکی یاد آجائے — اُٹھا کے تکیہ سے بازو پہ سر کو دھر لینا
دیکھ کر شمع پہ گرتے ہوئے پروانے کو — پُوچھتے ہیں کہ یہ ہوتا ہے تماشا کیسا
بس اے حریص قتل کہ اب ہوگیا ہے تنگ — ارواح کے ہجوم سے عالم مثال کا
ڈھونڈوں تو کس پتے سے اسی پاؤں اُٹھا کر — عاشق ہوں حسنِ سادہ بے خط و خال کا
فرقت میں بندھ رہا ہے تصور وصال کا — داغِ جگر چراغ ہے بزم خیال کا
یہ عالم آئینہ ہے ترے روئے زیبا کا — وُہ تو ہی ہوگا اگر کوئی دوسرا ہوگا
گداز دل ہے ناظم یہ جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے — پڑا ہے مجھ کو رونا داغہائے سینہ فرسا کا
ناظم وفائے وعدہ کی اُمید ہے کسے — مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہوگیا

سبحان اللہ۔ کیا شعر ہے۔

ہوتے ہی دردِ دل کا بیاں اُٹھ کھڑے ہوئے — یعنی یہ ایسے ہیں کہ نہ اُن سے سُنا گیا
معتقد ہوں کعبے کا ناظم یہ وہاں جا کر مجھے — عبرت آتی ہے کہ کیا بتخانہ ویراں ہوگیا
بات ایسی کونسی ہے کہ جسکو بڑھائیے — اک مختصر سوال ہے یا بوسہ یا جواب
مے پیجئے بہار میں پُوچھے اگر خُدا — ہے عذر ذوقِ بخششِ آب و ہوا جواب

دوسرا مصرع گویا مرزا کے دیوان ریختہ کا فارسی مصرع ہے۔

زمیں پہ گر کے بھی ہوتی نہیں شراب تلف — کہ زیرِ خاک ہیں رنداں بادہ خوار بہت

گر نہ تھی ہجر میں اُمیدِ وصال — جیتے رہنے کا ہوا کیا باعث
چشمۂ خضر میں مَے ہے بیشک — آب ہو عمر فزا کیا باعث
عشق ایک گنج ہے مگر اس میں ہوئی ہیں جمع — غمہائے جاں گداز و مرضہائے لاعلاج
دکھلاؤں حال کیا انہیں جنکی تمام عمر — دیکھی یہی طرح کہ نہ دیکھا کسی طرح

یہی طرح۔ کو دیکھئے اور عالمِ خیال کے لُطف اُٹھائیے۔

لائے کس کے لئے پہنچائے کسے جائے کہاں — بُوئے گل سے ہے خفا بادِ سحر میرے بعد
وُہی تم ہو وُہی خنجر ہے پہ انصاف کرو — ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد

قطعہ

ہاں تلازم کو تو دیکھو کہ جو بھیجے تم کو — شوقِ دیدار میں لکھ لکھ کے مکرّر کاغذ
پھاڑ کر پھینک دیئے تم نے پر اُن ناموں کے — جمع ہیں سُرمہ فروشوں کی دکاں پر کاغذ
خوش ہیں سب غنچوں کے کھلنے سے کریگا کون خیال — کہ بنا زخمِ جگر عقدۂ دل وا ہو کر
قتل سے میرے عبث ڈرتے ہو دب جائیگی بات — کوئی رو جائے جگہ شہر میں چرچا ہو کر
ندو نزاع کو اتنا بھی طُول ڈرتا ہُوں — کہ جا پڑے نہ کہیں بات روزِ محشر پر
ملے ہیں آج کفِ پائے یار سے ناظمؔ — بجا ہے دُوں اگر آنکھوں کو میں جگہ سر پر

قطعہ

کل سُنا ہے کہ مرض کھونیکا دعوے کرکے — اِک بڑے چارہ گر آئے ترے بیمار کے پاس
دی دوا لکھ کے پر اس خستہ نے لی راہ عدم — نسخہ پہنچا بھی نہ ہوگا ابھی عطار کے پاس

قطعہ کے مصرعِ آخر کی شوخی اندازِ خاص ہے مرزا سے مرحوم کا۔

تیرا پھرنا اس فضا میں دیر تک منظور ہے — ورنہ حق کو کیا ہی طولِ روزِ محشر سے غرض

یہ خیال بھی خصوصیاتِ اُستاد سے ہے۔

مَیں نے کہا کہ دعوے اُلفت مگر غلط — کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط

کسقدر غلط کے وسعتِ معنی مُلاحظہ ہو۔

آ جائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجئے — عشقِ مجاز و چشمۂ حقیقت مگر غلط

مصرع اولیٰ کی شوخی اور مصرعِ آخر کی ترکیب پارسی اُستاد کی توجہ پر دلالت کرتی ہے۔

[illegible] بیٹھا — [illegible]

[illegible] کر [illegible] — [illegible]

[illegible] مرتے ہیں کس کا ہے کہو کام — کچھ [illegible] ہے

[illegible] پھر کر جنازہ کہ مر گیا — مرنے کی [illegible]

[illegible] میں حدیث نہیں جبکو [illegible] — ہے نظم و نثر اہل [illegible]

[illegible] غزل بھی بحر اور ردیف کتنی استوار ہے۔ اس غزل کو استاد [illegible] اور نواب مرزا خان داغ دہلوی نے بھی تضمین کیا ہے۔ داغ کے مصرعے

[illegible] گئے حرف بسکہ تھیں نمناک — میں نے آنکھوں سے کیوں [illegible]

[illegible] کے زندگی میں دعا پاتے تھے ثواب — کرتا ہوں جان دینے میں [illegible]

عالمِ نزع کی بے آرامی اور دیر پائی کو کہتا ہے کہ گویا میں جان دینے میں [illegible]

[illegible]۔ یہ بھی غالب کا فیضانِ سخن ہے۔

[illegible] زلف میں تو نے کیا ہے رقص — جو رہ گئے اُلجھ کے ترے بال [illegible]

بال پر بھی داغ اُلجھ کے رہ گئے۔ یہ نوی خیال میرزا صاحب کا [illegible]

تو بہار آئی اور کیا ہوگا — کچھ نکھر جائیگا خزاں کا رنگ

بہار سے خزاں کا رنگ نکھر جائیگا۔ کیا شادابی خیال ہے۔

[illegible] دیکھئے نالۂ غم — ہے بُرا چشمِ خوں فشاں کا [illegible]

[illegible] آرائش عالم کب تک — جاودانی سہی یہ نقش مگر [illegible]

[illegible] سرشک اور نہ دم توڑیگا — گریہ پے در پے [illegible]

[illegible] گر چہ کہ مجھ میں نہیں طاقت باقی — زخمِ دل [illegible]

[illegible] مرے نامو کو لے کر نہ جواب — [illegible] دیوار کے روزن میں [illegible]

[illegible] تذکرہ [illegible]

[illegible] کب تک [illegible]

مخزن ایجنسی

محصول ڈاک بذمہ خریدار

مندرجہ ذیل کتابیں ‌‌... کی ہیں اگر ایک ساتھ خریدیں تو ... میں مل سکتی ہیں۔

آثار الصنادید ([illegible])	سرسید مرحوم کی پہلی تصنیف جس میں دہلی اور اسکے تمام قدیم مقامات معہ تصویرات نہایت تفصیل سے کلبند کیے گئے ہیں۔
مجموعہ لکچرز سرسید ([illegible])	ان تقریروں میں ۱۸۶۳ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک سرسید کی تقریریں جمع کردی گئی ہیں۔
آبحیات مصنفہ آزاد ([illegible])	جس میں تمام مشاہیر شعرا کی سوانح عمریاں نہایت تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔
فلورا فلورنڈا ([illegible])	مصنفہ مولوی عبد الحلیم شرر۔ نہایت دلکش اور دل پر اثر کرنے والا ناول۔
ثمرۂ دیانت (۸)	مصنفہ منشی عزیز الدین صاحب ... اس کتاب میں ... کی اہمیت ... اور اس کے بڑے نتائج دکھائے گئے ہیں۔
کیمیائے زراعت ([illegible])	مؤلفہ شمس العلماء خان بہادر سید امداد امام۔ یہ کتاب فن زراعت پر کسی قابلیت سے لکھی گئی ہے۔ زراعت کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔

ذیل کی کتابیں ... کی ہیں اگر ایک ساتھ خریدی جائیں تو ... میں مل جائیں گی۔

آثار الصنادید۔ آبحیات۔ ثمرۂ دیانت۔ فلورا فلورنڈا۔

ذیل کی کتابیں ... کی ہیں۔ ایک ساتھ لینے پر ... میں مل سکیں گی۔

سرسید کے آخری مضامین۔ حالات روس۔ آثار الصنادید

ذیل کی کتابیں ... کی ہیں اسوقت صرف ... میں لے سکتے ہو۔

حالات روس۔ اسباب بغاوت ہند (مصنفہ سرسید احمد خاں) ... تہذیب ... ثمرۂ دیانت۔ حیات ... النساء۔ بدر النساء کی مصیبت۔ مسدس حالی معہ ضمیمہ۔ تذکرۂ شعراء ...

خالص مصطگی رومی کا تیل

معزز صاحبان اسوقت ادویات کی نسبت اشتہار کے ذریعہ آپ کو یقین دلانا نہایت مشکل ہو گیا ہے۔ پہلو بہتر ہے کہ آپ ہماری ادویات کا پہلے نمونہ منگا کر یقین کر لیں پھر ادویات طلب فرمائیں ہمارے خیال میں اس سے عمدہ طریقہ ادویات کی عمدگی کے یقین دلانیکا نہیں۔

یہ تیل دل و دماغ کو طاقت بخشتا ہے طبیعت کو فرحت و تازگی دیتا ہے۔ اضعاف حافظہ کیلئے اکسیر ہے یادداشت کو بڑھاتا ہے ہر قسم کی بدہضمی کو دور کرتا ہے اور اس قسم کے چند امراض کیلئے نہایت ہی مفید ہے قیمت فی شیشی ایک اونس صرف عـہ محصول ڈاک ۴ر نمونہ کی شیشی ۱۲ر۔ اگر کوئی شخص ۲ عدد شیشی اکٹھی لیں تو قیمت مع محصول ڈاک ۷ روپیہ۔

سارٹیفکیٹ

۱۔ ... صاحب ... ہے کہ ... آپ کی دی ہوئی ... پنڈت میرلال حساب وید شاستری ... ادویات خاص طور پر تیار کرتے ہیں ... چند نمونے نہایت ہی ... دوستوں کو نہایت فائدہ پہنچایا ہے۔ ان میں رومی مصطگی کا تیل ... نہایت ہی ... پنڈت جی کی ادویات ... عام سے ... مستحق ہیں۔

۲۔ بابو ... صاحب ... راجہ صاحب ... پنڈت ... جو ... دوائی ... مصطگی کا تیل ... طبیعت کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اور دن بھر تازگی ... نہایت ہی ... [illegible]

... حساب وید شاستر کا استعمال کیا ہے ... اور دماغ ... یہ ... اس قابل ہے کہ پبلک ... استعمال میں لاوے۔

۳۔ شری ... سٹر ... ایل ایل بی ... پلیڈر ... آپ ... پنڈت میرلال وید شاستر کی ادویات ... ہر اس ... رومی مصطگی کے تیل کی ... سفارش کرتا ہوں ... پنڈت جی کی ... [illegible]

[illegible]

بولتی ہوئی تصویریں

ہم نے انتظام کیا ہے کہ اپنے سلسلۂ تصاویر کے لئے جو جنوری [illegible] سے شروع ہے صاف … تصویریں
سے بنوا کر شائع کریں چنانچہ اس مہینے کے پرچے میں جو تصویریں درج ہیں وہ انگلستان سے چھپ کر آئی
ہیں ہندوستان میں ابھی اس کام کی ابتدا ہے اور انگلستان میں درجۂ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ وہاں وہ تصویریں چھپتی ہیں ان میں
ایک ایسا قدرتی رنگ ہوتا ہے کہ گویا منہ سے بولتی ہیں۔ اگر کوئی صاحب اپنی کسی کتاب یا رسالے کے
لئے ایسی تصاویر کھنچوانا چاہیں تو ہم سے خط و کتابت کر کے نرخ دریافت کریں۔ ہمارا
ذمہ ہے کہ ہم انہیں کلکتہ بمبئی مدراس کے کارخانوں سے عمدہ کام تیار کرا دیں گے۔ اور لندن سے
بھی۔ ان کارخانوں سے تانبے کی پلیٹ کی تیاری چھپوائی اور کاغذ کی قیمت کی مفصل
نرخ منگا کر مقابلہ کر لیجئے اگر مقابلہ میں ہمارے نرخ سستے نظر آئیں تو ہماری معرفت کام ہونا چاہئے۔
معلومات حاصل کرنے کے لئے دفتر مخزن لاہور سے خط و کتابت کیجائے۔

جست کی پلیٹ کی نسبت تانبے کی پلیٹ پر تصاویر نہایت صاف اور خوبصورت چھپتی ہیں

زندہ مصنفین اردو

مخزن ایجنسی لاہور

… صاحب بی اے نے ہندوستان کے زندہ مصنفین اردو کی سوانح عمری انگریزی زبان میں …
… کے حالات نہایت تحقیق و تدقیق سے جمع کئے ہیں …
[illegible]

ہندوستان کے مختلف حصوں میں بڑے پبلک جلسوں کے موقعہ پر انہیں دیکھا ہے اور انکی زبردست تقریریں سُنی ہیں وُہ شہادت دینگے۔ کہ قدرت نے جس فیاضی سے اُن کو دل و دماغ کی خوبیوں سے بہرہ ور کیا ہے اور جس سخاوت سے اُن کے زبان و قلم میں تاثیر دی ہے۔ اُسی فیاضی سے اُنکے بنانے میں بھی کام لیا ہے۔ جہاں اُن کی بلند اور کشادہ پیشانی اُن کی پر زور قوت متخیلہ پر دال ہے۔ وہیں اُن کا کلّہ۔ اُن کا جبڑا۔ اُن کی ناک اور اُن کا گلا سب اس امر کے شاہد ہیں کہ انہیں تقریر کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ایک مجلس میں کثرت ہجوم سے کسی قدر شور وغل تھا۔ مولوی صاحب کی تقریر شروع تھی۔ مگر غل کے سبب دُور کھڑے ہُوئے لوگ پُوری طرح سُن نہیں سکتے تھے۔ کسی نے آواز دی "ذرا زور سے"۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ "اب اگر مجھے بھی ذرا زور سے بولنے کی فرمائشیں ہونے لگیں تو مجھ سے جہیر الصوت کوئی اَور ڈھونڈھ لاؤ"۔ اور یہ دعویٰ اُن کا بیجا نہ تھا۔ ہم نے ہندوستان بھر کے نامور مقرروں کو سُنا ہے مگر جو آواز شمس العلما نے پائی ہے کسی میں نہیں دیکھی۔ اور لوگ جب چلّا کر بولتے ہیں تو آواز بلند ہوتی ہے۔ مولوی صاحب یُوں تقریر کرتے ہیں۔ جیسے کسی سے باتیں کر رہے ہوں اور آواز میں ایک گُونج سی ہوتی ہے۔ جو بسا اوقات دلوں کو ہلا دیتی ہے۔ مجلس میں یُوں بھر کے بولتے ہیں جیسے شیر ڈکار رہا ہو۔ ہم تو انہیں "شیر بیشۂ فصاحت" کا خطاب دیتے ہیں۔ زبان میں روانی اور زور آپ کا خاصہ ہے۔ سلاست سے ذرا گریز ہے۔ مگر سب باتیں ایک ہی وجُود میں کیونکر جمع ہوجائیں۔ اِس پر بھی جتنی خُوبیاں اُس فردِ واحد میں ہیں۔ کم دیکھنے میں آتی ہیں اور زمانہ ہر وقت ایسے افراد پیدا کرنے پر قادر نہیں۔ خُدا کرے ان کا سایہ دیر تک اُردو کے سر پر قائم رہے۔ یہ اُن لوگوں میں ہیں۔ جن کو آنے والی نسلوں کی نظریں ڈھونڈھا کریں گی اور نہ پائینگی۔ نثر میں مرأت العروس۔ بنات النعش۔ توبۃ النصوح۔ ایامیٰ۔ محصنات۔ ابن الوقت۔ رویائے صادقہ سے کون سا معقول کُتب خانہ خالی ہوگا۔ اور میدانِ نظم میں آپ کی کبھی کبھار کی جولانیاں عموماً نگاہ پسندیدگی سے دیکھی گئی ہیں۔ آپ عموماً اخبارات اور رسالوں سے کم محبّت

رکھتے ہیں - کیونکہ زیادہ حصہ وقت کا صرف تصنیف و کتب بینی ہوتا ہے - مگر مخزن کو مدت تک آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی عزت حاصل ہوئی ہے اور قیمت بھی ملی ہے - آپ نے اس رسالے کا پہلا پرچہ دیکھتے ہی خود بخود مضمون عطا کرنے کا وعدہ بھی فرمایا تھا - مگر بوجہ کثرت کار آج تک ایفا کی نوبت نہ آئی - ایک دفعہ ہم نے یاد دلایا - تو اُن دنوں مزاج ناساز تھا - اظہار مجبوری فرمایا - اب بھی ہم مایوس نہیں - عجب نہیں پرانا عہد یاد آجائے -

مولانا نذیر احمد صاحب کے پاس نواب محسن الملک صاحب بہادر جلوہ افروز ہیں - سرسید مرحوم کے جانشین اور علیگڈھ کالج کے مشہور سکرٹری کا نام ایسا نہیں جسکے متعلق بیان کی ضرورت ہو - مگر یہاں ہمیں اُن کی بے نظیر خدمات قومی - یا اُنکے تاریخی کارناموں سے جو نذر کے متعلق ریاست حیدرآباد میں ظہور میں آئے - بحث نہیں ہے - بلکہ تہذیب الاخلاق کے اُس سب سے چیدہ مضمون نگار سے بحث ہے - جو اُردو لٹریچر کے اس پہلے نامور علمی رسالے میں "مہدی علی" کے نام سے ایسے آرٹیکل لکھتا تھا - جن میں سے بعض کا آج تک جواب نہیں ہو سکا - حالانکہ اس زمانے کے بعد اور انہی حضرات کی کوششوں سے بڑے بڑے مضمون نویس پیدا ہوئے - بڑے نامی اخبار اور رسالے نکلے اور چمکے - اور اُردو لٹریچر نے نمایاں ترقی کی - اور صرف تحریر پر کیا منحصر ہے - تقریر میں اس جادو بیان شخص کے منہ سے وہ پھول جھڑتے ہیں - کہ بیساختہ آفرین کی صدائیں بلند ہوتی ہیں - نہ معلوم کس مدرسے میں اور کس اُستاد سے یہ سبق پڑھا - مگر یہ امر واقعہ ہے کہ باوجود انگریزی نہ جاننے کے انگریزی فن فصاحت کے قواعد کے اس درجہ مطابق تقریر ہوتی ہے - کہ اگر کوئی چاہے تو اس کا لفظی ترجمہ انگریزی میں کر دیکھے - ایسا معلوم ہوگا کہ اصل انگریزی تقریر تھی - اور ترجمے کی کوئی شان اس میں نظر نہ آئیگی - اس خاص اعتبار سے ہم اُردو زبان کے مقرروں میں مولوی سید مہدی علی خاں صاحب کا ہم پلہ کوئی نہیں دیکھتے - اور اُردو میں تقریر کے اس رنگ کے موجد ہونے کا فخر سرسید مرحوم کے بعد انہی کو حاصل ہے - دونو کے طرز میں ایک حد تک مشابہت ہے - مگر سرسید

زیادہ سادگی کے دلدادہ تھے اور سادگی میں زور پیدا کر دیتے تھے - نواب محسن الملک کی تقریر نفیس استعارات اور دلفریب تشبیہات کے سبب سے رنگین ہوتی ہے - انجمن اُردو سے نواب صاحب کو خاص دلچسپی ہے اور اُردو زبان کی جو خدمات اُنہوں نے کی ہیں گو اُنکے تذکرے کے ورق پر - اُردو کی حمایت سے ایک دفعہ مستعفی ہونے کا داغ موجود ہے - تاہم وُہ اتنی لمبی - اتنی مستقل اور اتنی سرگرم خدمات ہیں کہ وُہ داغ اُن کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا - خصوصاً جب یہ ذہن میں رکھیں کہ وُہ ایک اضطراری فعل - مجبُوری کی حالت میں ایک اہم قومی غرض سے تھا - ہمیں یہ عزت حاصل ہے - کہ ہمارا نام نواب صاحب موصُوف کے نیازمندانِ خاص کی فہرست میں مندرج ہے - اور مخزن کو یہ دعویٰ ہے کہ وُہ اُن کے پاس پہنچتا ہے - اُن کی نظر سے گذرنے کا موقع اسے ملا ہے یا نہیں - یا کم ملا ہے یا اکثر - اِس کا ہمیں علم نہیں - کیونکہ اس بارے میں ہمیں نواب صاحب نے کبھی کچھ نہیں لکھا -

شمس العلما - مولانا شبلی نعمانی اس انجمن کے سکرٹری اور رُوح رواں ہیں - علمِ تاریخ پر آپ کا عبور جس درجے کا ہے اُس کا تو ایک زمانہ معترف ہے - ہمیں صرف اتنا کہنے کی ضرورت ہے - کہ اُردو تاریخی کتابوں کا ایک پُرلطف اور مفید سلسلہ انہی کی مساعی سے موجُود ہوگیا ہے - اور وُہ کتابیں باوجُود تاریخ کے متعلق ہونے کے ادب کے لحاظ سے بھی بلند پایہ ہیں اور جہاں ہزارہا لوگ انہیں ان کی تاریخی خوبیوں کے اعتبار سے قدر کی نگاہ سے دیکھینگے - وہیں ہزارہا ایسے بھی ہونگے جو انہیں عمدہ ادب میں سلاست اور صفائی بیان کا نمونہ سمجھینگے - البتہ جو بات یہاں خصُوصیت سے کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ انجمن اُردو کے لئے مولوی صاحب سے موزوں تر ناظم کا انتخاب مشکل تھا - مولوی صاحب تحقیق محاورہ کے شائق اور صفائی زبان کے دلدادہ ہیں - نقادِ سخن اعلیٰ درجے کے ہیں - نظم میں اُنکی تنقید اِس لئے بیش بہا ہے کہ اساتذہ ماضی وحال کا چیدہ کلام انہیں برزبان ہے - اور نثر میں اس لئے کہ خود نثر اُردو میں بے نظیر مہارت رکھتے ہیں - اِس کے علاوہ مغربی مذاق

سے آشنا ہیں اور جن تحریرات میں اُس مذاق کی چاشنی ہو۔ اُن سے بھی اُسی طرح محظوظ ہو سکتے ہیں۔ جیسے خالص مشرقی مذاق کی تصنیفات سے۔ اُن کے اس مغربی مذاق میں اُن کی اپنی تلاش۔ انگریزی دان احباب کی صحبت اور سفرِ رُوم کے نتائج کے علاوہ اُن کے دیرینہ دوست مسٹر آرنلڈ صاحب بہادر کا بھی حصّہ ہے۔ اور بہت سے معلومات انگریزی کتابوں اور مُصنّفوں اور فرانسیسی عُلما کے متعلق ہیں۔ جن میں آرنلڈ صاحب کی برسوں کی رفاقت کا اثر جلوہ گر ہے۔ جو شخص ان اسباب سے واقف نہ ہو۔ وُہ مولوی صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہو کر اُن کی گفتگو سے مستفید ہو تو متعجب ہوتا ہے کہ انگریزی دان نہ ہونے کے باوجُود اُن کو یہ معلومات کیونکر بہم پہنچیں۔ خاصکر جب وُہ ایسی کُتب فلسفہ اور سائینس کے نام لیتے ہیں۔ جو اکثر انگریزی دانوں کو بھی معلوم نہیں۔ اِسی لئے ہمارا یہ خیال ہے کہ انجمن اُردو کے لئے ایسے ہی جامع مذاق کے عالِم کی ضرورت تھی۔ انہیں علوم کے جواہر سے کام ہے خواہ وُہ ہندی کان سے نکلیں۔ خواہ ایرانی سے۔ عرب کان کن انہیں نکالیں۔ یا فرنگی۔ مُسلمانوں کے ہاں سے ہاتھ لگیں۔ یا ہندؤوں کے ہاں سے۔ سنسکرت کی کتابوں میں ملیں۔ یا فارسی کی۔ زبان کے بڑھانے سے غرض ہے۔ خواہ انگریزی سے الفاظ مُستعار لئے جاویں۔ یا سنسکرت سے۔ عربی کے ذخیروں کو لوٹا جاوے یا فارسی کے۔ اور اگر اُن کی اور اُن کی جماعت کی سرگرمی اس رفتار سے جاری رہی تو بہت عرصہ نہیں گذریگا۔ کہ زبانِ اُردو اپنا رُتبہ اب سے کئی گُنا بڑھا ہوا دیکھیگی۔ اور دُوسری زبانوں کے علما اسے عزّت کی نگاہ سے دیکھنے لگیں گے۔ مولانا سے مخزن کو جو خصوصیت حاصل ہے۔ وُہ دیگر بزرگان میں سے کسی سے نہیں۔ گو ہر ایک سے کم و بیش علاقہ ہے۔ ابتدائے کار سے اب تک مولوی صاحب سے ہمیں کئی مفید مشورے ملے ہیں۔ عُمدہ تنقیدیں ذاتی طور پر ہمیں اُنہوں نے بھیجی ہیں۔ داد دی ہے۔ ہمّت بڑھائی ہے۔ خریدار دیئے ہیں۔ اور آخرش مضمون عطا فرمانے کا دیرینہ وعدہ بھی پُورا کر دیا ہے۔

اس معزز گروپ کی تفصیل جناب نوّاب وقار الملک مولوی مشتاق حسین صاحب بہادر کے نام پر ختم ہوتی ہے۔ مولوی صاحب سے بھی ہمیں یہاں نہ تو اُن کی اُس حیثیت سے بحث ہے جو حیدرآباد میں انہیں حاصل تھی۔ جب وُہ ایک زبردست وزارت کے نفسِ ناطقہ تھے اور جہاں اُنہوں نے ایک نہایت اہم۔ نہایت نازک ذمّہ واری کو اعلیٰ درجے کی دیانت اور حسنِ تدبیر سے نبھایا۔ جس کی حکایات آج تک اہل حیدرآباد کی زبانوں پر ہیں۔ اور نہ اُن کی موجودہ پولیٹکل اور سوشل سرگرمیوں کا تذکرہ یہاں مقصود ہے۔ جن کے ذریعے سے وُہ ابنائے وطن کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔ بلکہ یہاں بھی مثل نوّاب محسن الملک کے تہذیب الاخلاق کے ایڈیٹر کے قوّتِ بازو سے ہی واسطہ ہے۔ جو تحریریں آپ کے قلم سے نکلی ہیں۔ اور جو تقریریں آپ نے کیں۔ اور آج تک کرتے ہیں۔ اُن میں ایک خصوصیّت ہے۔ اور وُہ یہ کہ سلسلۂ دلیل نہیں ٹوٹنے پاتا اور اُن کے منطق پر حرف گیری مشکل ہے۔ اور اس کے ساتھ بیان میں سلاست اور محاورۂ زبان کی طرف توجّہ خاص رہتی ہے۔ اِسی خصوصیّت کی وجہ سے وُہ اپنے ہمعصروں میں ممتاز ہیں اور یہی۔ انجمن اُردو کے اغراض سے دلی ہمدردی کے ساتھ ملکر محسنینِ اُردو کے حلقے میں انہیں جگہ دلاتی ہے۔ مخزن کو بھی فہرست خریداران میں آپ کی شرکت سے فخر حاصل ہے۔

ہم اُمید کرتے ہیں۔ کہ یہ گروپ نہایت وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جائیگا۔ اور اِتنے بزرگوں کی یکجا زیارت ناظرینِ مخزن کے لئے باعثِ مسرت ہوگی +

ایڈیٹر

وکرم اُروسی

ذیل کا مضمون ملک الشعرا کالیداس کے مشہور ناٹک وکرم ورلسی کے ایک سین سے ماخوذ ہے اس ڈرامے کا ترجمہ جو اس وقت زیر طبع ہے - ہمارے مکرم مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی اے نے کیا ہے - قصہ سمجھنے کے لئے یہ بتا دینا کافی ہے کہ پروراوس ایک اولوالعزم راجہ ہے - جو ایک آسمانی پری اُروسی پر عاشق ہے اور وہ عالم تنہائی میں اپنے محرم راز سے باتیں کرکے غم غلط کر رہا ہے

(دونوں باغ میں داخل ہوتے ہیں)

پروراوس - دوست کیا کہوں میرا یہ خیال صحیح نہ تھا کہ خانہ باغ میں آکر غم غلط ہوگا - میں درد دل کی تسکین کی خاطر باغ میں دوڑتا ہوا آیا - مگر میری تو یہی کیفیت ہے کہ ندی کے چڑھاؤ پر جانا چاہتا ہوں مگر بہاؤ نیچے کی طرف گھسیٹے لئے جاتا ہے -

ودوشک - یہ کیونکر؟

پروراوس - پہلی بات تو یہ ہے کہ عشق نے میرے دل کو زخمی کیا ہے اور اُس کمبخت کا یہ حال ہے کہ وہ ایسی آرزوں سے لو لگائے ہوئے ہے جن کے بر آنے کی کوئی صورت نہیں دوسرے جب نسیم جنوبی کو آم کے خزاں رسیدہ پتوں کو گراتے ہوئے دیکھ کر میرا یہ حال ہوگیا ہے تو معلوم نہیں اُس کی نوخیز کونپل کے نظارے سے کیا عالم ہوگا -

ودوشک - بس اس گریہ وزاری کو موقوف فرمایئے - تھوڑے ہی روز میں خود مدن آپکی خواہش کو پورا کرکے آپ کی تسکین خاطر کا باعث ہوگا -

پروراوس - میں برہمن کے الفاظ سے فال نیک لیتا ہوں -

(دونوں ٹہلتے ہیں)

ودوشک - ذرا حضور اس باغ کی دلکشی بھی ملاحظہ فرمائیں گویا بسنت کا خیر مقدم کر رہا ہے -

پروراوس - میں قدم قدم پر دیکھ رہا ہوں کیونکہ یہ کروٹی[1] کے پھول کسی البیلی کے ناخنوں کیطرح

[1] اس پھول کا سنسکرت نام کوربک ہے اور مرہٹی میں اسکو کروٹی کہتے ہیں اُردو نام معلوم نہ ہو سکا -

سُرخی میں سپیدی کی جھلک دکھا رہے ہیں اور یہ اشوک کی سُرخ کلیاں جنکے کناروں پر سیاہ دھاریاں ہیں اور پنکھڑیوں کے جماؤ سے اَور بھی شوخ رنگ ہو رہی ہیں۔ کھلنے کو لئے پھٹی پڑتی ہیں اور آم کے درخت نوخیز بَور سے لدے ہوئے ہیں جو ابھی پوری طرح دقیق گل سے مزیّن نہ ہونے کی وجہ سے بھورا سا معلوم ہوتا ہے گویا کہ بسنت اُٹھتی جوانی یعنے بچپن اور شباب کے درمیانی زمانہ کی بہار دکھا رہا ہے۔

ودوشک ۔ یہ یاسمن کی بیل کا منڈپ جس میں سنگ مُوسیٰ کا ایک تخت پڑا ہوا ہے حضور کی نظرِ عنایت کا منتظر ہے کیونکہ بھوروں کے ٹکرانے سے جو پھول گر رہے ہیں وُہ گویا حضور کے خیر مقدم کے لئے جمع کئے گئے ہیں۔ بس حضور ذرا کرم فرمائیں۔

(دُونوں دونوں بیٹھتے ہیں)

ودوشک ۔ یہاں آرام سے بیٹھ کر خوشنما بیلوں کا نظارہ کیجئے اور اُروسی کے فراق کا غم بُھلائیے۔

پروراوس ۔ (آہ سرد بھر کر) دوست کیا کہوں اُس کے حُسن دلاویز کے نظارے سے میری آنکھیں کچھ اس قدر نازک مزاج ہو گئی ہیں کہ وُہ باغ کی جھُکی ہُوئی بیلوں کی طرف گو کہ وُہ پھلی پھُولی بھی ہُوں نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتیں۔ بس اب میری آرزوؤں کے پورا ہونے کے لئے کچھ اور تدبیر سوچو۔

ودوشک ۔ جناب عالی اہلیہ کے عاشق اِندر[1] کا مددگار چاند اور اُروسی کے عاشق یعنی آپ کا مددگار میں دونوں عقل سے خالی ہیں۔

---

[1] رامائن کے بموجب اہلیہ پہلی عورت ہی جسکو برہما نے پیدا کیا اور پیدا کرنے کے بعد اسکو گوتم کو دیا۔ اِندر اسکو دیکھکر فریفتہ ہو گیا اور اس کے شوہر کی غیر حاضری میں اسکی شکل میں نمودار ہو کر اسکی عصمت پر حملہ کیا۔ گوتم نے جب ڈلیہ آکر اندر کو اس بھیس میں بھاگتے ہوئے دیکھا تو اسکو سخت بددعا دی اور اسکے حیوانی قوائے کو بیکار کر دیا۔ یہ تو پُران کا قصہ ہی لیکن از روئے وید معلوم ہوتا ہی کہ اہلیہ سے مراد رات ہی اور اندر سے مراد آفتاب اور گو آفتاب ہمیشہ رات کی تلاش میں پھرتا رہتا ہی مگر وُہ اس کے ہاتھ نہیں لگتی۔ پس اگر چاند آفتاب کی مدد کرنا چاہے تو یہ اس کا جنون ہے۔

پروراوس - یہ تو نہ کہو - خلوص وُہ شے ہے کہ کوئی نہ کوئی تدبیر نکال ہی لیتا ہے -

ودوشک - اچھا - مَیں غور کرتا ہُوں - لیکن مہربانی کرکے آپ اپنی آہ و زاری سے میری سوچنے میں مخل نہ ہو جئے -

(سوچنے کی صُورت بناتا ہے)

پروراوس - (یہ ظاہر کرکے کہ اُس نے گویا کوئی اچھا شگون[۱۵] دیکھا) اس چودھویں رات کے چاند سے چہرے والی سندری کا وصال کچھ آسان نہیں ہے - لیکن پھر بھی جذباتِ عشق کا تقاضا جو کچھ سمجھ میں نہیں آتا چلا ہی جاتا ہے اور کیا کہوں میرے دِل کو بھی اب تو کچھ تسکین سی محسوس ہو رہی ہے - گویا کہ میری آرزوئیں عنقریب برآنیوالی ہیں +

محمد عزیز مرزا

انسان

انسان :- تُم زمین کے کیڑے نہیں ہو - ہاں جب خود ایسے بنجاؤ تو اسکا کیا علاج - تم ایک ربّانی - زبردست - غیرفانی اور اشرف المخلوقات ہستی ہو - اسکا جان لینا خود تمہارے ہی ہاتھ میں ہے - ذرا اپنے کو پہچانو تو سہی - بالکل ادنیٰ اور ناپاک خیالات میں نہ پھنسے رہو - پھر تم کو معلوم ہو جائیگا کہ تمہارے امکان میں ایک ایسی منور - اُنس پذیر اور پاک رُوح ہے - جو تمام ترقیوں کا سرچشمہ ہے - مصیبتیں - پریشانیاں اور ناکامیابیاں تمہارے لئے بنائیں نہیں گئیں - یہ تو تم خود اپنی غلط فہمیوں سے پیدا کر لیتے ہو - تم تو مالک اور بالکل آزاد بنائے گئے ہو - اگر تم غم کو اپنا رفیق اور مونس بنالوگے تو وُہی ساتھ ساتھ رہیگا - تم اپنی حالت کے خود ذمہ دار ہو جس طرح سے کوئی محنت کریگا تو اسکا لازمی نتیجہ خواہ بار آور ہو یا بیکار - یہ اسباب اور تدابیر پر منحصر ہے - مگر کچھ ہوگا ضرور - یہی حالت غم اور خوشی کی ہے - بہرحال تم ایک ایسے راز کے مجموعہ ہو جو حقیقت میں از سرتاپا پوشیدہ اور بالکل نامعلوم ہے - جسقدر خیال کروگے نئے نئے رستے اور نئی نئی باتیں پیدا ہونگی نہیں معلوم کیا کچھ تمہارے امکان میں ہے - ذرا غور کرو اور عمل کرو - بس ایک پھُول کی طرح باغِ عالم میں خوب پھلو پھولو - اور اس عالم کے سارے واقعات سے نتیجے نکالو اور خداوند تعالےٰ کے بہترین اکرام اور عنایات کے امین ہونے کا ثبوت دو +

(ترجمہ) 	(شاہ محمد نذیر ہاشمی غازی پوری)

---

[۱۵] سیدھی آنکھ یا سیدھے بازو کا پھڑکنا اچھا شگون سمجھا جاتا ہے +

کتاب

عقل اور علم کی ہر ایک متنفس خواہش کرتا ہے - اور دل سے چاہتا ہے کہ یہ دونوں نور کے چراغ اُس کے خانۂ دل کو روشن کریں - تاکہ وُہ اپنے ہم جنسوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے - یہ خواہش قدرتی طور پر ہر ایک کے دِل میں موجُود ہوتی ہے اور اس گنج بے بہا کے حاصل کرنیکے سامنے دولت کے جمع کرنے یا کسی اَور قسم کی شہرت حاصل کرنے کو بالکل ہیچ سمجھا جاتا ہے - جواہرات اِس کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتے - چاندی کو مٹی سے بھی ذلیل خیال کیا جاتا ہے - خالص سونے کی - ریت کے ذرّوں سے بھی کم وقعت ہوتی ہے - سُورج اور چاند کی روشنی ان کھرلیے آبدار کی تاب نہیں لاسکتی اور شہد اور من وسلوا اس کے مزے کے سامنے اندرائن اور ایلوے کا مزہ دیتے ہیں - اس کے حاصل کرنے میں ایک نفع یہ بھی ہوتا ہے کہ دانائی کی قیمت مرورِ زمانہ کسی صُورت کم نہیں کرسکتا - بلکہ یہ ایسی سدا بہار رنگی ہے کہ جس سے ہر قسم کی زہریلی چیزیں کوسوں دُور رہتی ہیں - اَے فیاض اور رحیم خدا کی عطا کردہ نعمت! تیرا منبع روشنی ہے جو قدیم ہے اور تُو اس لئے بھیجی گئی ہے کہ ہمارے دلوں کو نُورانی کرے اور آسمان کی راہیں دکھائے - تو ایسی غذا ہے کہ جس نے تجھے ایک مرتبہ چکھ لیا وُہ ہمیشہ کے لئے تیرا گرویدہ ہوگیا - تُو ایسا شیریں اور خوش ذائقہ پانی ہے کہ جس نے پیا وُہ عمر بھر تیرا ثنا خواں رہا - غم زدے کی رُوح کے لئے تو نے فرحت کا سامان مہیّا کر دیا - اور اس کے غم و اندوہ کی بالکل بیخ کنی کر دی - سُننے والے کے دل پر تو کبھی گراں نہیں گزرتی - تو اخلاقِ حسنہ کے ضوابط سکھلاتی ہے کہ جن پر عمل کرنیوالا کبھی سیدھی راہ سے نہیں چوکتا - تیری ہی مدد سے بادشاہ حکومت کرتے ہیں - قانون بنانے والے عدل و انصاف کو کام میں لاتے ہیں - تیرے ہی ذریعے سے آدمی کا قدرتی گنوارپن دُور ہو جاتا ہے - خوش مذاقی زبان کی ترقی اور پاکیزگی پیدا ہو جاتی ہے - تو بدی کے خارزار درخت

راستے میں سے ہٹا کر ہمیں شہرت کے اعلےٰ رُتبے پر پہنچا دیتی ہے۔ تیری رہنمائی سے وُہ لوگ جو تیری عدم موجودگی میں بھیڑیں چراتے۔ یا ہل جوتتے تھے۔ بادشاہوں کے مصاحب اور اپنے ابنائے وطن کے سردار بن گئے ہیں۔

اے زبردست اور ہر دلعزیز خزانے تو کہاں پوشیدہ ہے۔ اور تیرے گرویدہ تجھے کس جگہ ڈھونڈیں یقین ہے کہ تو کتاب کے اوراق میں مدفون ہے اور اسی جگہ خالقِ قدرت نے تجھے جگہ دی ہے۔ اِن ورقوں میں جو تیرے طالب ہیں تجھے پا سکتے ہیں۔ جو تیرا دروازہ کھٹکھٹاتے اُس کے لئے وُہ کُھل جاتا ہے۔ جو تجھ سے سوال کرے وُہ ہمیشہ منہہ مانگی مراد پاتا ہے کتابوں کے ورقوں پر فرشتے اپنے بازو پھیلائے سایہ کئے رہتے ہیں۔ تاکہ طالب علموں کی رُوحیں خوش رہیں اور اُن پر سوار ہو کر قطب شمالی سے لیکر قطب جنوبی تک کی سیر کریں۔ طلوع و غروب آفتاب کا دِل خوش کن نظر دیکھیں۔ کتابوں میں ہی خُدا کی لایزالی کے متعلق خبر ملتی ہے۔ اور انہیں کی ہدایتوں پر کاربند ہو کر اس کی پرستش کیجاتی ہے۔ آسمان کی ماہیت دوزخ بہشت کی کیفیت کا پتہ انہیں کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

کتابیں ہی ایسا معجزہ ہیں کہ مُردوں کو زندہ کر کے ہمارے سامنے لا کھڑا کرتی ہیں۔ ماضی و مستقبل کے حالات کا پتہ دیتی ہیں۔ جنگ کے اصُول سکھاتی اور امن کے طریقے بتاتی ہیں۔ زمانہ اپنا منہدم کر دینے والا اثر ہر چیز پر ڈالے بغیر نہیں رہتا۔ صرف کتابیں ہی اس کی زد سے محفوظ ہیں۔ اور اپنے ساتھیوں کی تباہی پر اظہارِ تاسف اور ان کی ترقی پر خوشی ظاہر کرتی ہیں۔ سکندر اعظم اور نپولین جیسے نامور شخصوں کو آج کوئی بھی نہ جانتا اگر کتابیں اُن کے کارناموں کو اپنے صفحوں پر نہ رہنے دیتیں۔ شہر کے شہر تباہ ہو گئے ہیں۔ بڑے سے بڑے سربفلک مینار مٹی میں مل گئے ہیں۔ مگر اُن میں سے صرف انہیں کا پتہ چلتا ہے۔ جن کے حالات کو کتابوں نے اپنے اوراق میں جگہ دی ہے۔ اور اسی طرح ان کی شہرت ہمیشہ کے لئے قائم کر دی ہے۔ جس کسی کی کچھ بھی یادگار قائم ہے وُہ کتابوں ہی کی طفیل ہے۔ کتاب اپنے بنانے والے کو اس درجہ پہنچا کر

"

کہ جب تک زندہ رہتی ہے اس کا دم بھرتی ہے اور اگر زندہ نہ بھی رہے تو بھی اپنے مونس کے لئے بقائے دوام حاصل کر دیتی ہے - سچائی نے (جو دُنیا کی ہر ایک چیز سے اعلیٰ ہے جسکا دوست ہمیشہ سُرخ رُو اور اپنے ہمجنسوں کی نظروں میں وقعت رکھتا ہے اور جو سیدھے رستے سے بال برابر بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتی) بھی اپنا ٹھکانا کتابوں میں ہی بنایا ہے - وُہ سچائی جو ہمارے دِل میں ہے پوشیدہ ہے - ایک مدفون خزانہ کی مانند ہے - مگر وُہ سچائی جو کتابوں کے اوراق کو روشنی بخشتی ہے - اِس سے ہر ایک فائدہ حاصل کر سکتا ہے - وُہ ایک صاف شفاف پانی کی نہر کی طرح ہے جسے جسکا جی چاہے استعمال کرے -

آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کس قدر بے تعداد چیزوں کا ذخیرہ کتابوں میں موجود ہے - کتابیں کیسی صفائی سے انسانی جہالت بغیر ہمیں شرمندہ کرنے کے ہم پر ظاہر کرتی ہیں - کتابیں ہی ایسی معلم ہیں جو بغیر ڈنڈے سونٹے اور سخت الفاظ کی مدد کے ہمیں تعلیم دے سکتی ہیں - وُہ ہر وقت ہماری امداد کے لئے حاضر ہیں - بار بار ایک ہی بات سمجھانے سے انہیں غصّہ نہیں آتا - کوئی بات جو انہیں آتی ہو وُہ چھپا کے نہیں رکھتیں - بلکہ نہایت ہی فراخ حوصلگی سے ہمیں اس میں سے حصّہ دیتی ہیں - اگر ہم ان کے معنے غلط سمجھیں تو وُہ ہم سے ناراض نہیں ہوتیں - اور اگر ہم جاہل ہیں تو وُہ ہماری ہنسی نہیں اُڑا سکتیں +

محمد عبد الرحمٰن آمیر

خوش مزاج بننے کا نسخہ :- اگر ہماری قدرتی زندہ دلی مفقود ہو جائے تو زبردستی زندہ دل بننے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں - کہ ہم خوش خوش نظر آئیں بیٹھیں تو نہایت خوش مزاج بنکر - ادھر اُدھر دیکھیں تو مسرت بھری آنکھوں سے - غرض جو کچھ کہیں یا کریں اس سے ایسا ظاہر ہو کہ گویا ہم سے بڑھکر کوئی دُنیا میں خوش ہی نہیں - مگر ایسا کرنے سے بھی دل کی کلی نہ کھلے تو بس سمجھو کہ اب اسکا کوئی علاج ہی نہیں - اسی طرح بہادر بننے کے لئے چاہیئے کہ بہادروں کے سے کام کریں یعنی اپنی توجہ کی تمام طاقت کو اس مدعا کے حصول کے لئے جمع کریں ممکن نہیں کہ ایسا کرنے سے موقع خوف کو بہادری نہ بدل دے -

(مسٹر ولیم جیمس) (سعید)

چند دن ترکوں میں

ہمارے ہموطن اور معزز دوست مرزا جلال الدین صاحب ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کو کئی موقعے قسطنطنیہ جانے اور ترکوں کی سوسائٹی میں رہنے کے ملے ہیں۔ چنانچہ وہ ان دنوں پھر قسطنطنیہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ انہوں نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ وہاں کے سوشل حالات کے متعلق اپنے خیالات سے ہمیں مستفید فرمائینگے۔ اور اس سلسلہ کا تمہیدی مضمون ارسال فرماتے ہیں جو ہندوستان میں دلچسپی سے پڑھا جائیگا۔ اور مسلمانوں کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہوگا۔

میرا کئی دن سے ارادہ تھا کہ میں آپ کو کچھ حالات ترکوں کے طرزِ معاشرت و طریقِ تمدن کے لکھتا کیونکہ ہندوستان میں کچھ عرصے سے ایسی معلومات حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔ بعض اصحاب نے پہلے بھی اس بارے میں بہت کچھ تحریر فرمایا ہے۔ میں اپنے خطوط میں اس پر کچھ اضافہ کرنے کی کوشش کرونگا۔ میرا یہ دعویٰ نہیں کہ میں نے ہندوستان کے اُن سب مصنفین کو جنہوں نے ترکوں کے متعلق کچھ لکھا ہے پڑھا ہے۔ ممکن ہے کہ کئی کتابوں میں تفصیل سے کام لیا گیا ہو۔ مگر ایک دو کتابوں سے جنکا مجھے علم حاصل ہوا ہے۔ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بارے میں اب تک اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے نہایت شوق سے جناب مولانا شبلی نعمانی کا سفرنامۂ روم و شام دیکھا۔ مگر جس قدر مجھے اُمید تھی اُس قدر اطلاع ضروری حالات کے متعلق اس میں موجود نہیں۔ گو وہ ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے۔ ترکوں اور ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا مقابلہ بھی اسمیں بہتر ہے اگر سیاحت سے اپنے ملک کے مفید مطلب کچھ نتائج نکالنے ہوں تو بہترین بات یہ ہے کہ غیر ممالک کو اس نظر سے دیکھا جائے کہ ہم ان سے کیا لے سکتے ہیں۔ جناب مولوی صاحب قوم پر بڑا احسان کرتے اگر وہ اس پہلو کو نظر انداز نہ فرماتے۔ اور جو چیز اُن کی رائے میں ترکوں کے طریقِ معاشرت میں اچھی معلوم ہوتی اسکی

طرف اپنے اہلِ ملک کو توجہ دلاتے اور اپنے زورِ کلام اور وجاہت سے اُس کو اپنی قوم میں رائج کرنے کی کوشش کرتے - جناب منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر پیسہ اخبار نے بھی اپنے سفرِ شام کے بعد کچھ ترکوں کے متعلق تحریر فرمایا ہے - مگر انہوں نے بھی نہایت اجمال سے کام لیا ہے - مَیں نے اِن دو اصحاب کا ذکر بالخصوص اس لئے کیا ہے کہ یہ ان نامور ہندوستانیوں میں ہیں جنہیں ممالک محروسہ عثمانیہ کا سفر نصیب ہوا ہے - اِس میں شک نہیں کہ ہمارے ہاں ابھی ممالک کو اس نظر سے دیکھنے کا شوق عام نہیں ہوا ہے - ہندوستانیوں سے جس قدر لوگ یورپ کا سفر کرتے ہیں وُہ بالعموم اپنا وقت انگلستان میں خرچ کرنے کے بعد ہندوستان کو واپس چلے جاتے ہیں - اور اگر بعض اصحاب یورپ کے باقی حصّوں کی بھی سیاحت کرتے ہیں - تو محض سرسری اور تفریحی طور پر - مگر انگلستان یا باقی بلاد یورپ کے دیکھنے سے جس تہذیب اور طریق معاشرت کا نقشہ ایک سیاح کے دِل پر قائم ہوتا ہے اسکی ترویج ہندوستان میں کرنے کے لئے سینکڑوں برس درکار ہیں - انگلستان - فرانس جیسے ممالک طرزِ معاشرت اور طریقِ تمدن کے جس درجے پر آجکل پہنچے ہوئے دکھلائی دیتے ہیں - وہاں تک پہنچنے میں انہیں سینکڑوں برس لگے ہیں - اور صرف یہ امتدادِ زمانہ ہی نہیں بلکہ ہزاروں خانہ جنگیوں اور خون ریزیوں کے بعد انکو یہ درجہ حاصل ہوا ہے - اب اگر ایک قوم جو ابھی صحیح طور پر اپنی ترقی کے لئے بیدار بھی نہیں ہوئی - یک بیک آنکھ کھولتے ہی انگلستان و فرانس وغیرہ ممالک کے طریقِ معاشرت و تمدن کو اپنے آپ میں موجود دیکھنے کی خواہش کرے تو یہ تمنا اور آرزو نہ صرف غیر طبعی بلکہ قبل از وقت ہونے کی وجہ سے اکثر مُضر نتائج پیدا کرنے کا احتمال رکھتی ہے - چنانچہ اِس غیر طبعی خیال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ہندوستان میں دو فریق دیکھتے ہیں - ایک فریق وُہ ہے جو یورپ کے طرزِ معاشرت و تمدن کا دلدادہ ہے اور چونکہ اس فریق کے اکثر مقلد یورپ کی حسنات سے خود متمتع ہوئے نہیں وُہ چاہتے ہیں کہ انکی قوم بھی اہل یورپ کی تہذیب کے زیور سے آراستہ ہو - دُوسرے فریق کے اراکین اس کے خلاف ہیں اور اس جدید طرزِ معاشرت کو

اپنے ملک کے حالات کے مناسب خیال نہیں کرتے - اِس اختلافِ رائے کا اثر جو اِس وقت ہماری قوم پر ہو رہا ہے وُہ محتاجِ شرح نہیں - مَیں اس جگہ اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ کس فریق کا خیال ٹھیک ہو - مختصرًا اس قدر عرض کرتا ہُوں کہ میرے نزدیک پہلے فریق کی یہ غلطی ہے - کہ وہ ان باتوں کو اپنے ملک میں دفعتًا رواج دینا چاہتا ہے - جس منزل کو خود یُورپ نے صدیوں کے بعد حاصل کیا ہے اور جس کے لئے بلا شبہ ہمارا مُلک ابھی تیار نہیں - اور دوسرا فریق ایک بے سُود ضد پر قائم ہو کر دُنیاوی ترقّی کی اُس لہر کو روکنے کی کوشش کرتا ہے جس نے انسانی زندگی کے باغات کو تر و تازہ کر دیا ہے - اس اختلافِ رائے کا ایک نمونہ موجُودہ پردہ کی بحث سے نمایاں ہے - ایک فریق ہے کہ بالکل پردۂ مستورات کے خلاف ہے اور وُہ اپنی قوم کی مستورات کو انگلستان اور امریکہ کی خواتین کے برابر آزاد دیکھنا چاہتا ہے - (مَیں نے انگلستان کے ساتھ بجائے فرانس کے امریکہ کی مستورات کو شامل کیا ہے - کیونکہ فرانس میں مستورات کو ابھی وُہ آزادی نہیں ہے جو انگلستان اور امریکہ کی مستورات کو حاصل ہے - اِس کی تشریح مَیں آگے کرُونگا) اِس فریق میں اکثر وُہ اصحاب شامل ہیں جو یُورپ کی سیاحت کر گئے ہیں - دُوسرا فریق اپنے رسمی پردہ میں سرِ مُو فرق دیکھنا پسند نہیں کرتا بلکہ اگر ممکن ہو تو شدائد پردہ کو اَور زیادہ کرنا چاہتا ہے - نتیجہ اس اختلاف کا یہ ہے کہ جس اصلاح کی فی الواقع پردۂ مستورات میں ضرورت ہے اور جو عملی طور پر آسانی کے ساتھ مُلک میں رائج ہو سکتی ہے - اس پر کسی کو توجہ نہیں -

یہ امر مسلّم ہے کہ یہ دُنیا دار الاسباب ہے - ہر امر کے حاصل کرنے کے لئے جو اسباب و ذرائع قدرت نے مقرر کئے ہیں انہی کے ذریعے سے اُس امر کا حاصل کرنا صحیح طریقہ حصُولِ مقصد کا ہے - تاریخِ دنیا کے مطالعہ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ ہر قوم کی ترقّی تدریجًا ہُوئی ہے - اور کوئی قوم آنًا فانًا اَوجِ ترقّی پر نہیں پہنچی - ہندوستان کے مُسلمان بھی اِس سلسلۂ قانون کے تابع ہیں - اِس لئے ان کو اپنے زینۂ ترقّی پر نظر رکھنی چاہئے کہ جس کے ذریعے سے وہ قدم بقدم اَوجِ ترقّی پر

پہنچ سکتے ہیں۔ اور اس طرح کی ترقی شاید اصل اور پائدار ترقی متصوّر ہو سکتی ہے۔ ہندوستان کے مُسلمان اپنی ترقی کے زینے کو ان قوموں کے حالات کے مطالعہ سے اچھی طرح زیرِ نظر رکھ سکتے ہیں جو ابھی دنوں میں نئی طرز کے موافق دُنیاوی ترقّی کے زینے پر چڑھنے لگی ہیں۔ اور اُن کے نقشِ پا اس راستہ پر اچھی طرح دکھلائی دیتے ہیں۔ جس پر خود مُسلمانانِ ہند چلنے کے آرزومند ہیں۔ جو قومیں سینکڑوں بلکہ ہزاروں میل کی مسافت طے کر چکی ہیں اُن کے نقشِ پا کا کھوج نکالنا اگر ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ اور اس لئے وہاں راستہ گُم کرنے کا اکثر احتمال ہے۔ موجُودہ زمانے میں ہندوستان کے لوگوں کے لئے دو قومیں مشرقی الاصل ایسی موجُود ہیں۔ جن کے حالات کے مطالعہ سے انہیں بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے میری مُراد جاپانیوں اور تُرکوں سے ہے۔ جاپان نے تھوڑے عرصہ میں جو ترقّی کی ہے وُہ حیرت انگیز ہے۔ گو جاپان یورپ کا شاگرد ہے گر جہاں ہمیں استاد کے ادق مسائل کے سمجھنے میں دشواری یا غلط فہمی کا احتمال ہو تو ہم کیوں شاگرد کی صاف بیانی سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش نہ کریں کیونکہ یہاں طبعی موافقت ہر ایک امر کو جلد سمجھنے کے لئے بہت کچھ معاونت کریگی۔ جاپان سے بہت سی باتیں لینے کے قابل ہیں اور اس ملک کے حالات کو نہائت نظرِ غور کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ جن اصحاب کو سفرِ جاپان کا موقعہ حاصل ہوا ہے اُمّید ہے کہ وُہ ضرور اپنی قوم کو اپنے معلومات سے استفادے کا موقعہ بخشینگے۔ دُوسری قوم جسکے حالات کے مطالعہ کی ضرورت ہے ترک ہے۔ اگرچہ تُرکوں کی ترقی جاپانیوں کی ترقّی کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ مگر پھر بھی مُسلمانانِ ہند کے لئے ترکوں کی ترقی میں بہت سی چیزیں ایسی موجُود ہیں جو قابلِ تقلید ہیں۔

پیشتر اس کے کہ مَیں نفسِ مضمون پر آؤں ایک ایسے اہم امر کی طرف توجّہ کرنی ضروری معلوم ہوتی ہے جس کی توضیح پر اس تحریک کے صحیح یا غلط ہونے کا انحصار ہے۔ میری مُراد اس سے وُہ اختلافِ رائے ہے جو تُرکوں کی ترقی یا تنزّل کے متعلق اسوقت یورپ

اور خصوصاً ہندوستان میں پایا جاتا ہے۔ اِس لئے تُرکوں کے حالات لکھنے سے پہلے اس امر کا بیان کرنا کہ آیا تُرک فی الواقعہ ترقی کر رہے ہیں یا تنزل ضروری معلوم ہوتا ہے کیونکہ اگر حقیقتاً تُرک تنزل کر رہے ہیں تو اُن کی مثال سے ہندوستان کے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

اِس اختلافِ رائے کا منبع بہت سی ایسی تصانیف ہیں جن میں اس ملک کے حالات یکطرف خیالات کی بنا پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں بعض مصنّف تو ایسے ہیں جنہوں نے تُرکوں کی ترقی موجودہ حکومتِ رُوم کی ترقیوں اور اصلاحوں کے بیان سے استنباط کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی تُرکوں کی ترقی من حیث القوم ان کی سلطنت کے انتظام اور اقتدار سے ثابت کی ہے۔ ایسے مصنّفین کی تعداد اگرچہ اس قدر قلیل ہے کہ اُن کا ذکر کرنا شاید اکثر لوگوں کو تعجب میں ڈالے۔ مگر جن لوگوں نے تُرکوں کے حالات کا مطالعہ کیا ہے اُن پر مخفی نہیں کہ چند ایسے صاحبان بھی موجود ہیں جنہوں نے تُرکی حکومت کی تعریف میں اپنی قوتِ بیانی کو خرچ کیا ہے اور اس طریقۂ استدلال سے قومِ تُرک کی ترقی من حیث القوم ثابت کی ہے۔ سیزدہ سالہ حکومت عبد المجید خاں کے نام سے جو کتاب کچھ عرصہ ہوا اُردو میں شائع ہوئی تھی وہ اسی طرح کے ایک انگریزی مصنّف کی تحریر کا ترجمہ ہے۔ حال میں جرمن اور فرانس میں بھی چند ایسے مصنّفین کے نام مل سکتے ہیں۔ ایسے مصنّفین کے دِل خوش کن بیانات شاید بمقابلہ یورپ کے ان مصنّفین کے خیالات کی تردید میں پیش کئے جانے کے قابل ہوں تو ہوں۔ جنہوں نے تُرکی حکومت کے حالات نہایت متعصبانہ اور خود غرضانہ رنگ آمیزی کے ساتھ لکھے ہیں مگر خود اہلِ ملک یا تُرکوں کے صحیح حالات دریافت کرنے والوں کی نظر میں اُن کی بہت وقعت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ایسے بیانات نہایت غلط طریقہ استدلال کے نتائج ہیں۔

دوسرے گروہ میں وہ مصنّفین ہیں جنہوں نے بجائے تُرکوں کی حکومت کی طرز و آئین پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور اُن کی حکومت کی بد انتظامی اور بے ضابطگی سے قومِ تُرک کو من حیث القوم ذلیل اور ناچیز ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسے مصنّفین کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

اور اس کے گروہ میں وُہ مصنفین بھی شامل ہیں جن کی تصنیفات کے متعلق مولانا شبلی نعمانی صاحب اپنے سفرنامہ روم و شام کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ یورپ میں اب یہ دانشمندانہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومتوں۔ اسلامی قوموں اسلامی معاشرت کے عیوب تاریخی پیرایہ میں ظاہر کئے جاتے ہیں اور عام تصنیفات۔ قصوں۔ ناولوں اور ضرب المثلوں کے ذریعے سے وُہ لٹریچر میں اس طرح جذب ہو جاتے ہیں کہ تحلیل کیمیاوی سے بھی جُدا نہیں ہو سکتے۔

پس ایسے مصنفین کے افراط اور تفریط سے طبعی طور پر تُرکوں کے حالات مطالعہ کرنے والوں پر دو قسم کا اثر ہو سکتا ہے۔ اور یہی باعث ہے کہ جس طرح یورپ میں اس وقت تُرکوں کے متعلق دو قسم کی رائے ہے۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی اُن کی نسبت دو قسم کے خیالات موجود ہیں۔ بعض لوگ تو اوّل الذکر مصنفین کی چرب زبانی سے ٹرکی کی حکومت موجودہ سلطان المعظم کی دانشمندانہ تدابیر کے مداح و ثناخواں ہیں اور اس لئے وُہ اس مُلک کی ہر بات کو نظرِ قبولیت سے دیکھتے ہیں۔ دُوسرا فریق ایسا ہے جو تُرکوں کی تدابیرِ حکومت پر افسوس کرتا ہے۔ اور تُرکوں کو اگر حقارت نہیں تو کسی وقعت کی نگاہ سے بھی نہیں دیکھتا۔ اور اس لئے اُن کے حالات میں کوئی چیز قابلِ استفادہ نہیں سمجھتا۔ یہ اختلاف تُرکوں کی ترقی و تنزل کے متعلق اگر محض قیاسی ہوتا تو شاید مجھے اس کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ مگر جب یہ دیکھا جاتا ہے کہ تُرکوں کی ترقی بیان کرنے والے اپنے بیان کے ثبوت میں اور اُنکا تنزل بیان کرنے والے اپنے خیال کی شہادت میں ایسے ایسے واقعات کو بطور استدلال پیش کرتے ہیں۔ جن کے موجود ہونے سے کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف رائے کے راز کو تلاش کیا جائے اور یہ امر معلوم کیا جائے۔ کہ کس طرح باوجود دونوں فریقوں کے بیان کردہ واقعات کے صحیح ہونے کے تُرکوں کی ترقی یا تنزل کے متعلق کوئی صحیح رائے قایم ہو سکتی ہے۔

مندرجہ بالا بیان سے اس قدر صاف ظاہر ہے کہ تُرکوں کے حالات لکھنے والوں نے

عجب اتفاق سے ترکوں کی ترقی وتنزل کو اُن کی حکومت کے حُسنِ انتظام یا خرابیوں کی کسوٹی پر کسا ہے۔ اور اِس لئے جو حکومت کے مدّاح رہے ہیں اُنھوں نے ترکوں کو بہ حیثیت قوم بھی اچھا لکھا ہے اور جو حکومت کے خلاف رہے ہیں۔ اُنھوں نے اُنکو بہ حیثیتِ قوم بھی قابلِ مذمت قرار دیا ہے۔

یہ طریقِ بیان نہ صرف غیر معمول اور بے ربط طریقہ استدلال پر ہی مبنی ہے بلکہ کُلّیۃً حالاتِ واقعی کے خلاف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کی ترقی یا تہذیب (میں لفظ ترقی اور تہذیب کو مترادف استعمال کرتا ہوں کیونکہ تہذیب کے معنی میں ترقی کا مفہوم اور ترقی کے معنی میں تہذیب کا مفہوم شامل ہے) اس قوم کے مُلکی انتظام اور آئینِ سیاسہ کی عمدگی کے ساتھ ایسی لازم وملزوم قرار نہیں دی جاسکتی کہ ایک کی عدم موجودگی سے دوسرے کا فقدان لازم آسکے۔ اس میں شک نہیں کہ آئینِ سیاسہ کی ترقی اور تہذیب۔ قومی ترقی کا ایک لابُدّ نتیجہ ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ یہ دونوں ترقیاں ایک ساتھ اور ایک ہی وقت میں موجود ہوں۔ یہ امر بالکل ممکن ہے کہ ایک قوم باوجود اپنے آئینِ سیاسہ کی ابتری کے مہذّب اور شائستہ ہو اور دوسری قوم باوجود حُسنِ انتظامِ مُلک کی تہذیب اور شائستگی میں کمزور ہو۔ اس کی مثال فرانس اور انگلستان کی اس متفاوت حالت سے ظاہر ہے جو سولھویں اور سترویں صدی عیسوی میں دونوں مُلکوں میں موجود تھی۔ فرانس باوجود اپنی مُلکی بدانتظامی اور قوانینِ سیاسہ کی ابتری کے تہذیب اور شائستگی میں جس قدر بڑھا ہوا تھا اسی قدر انگلستان باوجود اپنے حُسنِ انتظامِ مُلک کی تہذیب میں فرانس سے پیچھے تھا۔

پس جو صُورت فرانس کی اس سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں تھی وہی صُورت آج ٹرکی کی ہے۔ ترکوں میں ابھی تک مُلکی ترقی کا کوئی دور شروع نہیں ہوا۔ مگر ان میں شخصی ترقی نہایت عظیم الشان طور پر موجود ہے۔ اور اسی باعث سے مَیں نے ترکوں کے حالات طرزِ معاشرت وطریقِ تمدّن پر لکھنے کا خیال کیا ہے۔ کیونکہ میرے خیال

ہیں ایسے حالات میں بہت سی باتیں ہماری قوم کے استفادے کے لئے موجود ہیں۔ ترکوں کے آئین حکومت اور انتظامِ ملک کے متعلق لکھنا میرے اس مضمون کی حدود سے خارج ہے اور اس لئے میں اس کے متعلق اپنے خیالات کسی دوسرے وقت ظاہر کرونگا۔ اس وقت صرف اسقدر الفاظ پر اکتفا کرتا ہوں کہ موجودہ آئین حکومت اگر قوم کے موجودہ مادہ ترقی کو بالکل نابود کرنے کی کوشش پر آمادہ نہیں تو اس مادے کے ظہور کے روکنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا رکھنے میں قاصر بھی نہیں۔ اس مختصر بیان سے مندرجہ بالا مصنفین کے مختلف بیانات میں تطبیق پیدا کرنی زیادہ مشکل نہ ہوگی کیونکہ جنہوں نے حکومتِ ترکی کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے قوم میں مادۂ ترقی کی موجودگی پر نظر نہیں کی جس کے مقابلہ میں یہ سب ترقیاں بمنزلۂ تنزل کے ہیں۔ اور جنہوں نے آئینِ حکومت کو بُرا کہا ہے۔ اُنہوں نے یہ خیال نہیں کیا کہ باوجود آئین حکومت کی ابتری کے فرانس بھی مہذب اور شائستہ خیال کیا گیا تھا۔

(باقی آئندہ)

۱۰۔ اگست ۱۹۰۴ء (از استنبول) میرزا جلال الدین

انقلابِ زمانہ

نہ عیش کیخسروی رہیگا نہ دولتِ بہمنی رہیگی
رہیگی اے منعمو تو باقی دئیے کی کچھ روشنی رہیگی

رہیگی گردش دکھا کے نیچا جو ہوگئے تارہ تم آسماں کے
سدا کسی کی بنی رہی ہو نہ یاں کسی کی بنی رہیگی

گرایا تورانیوں کو تُو نے پچھاڑا ساسانیوں کو
کہاں تلک اے شرابِ غفلت یہ تیری مردافگنی رہیگی

صفائیاں ہو رہی ہیں جتنی دل اتنے ہی ہورہے ہیں میلے
اندھیرا چھا جائیگا جہاں میں اگر یہی روشنی رہیگی

بگاڑ مذہب نے جو ہیں ڈالے نہیں وہ تا حشر مٹنے والے
یہ جنگ وہ ہے کہ صلح میں بھی یونہیں ٹھنی کی ٹھنی رہیگی

رہیگی کس طرح راہ ایمن کہ رہنما بن گئے ہیں راہزن
خدا نگہباں ہے قافلوں کا اگر یہی رہزنی رہیگی

قبولیت کی کرو نہ پروا جو چاہو مقبولِ عام ہونا
رہوگے گر حسن ظن کے طالب تو تم سے یاں بدظنی رہیگی

جو چھوڑے میراث کچھ نہ خالی تو ہونا دل تنگ کچھ نہ وارث
رہینگے ہر حال میں غنی وہ جو نیت اُنکی غنی رہیگی

(ریاض)

مشاہدۂ قدرت

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

دُنیا میں ہمارے اردگرد صدہا باتیں روز ایسی ہوتی ہیں کہ اگر چشمِ بصیرت سے دیکھا جائے تو اُن سے خالقِ بے ہمتا کی قدرتِ کاملہ کا بخوبی پتہ لگتا ہے مگر ہم تو بادۂ غفلت میں ایسے سرشار ہیں کہ اُن تمام باتوں کو ذرا بھی غیر معمولی نہیں سمجھتے۔ ابھی سُورج نکلا ہے اور شاخِ گل میں لگے ہُوئے پھول بھی اس حسرت و افسوس میں اپنے دلی انقباض کی طرح منقبض ہُوئے جاتے ہیں کہ اگر رات ہم بھی کسی سیمتن کے گلے کا ہار بنجاتے تو اُسوقت بڑھنے والی دُھوپ کے ہاتھوں سے اس طرح کیوں پژمُردہ ہوتے مگر حضرتِ انسان کو کچھ بھی خبر نہیں۔ ہمارے نزدیک سُورج کا روز نکلنا اور غروب ہونا ایک نہایت معمُولی بات ہے۔ اِس کے بعد دوپہر ہُوئی اور درختوں کے پتوں میں شعاعی روشنی اُسی طرح عیاں ہونے لگی۔ جیسے کسی پریوش کے کانوں میں سونے کی جڑاؤ بجلیاں تڑپ تڑپ کر مشتاقوں کے دلوں پر بجلی گراتی ہیں مگر ہمارے نزدیک یہ بھی ہند واقع ہونے والا امر ہے۔ پھر وُہ وقت آیا جس میں آفتاب اپنے کسی دلستان معشوق سے ملنے کے لئے سارا آسمان ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے دِن بھر کی سخت محنت کے بعد سطحِ زمین سے بالکل قریب ہوجاتا ہے اور اس کی تجسس کرنے والی کرنیں مشتاق نگاہوں کی طرح بے اختیار ہوکر گر پڑتی ہیں اور جھلملا جھلملا کر ایک حسرت کے ساتھ چاروں طرف دیکھنے لگتی ہیں۔ مگر اس کا ہمارے دل پر کوئی پائدار اثر نہیں ہوتا اور ہم ایک لحظہ بھی اس غور میں صرف نہیں کرتے کہ آخر وُہ کونسی زبردست قوت ہے جو ایک آن کی آن میں کسی نازک مزاج کے تلوّن کی طرح ایسی ایسی دلچسپ تبدیلیاں کرتی رہتی ہے اور اس کی قدرت کیسی زبردست ہے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ وُہ مُنہہ بند کلیاں جو اِس سے ذرا دیر پہلے سر جھکائے دم بخود بیٹھی تھیں اب کھلکھلا کر ہنسی پڑتی ہیں اور اُن کے جان نثار عاشق یعنی عنادل مست اور بیخود ہو ہو کر پھولوں کے شگفتہ چہروں کی بلائیں لے رہے ہیں۔ مگر کبھی اُس قدرت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا جس کے ادنیٰ اشاروں پر ایسی ایسی رنگ آفرینیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے کُملا مُرجھاتے ہوئے سبزے کے چہرے پر تروتازگی آگئی جس کا ابھی آفتاب کی گرم بازاری دیکھ کر ذرا سا مُنہ نکل آیا تھا اور وُہ ہرا بھرا رنگ پھر شوخ ہوتا جاتا ہے جو گرمی اور تپش سے اُڑ اُڑا کر کچھ یونہی سا باقی رہ گیا تھا۔ مگر کوئی بتلائیے کہ اس تبدیلی کا ہمارے دل پر کیا اثر ہوا اور ہم نے کبھی یہ بھی خیال کیا کہ یہ نیرنگیاں پیدا کرنے والی کون سی طاقت ہے۔

ابھی کل سردی کا موسم تھا۔ کسی کے بوٹا سے قد کی طرح چھوٹے چھوٹے دِن تھے اور کسی کی زُلف دراز کی طرح بڑی بڑی مزے کی راتیں تھیں۔ یا اب وُہی دن ہے کہ فراق کی سخت گھڑیوں یا رمضان کے دنوں کے گھنٹوں کی طرح خود بخود بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اور وُہی راتیں ہیں جو شب وصلت کی طرح خواہ مخواہ کوتاہ ہوئی جاتی ہیں۔ ابھی چار دن پہلے آفتاب کہاں سے نکلتا تھا اور اُس کے رنگ میں کیسی دل لُبھانے والی ایک ادا نکلتی تھی یا اب دیکھئے کہ منطقۃ البروج کے ترچھے ہونے کی وجہ سے اب وُہ کہاں سے کہاں ہٹ کر نکلتا ہے اور اُس کا حُسن عالم سوز کیسا ترقی کر گیا ہے یعنی دُھوپ کی تیزی اُٹھتے جوبن والے حسینوں کی شوخیٔ مزاج کی طرح زیادہ ہو گئی ہے۔ مگر کون ہے جو ان باتوں کو صانع حقیقی کی قدرتِ کاملہ کا نمونہ سمجھے اور ان باتوں کی مصلحتوں پر غور کرے کہ کیوں ہوتی ہیں۔ خواہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے اور چاہے کوئی شُکر ادا کرے یا نہ کرے اِن سب باتوں میں بڑے بڑے مصالح مخفی ہیں جو حیاتِ انسانی کے قیام کا موجب ہیں۔

دُور جانے کی کیا ضرورت اگر چشم بینا رکھتے ہوں تو خود ہمارا جسم ایک عجائب خانہ معلوم ہوتا ہے جس کے ہر عُضو کی ساخت سے قُدرتِ نامتناہی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر ہم کبھی خواب میں بھی یہ نہیں خیال کرتے کہ آخر یہ آنکھ ناک ہاتھ پاؤں ہم کو کیوں عطا کئے گئے ہیں اور ہم کو ان سے

کیا کیا کام لینے چاہئیں - ہم سمجھتے ہیں کہ یہ سب چیزیں خُدا نے محض اس غرض سے عطا فرمائی ہیں کہ انکو کامل آسائش پہنچائی جاوے - یہی وجہ ہے کہ ہر مقام پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں بندگانِ خُدا ایسے دکھائی دیتے ہیں جو محض بیکار رہتے ہیں اور خُدا کے دیئے ہُوئے ہاتھ پاؤں سے کام لینا گناہ سمجھتے ہیں - کچھ لوگ تو اپنے بزرگوں کا اندوختہ کھا رہے ہیں اور کچھ اپنے صاحبِ استطاعت عزیزوں کے لئے وبالِ جان ہو رہے ہیں - خیر اِن کو تو جیسا میسّر آجاتا ہے کھا پی لیتے ہیں - لیکن سب سے اچھے یا سب سے ذلیل وُہ ہیں جو ہم کو آرام دینے اور بغیر محنت کئے عیش و عشرت کرنے کے لئے پیر و مرشد بن بیٹھے ہیں - عُمدہ سے عُمدہ کھانا اور اچھے سے اچھا کپڑا پہننا اور ہر وقت اسبابِ نشاط کی مجلس گرم رکھنا اور یہ اخراجات پُورے کرنے کے لئے غریب محنت کش مریدوں سے ناجائز طور پر روپیہ وصُول کرنا اِن کا کام ہے - سوائے اِس کے اِنکا اَور کوئی مقصد ہی نہیں کہ انکو ہاتھ پاؤں نہ ہلانے پڑیں اور عزت و آرام جس کی ہر شخص کو خواہش ہوتی ہے میسّر آجاویں - اور ہماری کوتاہ اندیشی اور ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے یہ اغراض اُن کی خُوب پُوری ہوتی ہیں - علاوہ اِن کے ایک اَور بڑا گروہ اُن گداگروں کا ہے جو ہر جگہ در بدر اور کُو بکُو مانگتے پھرتے ہیں اور صرف مانگتے ہی نہیں بلکہ طرح طرح کے مکروں اور فریبوں سے روپیہ بطور ٹیکس کے وصُول کرتے ہیں - اِن کی بھی یہی غرض ہے کہ دُوسروں کی محنت سے فائدہ اُٹھاویں اور آرام پاویں - غرضکہ یہ دونوں گروہ گو کہ ہر وقت اپنے زُہد و اتّقا کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور خُدا سے اپنا بہت قریبی تعلق بتلاتے ہیں - یہ کبھی نہیں سوچتے کہ اُنکو کیوں پیدا کیا گیا ہے - اور خُدا نے اُنکو یہ ہاتھ پاؤں کیوں دیئے ہیں - اور اُس کی دی ہُوئی نعمت سے کس طرح فائدہ اُٹھانا چاہئیے - اگر یہی منظور ہوتا کہ وُہ اپنے دُوسرے بھائیوں پر تمام عُمر بار رہیں تو ان کو اندھا کر دیا جاتا یا لنگڑا پیدا کیا جاتا یا ہاتھ نہ دیئے جاتے - آخر وُہ کونسی وجہ تھی کہ اُن کو صحیح سالم مثل اُن آدمیوں کے پیدا کیا گیا جو محنت کرکے اپنا اور اپنے متعلقین کا پیٹ پال لیتے ہیں - اور ان چیزوں سے کام نہ لینا اور فائدہ نہ اُٹھانا کُفرانِ نعمت نہیں تو اَور کیا ہے ؟ ـــہ

قوتیں جو اُس کو ہوئی تھیں عطا　　　سب کو دیا خاک میں اُس نے مِلا

اور جو لوگ اُن کو یہ کفرانِ نعمت کرنے میں مدد دیتے ہیں وُہ بھی ایک نہ ایک روز اپنی اس حرکت کے جوابدہ ہونگے - لہٰذا ہر شخص کا فرض ہے کہ جس کو قدرت نے ہاتھ پاؤں آنکھ کان جیسی بیش بہا نعمتیں بخشی ہیں وُہ قوتِ بازو سے اپنی معاش پیدا کرے اور بارگاہ احدیت کا شکر گذار رہے کہ اُس کو اس قابل بنایا گیا اور جو لوگ اِن نعمتوں سے محروم ہیں اور کام کرنے کے قابل نہیں ہیں - اُن کی بصورتِ مناسب امداد کرے - ہمارا یہ بھی فرض ہونا چاہئے کہ کام کرنے کے قابل آدمیوں کو ہم کام کرنے کی ترغیب دیویں اور اُن کو سمجھا دیں کہ کام چور اور سست آدمیوں کے وجود سے مُلک کو اور قوم کو کیا کیا نقصانات پہنچتے ہیں اور خُدا کی کیسی ناشکری ہوتی ہے -

اگر مشاہدۂ قُدرت کرتے کرتے یہ بخوبی ذہن نشین ہو جاوے کہ انسان کے اعضا کیسے گراں بہا ہیں اور وُہ کام کرنے کے لئے دیئے گئے ہیں نہ کہ آرام پہنچانے کے لئے تو بہت سے لوگ کام کرنے پر آمادہ ہو سکتے ہیں اور مُلک و قوم کی دولت کو ترقی دے سکتے ہیں +

نیاز احمد (از میرٹھ)

گُنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اُٹھا کے چلے　　　خُدا کے آگے خجالت سے سر جھکا کے چلے
کسی کا دِل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی　　　چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے
مقام یُوں ہوا اس کارگاہ دُنیا میں　　　کہ جیسے دِن کو مسافر سرا میں آکے چلے
طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو　　　کبھی جو ہو گیا پھیرا صدا سُنا کے چلے
ملا جنہیں اُفتادگی سے اَوج ملا　　　اُنہیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اُٹھا کے چلے
انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ　　　چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

(سجاد)

بُوشہر

(میرے روزنامچے کا ایک ورق)

۴۔ مارچ [illegible] ۔ روز سہ شنبہ۔ اس مقام میں پندرہ ہزار آدمی رہتے ہیں۔ اور یہ جگہ قوم حبشی اور یہاں کے لوگوں سے آباد ہے۔ ایرانی حاکم کا نام سعد الملک ہے۔ یہاں برٹش ریذیڈنٹ کرنل اس ... پرتگالی ریذیڈنٹ مسٹر گوآن، اور ایک ترکش ایجنٹ ملا حسن بھی رہتے ہیں۔ آج ایک فرانسیسی ریذیڈنٹ صاحب جو میل میں تشریف لائے ہیں۔ مگر ان کا نام نہیں معلوم۔ علاوہ ان کے ایک برٹش اسسٹنٹ ریذیڈنٹ خان بہادر عبدالرحمان خان بھی مقیم رہتے ہیں۔ یہ نہایت ہی خوش مزاج اور ...ل آدمی ہیں۔ آج ان کے تبادلے کا تار کلکتہ سے آگیا ہے اور یہ ترقی سات سو روپے ماہوار ... ہندوستان جاتے ہیں۔ سعد الملک کو یہاں کے اختیارات حاصل ہیں۔ مقدمات وغیرہ بھی یہی تجویز کرتے ہیں۔ مگر اقوامِ غیر کے مقدمات اُنکے ریذیڈنٹ خود فیصل کرتے ہیں۔ بندر عباس۔ لنگہ۔ بوشہر وغیرہ بارہ لاکھ کے ٹھیکہ پر سعد الملک کو دیدیا گیا ہے۔ سارا انتظام انہیں کے متعلق ہے۔ تعداد معینہ کے علاوہ جو کچھ زیادہ آجائے وہ حاکمِ شہر کا حصّہ ہے۔ یہاں کی چونگی کے قاعدے بندر عباس کے موافق نہیں۔ مَیں سمجھتا تھا کہ ایک ہی قاعدہ یہاں بھی برتا جاتا ہوگا۔ مگر یہاں کا قانونِ قدرت بالکل ہی جُداگانہ ہے۔ ہر چیز پر الگ الگ محصول بندھا ہے۔ مثلاً فی ... کے لئے ایک آنہ محصول ہے۔ نین کلاٹ کے ایک تھان کے لئے آٹھ آنے۔ مال برٹش ... کے ساتھ ایک خاص رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے اور یہ کچھ اللہ کے ایسے پیارے بندے ہیں یہاں جو ... اپنے نفع کی کوئی صورت نکال ہی لیتے ہیں۔ انگریزی رعایا سے مال پر فی سیکڑہ ... ہے۔ سب سے زیادہ تمباکو پر محصول ہے۔ پانچ من تبریزی کے لئے چار آنے

یہ شہر سمندر کے کنارے بیضوی طرز پر آباد ہے اور بہت ہی خراب خستہ حالت میں ہے۔ پانی کے کنارے کچھ مکانات انگریزی طرز کے دور سے فریبانہ جھلک دکھا کر اپنی طرف متوجہ کر لیتے ہیں۔ سمندر کو کچھ پاٹنے بھی آتے ہیں۔ مکانات بھی بنتے جاتے ہیں۔ مگر عمارتیں مضبوط نہیں ہوتیں۔ شہر بہت میلا اور گندا ہے جابجا کوڑوں کے ڈھیر اور فضلے کے انبار پائے گئے۔ میں نے بازار کی خوب سی خاک چھانی۔ کوئی پاؤ میل کا ایک پٹا ہوا راستہ ہے۔ لکڑی کی گول گول دھنیاں رکھ کر اسے کھجور کے پتوں سے چھایا ہے۔ بازار اکثر جگہ سے کج و کاواک ہے۔ سیدھی یا لمبی لکیر کی طرح نہیں ہے۔ کوئی سو قدم کے فاصلے پر جاکر پھر مڑنا پڑتا ہے۔ خاص بازار کی سڑک کی چوڑائی کوئی ساڑھے تین ہاتھ کی ہوگی۔ اس پر لطف یہ ہے کہ دونوں طرف مد تقطع اور ناہموار ایک ایک ہاتھ کا چبوترا اٹھا ہوا ہے اور راستہ چلنے کے لئے صرف ایک پتلی سی لکیر رہ جاتی ہے۔ راہ بہت ٹیڑھی اور نہایت ہی تنگ ہے۔ آدمی کشادگی کے ساتھ بمشکل چل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دو آدمی برابر شانہ ملاکر بھی نہیں چل سکتے۔

کپڑے کی دکانیں۔ تانبے۔ ترکاریوں۔ میووں اور اسلحہ کی دکانیں سب اسی گلی میں ہیں۔ مگر ان سب کی الگ الگ دکانیں ہیں۔ بازار حد درجہ میلا ہے اور دو ہی منٹ میں دل و دماغ کی خبر لے لیتا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے۔ جب سے اس شہر کی بنا پڑی میں سمجھتا ہوں۔ کبھی اس بازار میں جھاڑو نہیں دگمی۔ دکانداروں کی زکیبیں بھی ٹھیک نہیں۔ نہ انکی دوکانیں صاف ستھری ہیں۔ ہاں مٹھائی کی دوکانیں کسی قدر صاف و شفاف ہیں۔ نُقل سینیوں میں کچھے بڑی خوشنمائی کے ساتھ اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ بازار میں لوگ بھی اچھے نہ دکھائی دیئے۔ عورتیں اکا دکا نظر پڑیں۔ چہرہ پر کالی جالیدار نقاب ڈالے اور موزے چڑھائے چیزیں خرید رہی تھیں۔ تھوڑی دیر کی سیر نے مجھے نہایت پریشان کر دیا اور میں نے قسم کھائی کہ اگر جیتا جاگتا اپنے سفر سے پلٹا تو کبھی اس بندرگاہ میں قدم نہ رکھونگا۔

یہاں حفظانِ صحت کا مطلق خیال نہیں۔ آدمی مرے یا جئے اس کی کوئی پروا نہیں۔ شاہ کی طرف

سے کوئی مجلس حفظ صحت کے لئے قائم نہیں کہ ان گندگیوں کو دور کرے۔ بازار اور شہر کے اندر کچھ شاہی عسکر کے لوگ بھی دکھائی دیئے مگر اے صلِّ علیٰ۔ وردیاں تک ٹھیک نہ تھیں۔ خدا جانے کتنے پیوند لگے ہوئے تھے۔ پتلونوں میں سلائی کی جگہ سرخ لانبی پٹ تھی۔ کوٹ وہی ایرانی وضع کا تھا۔ اس کے مونڈھوں پر بھی سرخ پٹ۔ کلاہ کے چاروں طرف بھی وہی سرخ دھجی لپیٹی ہوئی تھی۔ پولیس کا انتظام بھی بالکل لٹا ہے۔ کوئی آٹھ سو آدمی ہیں۔ ہر شخص کو سالانہ ایک سو بیس ملتا ہے۔ یہاں کوئی بھڑکیلی اور شاندار عمارت نظر نہ آئی۔ گو سمندر کے کنارے بعض عمارتیں اپنے نزدیک اپنی بے حکمرانی کر رہی ہیں۔ مگر وہ تحسین کے قابل نہیں۔ ہاں ملک التجار صاحب کا مکان جو تین لاکھ میں شہر کے باہر تیار ہوا ہے وہ البتہ قابلِ تعریف ہے۔ بابو خانۂ انگریزی بہت پاکیزہ ہے۔ ریذیڈنسی اصطبل بھی بہت وسیع ہے اور اس میں عربی گھوڑے قابل دید ہیں۔ ریذیڈنسی کے متعلق ایک جمعدار، چودہ سوار اور تیس سپاہی رہتے ہیں۔ جمعدار کی تنخواہ چالیس۔ سواروں کی تیس۔ اور سپاہیوں کی سات روپیہ ماہوار مقرر ہے۔ اور سال بھر کے بعد ان لوگوں کا تبادلہ ہوتا ہے۔ شیخ حسین علی رستم نگر لکھنؤ کے رہنے والے آجکل جمعدار ہیں اور اٹھارہ برس سے مقیم ہیں۔ بیچارے نے اپنا گھر یہیں بنا لیا ہے اور بال بچے بھی بلوا لئے ہیں۔ اس بندرگاہ میں چار باغ ہیں اور رُت پلٹنے پر فصل بہار نے اپنی رنگینی پھیلا رکھی ہے۔ آم کے درخت اور پودے ہرے بھرے ہیں۔ چمن شاداب۔ اور لہلہا رہے ہیں۔ جابجا پانی کے جھرنے بھی جاری ہیں۔ یہاں باغ مُندلی نہایت مشہور اور دلچسپ ہے میووں کے درخت کثرت سے ہیں اور جابجا آبشاریں ہیں جن سے درخت اور پودے سیراب ہوتے ہیں۔ باغ ریذیڈنسی بھی بہت پیارا اور رسیلا ہے۔ پھولوں کے درخت بھی ہیں اور شام کو گلگشت کے لئے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ سرکاری تارگھر جو نیا بنا ہے وہ بھی نہایت بھڑکیلا ہے۔ قلعہ بہمنی پرانے وقت سے نوشیرواں کے زمانہ کا قلعہ ہے اسے قلعہ ریشہر اور ہیلہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سمندر کے کنارے ہی اور اس کے ویرانے نے میرا بہت دل دکھایا ہے۔ بالکل کھنڈر ہو رہا ہے۔ صرف اس کی بنیاد گذرے زمانہ کا مٹا ہوا نشان بتا رہی ہے۔ چاہ بہمن بھی اسی کے قریب ہے۔ یہیں سے تمام شہر میں

میٹھا پانی جاتا ہے۔ قاطرچی مشکوں میں بھر کر لیجاتے ہیں اور تین پیسے پر ایک چھوٹی سی مشک بیچتے ہیں۔ آہنی توپ کا چاہ باغ بھی بہت مشہور ہے۔ یہ بھی کسی قدر دلچسپی کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ باغات اور ایک آدھ مشہور عمارتیں شہر سے دو میل کے فاصلہ پر ہیں۔

اس بندرگاہ میں ایک اہل سُنت اور سترہ شیعوں کی مسجدیں ہیں۔ یہاں ہر طرح کے میوے ہوتے ہیں۔ ترکاری۔ مولی۔ تربوز۔ ککڑی اور ساگ وغیرہ ہر قسم کا پیدا ہوتا ہے۔ گیہوں اور جَو بھی ہوتے ہیں۔ چاول فیروزآباد اور شیراز وغیرہ سے آتا ہے۔ شیراز کا پکا چاول نہایت مشہور ہے اور لوگ بہت رغبت اور خوشی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ چاول روپیہ کا آٹھ سیر۔ اور گھی ڈیڑھ ملتا ہے۔ ارہر کی دال کراچی سے آتی ہے اور روپیہ کی چار سیر ملتی ہے۔ ناریل کا تیل بھی ملتا ہے۔ یہاں سے ممالک غیر میں۔ اُون۔ روئی۔ سوکھے بادام اور میوے وغیرہ جاتے ہیں۔ ولایت کو گیہوں۔ جَو اور گوند جاتا ہے اور وہاں سے کپڑے آتے ہیں چین سے چاء داڑچینی اور ہر قسم کا مرتبہ آتا ہے۔ یہاں گز انگبین نہایت لطیف اور عُمدہ مٹھائی ہوتی ہے۔ معطر ہونے کے علاوہ اُس میں خوشگوار تُرشی بھی ہوتی ہے۔ یہ ہمارے یہاں کے برشولے سے بہت مشابہ ہے مگر فرق یہ ہے کہ اس کی عطر بیزی اور لطافت اُس سے کہیں بڑھی ہوتی ہے۔ گز ایک درخت ہے جس میں سے گوند نکال کر اُس میں شیرینی اور خوشبوئی ملا کر مٹھائی بناتے ہیں۔

خیر میں مشہور مقامات کی سیر کرتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے آرہا تھا کہ میں نے ایک مکان کے دروازہ پر جلی حرفوں میں "آیم۔ جی گُلزار" سوداگر کا نام انگریزی حرفوں میں لکھا ہوا دیکھا۔ میں اندر چلا گیا۔ دو چار انگریز اور ایرانی بیٹھے تھے۔ ہر قسم کا کپڑا۔ انگریزی توپیئے اور سلے ہوئے کوٹ۔ پتلون۔ کاغذ لفافے اور بہت سی چیزیں جو انگریزی دوکان کے لئے ضروری ہیں نہایت خوش سلیقگی کے ساتھ اُونچے اُونچے تختوں پر رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے سادے توپئے مانگے۔ مگر حُسنِ اتفاق سے اُس وقت موجود نہ تھے۔ بُوشہر میں صرف یہی ایک انگریزی دوکان ہے۔ جہاں ضروریات کے انگریزی سامان مل سکتے ہیں۔ یہ دوکان سنہ ۱۸۶۵ء میں کھولی گئی تھی اور اس وقت ترقی پر ہے

جُوں ہی دوکان سے باہر نکلا مَیں نے اس مکان کے اُوپر کے درجے سے ایک گوری چِٹّی کَٹّی ونگی عورت کو اُترتے دیکھا۔ دونوں رخساروں کی سُرخی نہایت نمایاں طور پر چمک رہی تھی۔ ایسی لالی تھی کہ گلِ قیصر بھی اس کے آگے مات تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کچھ مُسکرا کر مُنہ پر نقاب ڈال لی۔ بُرقع سر سے اوڑھ لیا اور سڑک پر آ رہی۔ مَیں سمندر کے کنارے کنارے سڑک پر آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا آگے بڑھا۔ مَیں جا رہا تھا کہ مَیں نے چند چھوٹے چھوٹے بوشہری چھوکروں کو زمین پر کچھ نقش کھینچ کر اور اُن پر ٹھیکریاں رکھ کر کھیلتے دیکھا۔ مَیں نے اُن سے فارسی میں پوچھا کہ کیا کرتے ہو۔ اُنہوں نے جواب دیا "بازی میکنیم"۔ مَیں نے پھر پوچھا کہ "ایں را چہ میگوئی" سبھوں نے کہا "دوس"۔ میں اس کھیل کو سمجھ نہ سکا مگر میرے ایک ہمسفر دوست نے کہا کہ اسے ہماری طرف "سوچہ پالی" کہتے ہیں۔ جس سڑک پر مَیں آ رہا تھا آگے بڑھ کر اُس کی بدبو نے دماغ اس قدر پریشان کیا کہ اگر تصنّع نہ سمجھا جائے تو مَیں بلا مبالغہ پانچ منٹ تک اپنی ناک مضبوطی سے پکڑے سیدھا چلا گیا اور پھر جو ناک کھولی تو اُسوقت تک بدبو نے رفاقت نہ چھوڑی تھی بلکہ تمام جسم میں سرایت کر گئی تھی۔ یہ سڑک نہایت دلچسپ اور قابلِ سیر ہو جاتی اگر اُس کی صفائی کا لحاظ کیا جاتا۔ سمندر کے کنارے کنارے مَیں نے بہت سی عورتوں کو دیکھا کہ وُہ کپڑے دھو رہی تھیں اور اُن کے ہاتھوں میں کاٹھ کی موگریاں تھیں کہ وُہ اُن پر مارتی جاتی تھیں۔ یہ عورتیں بے نقاب اور ملیح صُورت تھیں۔

مَیں کوئی دو بجے پھرتا پھراتا اپنی کشتی پر سوار ہوا۔ ملّاحوں نے بادبان کھینچا۔ اُسوقت ہوا کا زور بڑھ چلا تھا۔ موجیں آنکھیں نکال رہی تھیں۔ ہوا اُمنگ پر تھی۔ کشتی ایک روٹ سے چلی۔ اسی عالم میں اپنے جہاز تک پہنچا۔ یہاں مال لد چکا تھا۔ انجن سے بھاپ نکل رہی تھی۔ لنگر اُٹھنے کا سامان تھا۔ جہاز کی جھنڈیاں اُتار لی گئی تھیں کہ ناگہاں ایک دلخراش آواز سُنائی دی۔ دیکھتا کیا ہُوں کہ کپتان صاحب جہاز کے عیسائی مستری کو اپنی پیٹھ پر لادے لیے آتے ہیں اور اُن کا تمام کوٹ خون سے شرابور ہے۔ بیچارے مستری کے بائیں ہاتھ کی

انگلیاں بالکل ترش گئی تھیں - صرف گوشت کا ایک لوتھڑا لٹک رہا تھا اور اُس سے خون جاری تھا اور وُہ اپنے آپے میں نہ تھا معلوم ہُوا کہ ایک کل میں اس کا ہاتھ دب گیا جس کی وجہ سے چار انگلیاں بالکل اُڑ گئیں صرف انگوٹھا بچ گیا تھا - جہاز کے سب انگریز اُس کی خبر کو دوڑے اور اُن کے چہروں سے بیچینی اور اضطراب نمایاں تھا - مسٹر خورشید جی ڈاکٹر نے نہایت پھُرتی کے ساتھ اُس کا گوشت تراش کر فوراً پٹی باندھی - چیف آفیسر اُس کا سر پکڑے تھے مگر بیچارے نے اُف تک نہ کی - کپتان صاحب نے جلدی سے اس کے لئے ایک بوٹ منگوایا اور اُس پر سوار کرکے ہسپتال بوشہر میں بھیجنے کا قصد کیا - بنیڈج باندھ کر سب انگریز اُسے پکڑ کر بوٹ پر لے چلے - غریب کھڑے ہونے کو تو کھڑا ہوا مگر لغزش کھا کر بیٹھ گیا - اب دو تین انگریزوں کے سہارے چلا - اور نہ نگاہ یاس پہلے کپتان کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اُس کے ہاتھوں پر بوسہ دیا - کپتان آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور اُس کی پشت پر ہاتھ رکھ کر تسلی آمیز الفاظ میں کہنے لگا کہ تم زیادہ مضطرب ہونا" اہلِ جہاز نے یہ حالت دیکھی سب کا دل منہ آیا اور خاص کرکے اس کی غربت اور مسکینی پر زیادہ صدمہ ہوا - سب لوگوں نے اپنی حیثیت کے موافق روپئے پیسے سے اُسکی مدد کی - اب انگریزوں نے بمشکل اُسے بوٹ پر سوار کیا - اس غریب کے دو چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی ہیں جو بمبئی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہیں - میرا دل اِس کی بے بسی پر بہت کڑھا اور بہت دیر تک نہ ٹھہرا - شام قریب تھی کہ جہاز نے لنگر اُٹھایا - آر کاٹی نے راہ بتائی - جہاز دھیمی رفتار سے چلنے لگا - مَیں دیر تک عرشے پر کھڑا نیلے پانی نیلے آسمان اور بعض ہوا میں اُڑتے ہُوئے جانوروں کی سیر کرتا رہا اور جہاز کو رحمتِ خُدا کے حوالے کیا +

سیّد علی سجّاد (دہلوی عظیم آبادی)

اخلاق ۔ مذہب ۔ قانون

اُن حکومتوں اور طاقتوں کے سوا جو انسانوں کی اپنی تجویز سے ترتیب دی گئی ہیں اور جنہیں شخصی یا جمہوری حکومتیں کہا جاتا ہے ۔ اور بھی ایسے چند ضابطے ہیں جنہیں ایک جامع حکومت یا جامع طاقت کہا جا سکتا ہے ۔

جیسے شخصی اور جمہوری طاقتیں یا حکومتیں کسی نہ کسی ضابطے یا اصُول کی تابع ہوتی ہیں ایسے ہی چند ضابطے بھی کوئی نہ کوئی اصُول یا مخرج رکھتے ہیں ۔ منجملہ اُن کے اکثر سے لوگ آشنا ہیں اور اکثر سے ناآشنا ۔ گو کُل یا بعض افراد ایسے چند ضابطوں سے ناواقف اور ناآشنا ہی ہوں تاہم اُن کے تصرف اور دخل و قبض سے باہر نہیں ہیں ۔

انسان بسا اوقات جن طاقتوں یا جن اثروں سے انکار کرتا ہے ۔ دراصل وُہ اُس پر غالب اور موثر ہوتے ہیں ۔ اُسکا انکار یا تو تجاہلِ عارفانہ ہے اور یا ایک فریب دہ قیاس ۔ بہت سے مریض ڈاکٹر کے دریافت کرنے پر کہا کرتے ہیں کہ بلا کسی اندرونی یا خارجی عارضے کے یہ عارضہ عارض ہو گیا ہے ۔ لیکن اُن کا ایسا کہنا بسا اوقات غلط ثابت ہوتا ہے ۔ جب ہم دُنیا جائے اسباب مانتے ہیں تو کوئی فعل یا کوئی اثر بغیر سبب کے نہیں ہونا چاہئیے[۱] ۔

جن جن ضابطوں کی جانب ہم نے اُوپر اشارہ کیا ہے اُن میں سے نوعِ انسان کے متعلق تین ضابطے زیادہ تر مشہور اور مروّج ہیں ۔

الف ۔ اخلاق ۔

[۱] بہت سے واقعات اور کیفیات ہیں کہ جنکا وقوعی یا حدوثی سبب ہمیں معلوم نہیں اور ہم نہیں جانتے کہ اس واقعہ یا اس کیفیت کا ظہور کیونکر ہوا ۔ اور وجوُد کیسے عمل میں آیا ۔ دراصل ہمارا علم بذاتہ محتاج اور محدُود ہے اگر ہمارا علم محتاج اور محدود نہ ہوتا تو شاید یہ فتوے دیدیتے کہ دنیا کا کوئی کام بھی بغیر سبب کے نہیں ہوتا ۔

ب - مذہب -

ج - قانون -

ان تین ضابطوں کی تمام انسانی گروہوں پر حکومت اور تصرف ہے کوئی قوم اور کوئی مُلک ان ہر سہ ضوابط اور اُن کے اثر سے خالی نہیں کوئی سا ملک اور کوئی سی قوم لے لو ان تینوں میں سے کسی نہ کسی شق سے متعلق ہو گی[1] - یہ جُدا بات ہے کہ کسی مقام میں یہ ہر سہ ضابطے مکمّل ہوں اور کسی میں نامکمل - کسی میں ان کی بُنیاد احسن وجُود پر مبنی ہو اور کسی میں ناقص ہو - اِن ہر سہ ضوابط کی کوئی نہ کوئی غرض ہوتی ہے یا یہ کہ اِن ہر سہ کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور ہونا چاہیئے جب یہ موثرہ ہیں تو ضروری ہے کہ اِن کے آثار ہوں - اور اُن آثار سے کوئی قوم خاص اوصاف یا خیالات سے متّصف سمجھی جاوے - ہر فرد قوم یا ہر مجموعہ قوم کی نسبت یہ بحث کیجا سکتی ہے کہ -

الف - اُس کی حالت مہذّب اور سلیم ہے -

ب - اُس کی حالت بَین بَین ہے -

ج - وہ اکثر امور اور اکثر شرائط میں گری ہوئی ہے -

دُوسرے الفاظ میں ان حالات کی تعبیر یُوں بھی کیجا سکتی ہے -

(۱) ایک قوم وحشت سے ہٹ کر بہت دُور جا رہی ہے -

(۲) کچھ وحشت میں ہے اور کچھ اُس سے دُور -

(۳) سراسر وحشت میں ہے -

یہ سوال کیا جائے گا - کہ

"کیا کوئی فرد قوم یا مجموعہ قوم صرف وجُودِ اخلاق سے اِن اوصاف سے متّصف ہو سکتا

---

[1] کبھی ان میں سے کسی فرد کی سی قوم اور کسی ملک پر جُداگانہ حکومت ہوتی ہے اور کبھی بحیثیت مجموعی سب افراد ان کے زیر نگین ہوتے ہیں - کبھی ان میں فی الجملہ اتحاد ہوتا ہے - اور کبھی فی الجملہ نفاق - کبھی ان میں تمیز کیجاتی ہے اور کبھی نہیں اس خوبی سے ملا دیا جاتا ہے کہ نمایاں فرق اور نمایاں تمیز باقی نہیں رہتی - اور ایک ہی نام تعیین کیا جاتا ہے ۱۲

اور بوجہ عدم وجود اخلاق ان اوصاف سے دُور جا پڑتا ہے "

یا ۔ " مذہب ان سب امور کا حامی اور جامع ہے "

یا ۔ " قانون ان کا موئید اور سر چشمہ ہے "

یا ۔ " یہ تینوں بہیئت مجموعی عامل ہیں "

قبل اس کے کہ ہم ان میں سے ہر ایک صورت کی نسبت بحث کریں یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ عملی اعتبارات اور موثرہ حالات کے اعتبار سے ان تینوں میں کیا کچھ فرق ہے ۔ یا انکی جداگانہ تعریفیں کیا کیا ہیں ۔ یا ان میں کوئی نسبت ہے ۔

اخلاق سے وُہ حالت یا وُہ طاقت مراد ہے یا اخلاق وہ فلسفہ ہے جس سے انسان اپنے قوائے طبعی کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھتا اور ان امور یا باتوں سے آگاہی پاتا ہے جو اُسے خود اپنی ذات یا اغیار کے مقابلے میں موجودہ ہستی یا زندگی میں آسائش ۔ راحت ۔ مسرت ۔ عزت ۔ اعتبار کی حیثیت سے عمل میں لانا ضروری یا لابدی ہیں یا اخلاق وہ شریعت اور وہ قانون ہے جو اسکی قوتِ ضمیری سے ترتیب پاتا ہے[۱]۔

مذہب وُہ قانون ہے جو باحفاظ اخلاق یا تصرفاتِ ضمیری ایک اعلیٰ طاقت علت العلل کے منشا اور ذات تک انسان کی رسائی کرانا چاہتا اور اُن ہدایات سے آگاہی بخشتا ہے جو اس منزل تک اُس کی رہنما ہو سکتی ہیں ۔

قانون وُہ ضابطہ ہے جو کسی سوسائٹی یا حکومت یا جماعت سیاسی کی جانب سے اُن امور اور اُن اغراض کی تکمیل اور احفاظ کے واسطے ترتیب دیا جاتا ہے جس سے

[۱] جس طرح لوگ ہنسی اور مسرت میں فرق نہیں کرتے ہنسی کو مسرت اور مسرت کو ہنسی سمجھ لیتے ہیں ۔ اسی طرح خوش خوئی اور اخلاق میں بھی تمیز نہیں کیجاتی ۔ جو لوگ خوش خوئی میں ملکہ رکھتے ہیں انہیں کہا جاتا ہے کہ وُہ بڑے بااخلاق ہیں ۔ حالانکہ وُہ اخلاقی حلقہ سے بہت دُور ہوتے ہیں ۔ خوش خوئی اخلاق کا ادنیٰ نہیں ہے ۔ خوش خوئی ایک روش یا زیادہ سے زیادہ ایک عادت ہے ۔ خلاف اس کے اخلاق وُہ طاقت یا وہ فلسفہ ہے جو قوت ضمیری سے بہت کچھ نسبت رکھتا ہے ۱۲

کسی سوسائٹی ۔ کسی حکومت اور کسی جماعت سیاسی کے قواعد ۔ احکام ۔ رسم و رواج اور حقوق مسلّمہ کی حفاظت تکمیل ۔ نگرانی ۔ تقسیم ۔ تاویل ۔ انتقال یا پابجائی اور ترمیم یا تبدیل عمل میں آتی ہے[۱۵]۔

ان ہر سہ شقوق میں نسبتاً کچھ نہ کچھ نسبت پائی جاتی ہے ۔ گو فلسفہ اخلاق مذہب کی تعریف میں نہیں آسکتا ۔ لیکن مذہب نئے مسلّمات یا اغراض میں سے اکثر مسلّمات اور اکثر اغراض کی تعلیم دیتا ہے اور اُن کا حامی ہے ۔ اسی طرح مذہب بہت سے اصُولوں اور اغراضِ اخلاقی کا مؤید اور حامی ہے ۔ قانون اُس حد تک اخلاق اور مذہب کا تتبّع کرتا ہے ۔ جہاں تک اُس کے اپنے اغراض قائم رہتے نظر آتے ہیں ۔ گویا قانون میں خود غرضی خود پرستی اور خود ستائی اور خود حفاظتی بہت ہے ۔ قانون اپنی حفاظت خود بھی کرتا ہے ۔ اور اپنے ماننے والوں سے یہ بھی چاہتا ہے کہ وُہ بھی اُس کی حفاظت اور تعظیم کریں ۔ قانون کا نہ ماننا اُس کی حفاظت اور تعظیم نہ کرنا ہے ۔ اخلاق اور مذہب خلاف اس کے یہ تعلیم دیتے ہیں کہ وُہ اپنے حامی اور حافظ آپ ہیں وُہ بذاتہٖ قائم اور موجود ہیں ۔ اُن کا قیام اور اُنکی موجودگی یا اُن کی تکمیل اور آبرو بذاتہٖ ثابت ہے ۔ اُن کے ماننے اور اُن کی تعظیم کرنے سے ماننے والوں

۱۵ اخلاق یا مذہب میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ یقینیات کا درجہ رکھتا ہے ۔ قانون اپنے واضعین کی تبدیلی یا اغراض واضعین کی تبدیلی سے ترمیم یا تبدیل ہوتا ہے ۔ اخلاق کی بنیاد یقینیات اور مسلّمات قطعی پر ہے ۔ خلاف اس کے قانون کی بنیاد اغراض واضعین اور قیام واضعین اور رعایا یا اجزائے حکومت کے رسم و رواج اور خیالات یا حالات موجودہ پر بہت کچھ انحصار رکھتی ہے ۔ قانون اپنی بھی منوالیتا ہے اور دُوسروں کی منوابھی ہے ۔ اُس کا وجود اور قیام اپنی ذات پر بھی موقوف ہے اور دُوسروں کی ذات پر بھی اس کی ہستی بہت کچھ انحصار رکھتی ہے ۔ قانون اُن اغراض کا بھی کفیل و وکیل ہوتا ہے جو پولیٹکس کے اغراض کہی جاتی ہیں کوئی قانون ان اغراض سے خالی نہیں ہوتا ۔ اخلاق اور مذہب پولیٹکس سے بہت کم مناسبت رکھتے ہیں چونکہ پولیٹکس کے اغراض بھی تغیر پذیر ہیں اور قانون بھی بہت کچھ تغیرات رکھتا ہے ۔ اِسواسطے اِن دونوں میں مناسبت کا ہونا ضروری تھا ۔ اکثر اوقات پولیٹکس کے اغراض اخلاق کُش اور کافر مذہب ہوتے ہیں ۔ اور وقت پرستی میں مشاق ۔ لیکن اخلاق اور مذہب بہت کم ان راہوں سے گذرتے ہیں ۔

کی وقعت اور حرمت میں ترقی ہوتی ہے اور نہ ماننے سے اُن کی اپنی وقعت اور حرمت میں فرق آتا ہے۔

اس بحث میں ہمارا رُوئے سخن اس طرف ہے کہ کوئی فرد یا مجموعۂ قوم تعظیم یا تسلیم اخلاق کے ان اوصاف سے متصف ہو سکتا ہے۔ جو ترقی اور تہذیب اور پاکیزگی کا موجب یا سرمایہ ہیں۔ یا مذہبی پابندی سے یا قانونی قیود سے۔ یا ان تینوں کی تکمیل اور تعظیم سے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قانون کی تعظیم یا تسلیم اور تعمیل سے کوئی قوم یا فرد قوم عمدگیاں حاصل کر سکتا ہے۔ یا کوئی قوم ایک مہذب اور ترقی یافتہ قوم بن سکتی ہے۔ یا قانون کی حمایت سے کسی قوم میں آثار نیک پیدا ہو سکتے ہیں۔ سو یہ ایک ایسا نکتہ فلسفہ ہے۔ جو کسی صورت میں بھی نتیجہ خیز نہیں۔ قانون جسموں پر حکومت کرتا ہے نہ کہ دلوں پر۔ فیصدی دس آدمی بھی قانون کی بہ حیثیت ایک عمدہ قانون ہونے کے تعظیم نہیں کرتے ہیں گو کوئی قانون بہ حیثیت ایک قانون ہونے کے بذاتہ کتنا ہی اچھا ہو لیکن اس کی حکومت اور نگرانی اغلاط اور اسقام سے خالی نہیں ہوتی۔ قانون دانوں اور دُور اندیشوں کے قبضے سے نکل کر تعمیل کے واسطے جاہلوں کے ہاتھ میں دیا جاتا ہے۔ قانونی میدان میں تاویلات کی ایک دُوسری حکومت ہے۔ جو اس کی اصلیت اور حقیقت پر خوفناک حملے کرتی ہے۔

قانون بیشک یہ حکم دیتا ہے کہ میں ملزموں اور مجرموں کا حامی نہیں ہُوں لیکن اس کے ساتھ ہی اُس کے حاشیے میں لکھا ہوتا ہے۔ "اگر تم مجھ سے بچ سکتے ہو تو میں تمہیں کوئی مواخذہ نہیں کرونگا۔" چُونکہ قانون پر شکوک اور اوہام کی سخت حکومت ہے اسواسطے وُہ ایسا کہنے کے لئے مجبُور ہے۔

قانون لوگوں کے پیچھے پیچھے چلتا اور اُن کی پیروی کرتا ہے۔ جو لوگ یا جو قومیں قانون کی تعظیم اور حمایت نہیں کرتیں اُن کے گھروں اور اُن کی عدالتوں میں

قانون اپنی ہستی چھوڑ کر اُن کے رنگ میں رنگا جاتا ہے[۵۱]۔

قانون کی یہ غرض نہیں ہے کہ لوگوں اور محکوموں کا اپنے تئیں ایک اخلاقی معلم ثابت کرے بلکہ یہ کہ ایک خاص دائرے میں اُن خاص اغراض سے امن وامان قائم رکھے جو اُس کی حدودِ حکومت میں ہے۔ قانون ایک پہرہ دار۔ یا ایک ہوشیار محافظ ہے۔ اُس کا فرض حفاظت کرنا ہے۔ نہ یہ کہ جن کے گھروں کی حفاظت کرتا ہے۔ اُن میں کیا کچھ بھرا ہے۔ سیاسی تاریخیں بتلاتی ہیں کہ کوئی قوم محض قانون کی طفیل کبھی مہذب اور شائستہ نہیں ہو سکتی۔ سیاستِ قانون یا جیل کی فہرستیں اور جرمانوں کی مثلیں۔ سزاؤں کے کاغذات یا احکام وضاحت سے بتلا سکتے ہیں کہ قانونی شروط یا قیود سے لوگوں میں شائستگی اور صلاحیت کہاں تک آتی ہے اور لوگ کس درجے تک قانونی مواد سے صالح یا نیک بننے کی کوشش کرتے ہیں[۵۲]۔ جب کوئی خارجی قوم کسی دوسری قوم اور دوسرے ملک پر حکمران ہوتی ہے تو قانون کی نئی بنیاد رکھتی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ لوگوں کی آئی صلاحیت کی خاطر قانون نہیں بنایا جاتا۔ بلکہ حکومت جدید کی بابجائی اور اپنے کام کی خاطر۔ اگر چند امورِ صلاحیت کے بھی اس میں شامل ہوتے ہیں تو وہ اُس کی اصلی غرض فوت نہیں ہونے دیتے

ایک حکیم سے پوچھا گیا تھا :۔

---

[۵۱] یہ مسئلہ کہ اصل کس [illegible] قانون میں بذاتہ کوئی صداقت اور جوہر [illegible] نہیں ہے۔ یا قوانین [illegible] نہ ہی کسی [illegible] ہو اور یا لوگوں کے رواجات [illegible] سے اخذ کیا جاتا ہے [illegible] پیروی کرتا ہے ۱۲

[۵۲] ہمارے ہندوستان میں [illegible] سے فوجداری اور دیوانی مالی تنازعات [illegible] جیل خانوں کی سالانہ رپورٹیں اس اظہار کے لئے [illegible] ہیں کہ خلافِ صلاحیت دن بدن جرائم اور مجرموں کی تعداد میں ترقی ہے۔ جو اس امر کا زندہ ثبوت ہے کہ [illegible] صلاحیت کا حامی یا کفیل نہیں ہے۔ قانون سیاسی معنوی مواد و جزئیات کی بازپرس نہیں کرتا لیکن اخلاق [illegible] مذہب معنوی مواد و جزئیات کی بھی بازپرس کرتا ہے ۱۲

"لوگ قانون سیاسی کی جانب کب رجوع کرتے ہیں یا کن لوگوں میں سیاسی قوانین کی حکومت ہوتی ہے۔"

حکیم موصوف نے کہا کہ — "انہی لوگوں میں سیاسی قانون کی حرمت اور تعظیم ہوتی ہے جو اخلاقی ورنہ مذہبی قانون سے فی الجملہ دور جا پڑتے ہیں۔ جن قوموں کے اخلاق اچھے ہیں اُن میں سیاسی قانون محض بیکار ہے۔"

[illegible] یہ حکم اگر [illegible] نہیں ہے [illegible] چونکہ قانون سیاسی عیوب پر ملامت نہیں کرتا۔ اسواسطے لوگوں کے دل درست نہیں کر سکتا۔

اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم میں [illegible] اور ہم ترقی یافتہ قوموں کی طرح ہو جاویں تو اسکا علاج یہ نہیں ہے کہ ہم قانون سیاسی کی حمایت [illegible] بلکہ یہ کہ بوجہ اخلاقی اور مذہبی حمایت کے قانون سیاسی سے ہمیشہ [illegible] ہو جاویں۔ جب قانون سیاسی [illegible] سکھاے تو ہم اُسکے جواب میں کہیں:—

"آپ کی مہربانی۔ ہمیں آپ کی کوئی ضرورت نہیں جب آپ کی حمایت خود اپنے تئیں تو نہیں بچا سکتی۔ تو ہمیں کیا بچا سکیگی۔"

ایک پورا مقولہ ہے:— "جو قانون سیاسی کی نظر [illegible] وہ [illegible] حکومت کرتا ہے۔"

[illegible] اس کا یہ ہے کہ وہ حکومت کی دست برد سے محفوظ و مامون رہتا ہے۔ اس سے [illegible] یہ قول ہے جو اخلاقی قوانین اور مذہبی قیود کی عزت کرتا ہے وہ قانون سے بالکل مستغنی [illegible] ہے اور حکومت کی اُن ضوابط سے [illegible] ہے جو اُس کا حق ہیں۔ لوگ [illegible] اخلاقی مجموعہ ہے جس کی [illegible] ہیں۔ آیا اُس کا وجود کتابوں [illegible]

[illegible] ترقی سے مراد کثرت دولت و ثروت نہیں ہے بلکہ وہ حالت [illegible] اور صلاحیت سے حکومت کرتی [illegible] اور اندرونی دونوں طمانیت بخش ہوتی ہے ۱۲

بعض رسائل میں ہے یا لوگوں کے سینوں اور دماغوں میں تلاش کریں۔ اُن میں اختلاف ہو جیسے کہ مذاہب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ خلاف اِس کے قانونِ سیاسی میں وقت مقررہ کے واسطے ایسا اختلاف تو نہیں۔ میں کہتا ہوں نہ کتابیں ڈھونڈو۔ نہ رسائل کی گھڑ دوڑ میں شامل ہو۔ نہ سینے ٹٹولو اور نہ دلوں کو جانچو۔ نہ دماغوں میں چھان بین کرو اور نہ اِدھر اُدھر بھٹکو۔ اخلاق کی کتاب کشادہ ہے۔ اور تمہارے دل ہی سے اُس کی بُنیاد پڑی ہے۔ اگر تم غور کرو گے تو تمہارا اپنا دل ہی تمہارے لئے ایک مہربان اُستاد کا کام دیگا۔ کیا جب کبھی تم نے کوئی بد ارادہ کیا ہے اُسوقت تمہارے اندر و نے سے کوئی مزاحم صدا نہیں آئی۔ سچ کہو گھڑی کی طرح کتنی دفعہ ٹک ٹک کی آواز آئی تھی۔ یہی اخلاقی سبق ہے جو تمہیں ہر گھڑی مل رہا ہے۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

اِس کے سوائے قدرت نے تمہارے سامنے ایک اَور نظائر کی کتاب کھول رکھی ہے اُسے غور کی نگاہوں سے دیکھو۔ اخلاقی فلسفہ اخلاقی کتابیں تمہارے ہی افعال اور اعمال کا نچوڑ ہیں۔ تم جو کچھ کرتے ہو ایک فلسفی انہیں ایک ضابطہ کی صورت میں لاکر باعتبارِ سودمندی اور ناسودمندی کے تمہیں دکھاتا ہے۔

اخلاقی فلسفہ تمہیں مذہبی فلسفے سے مستغنی نہیں کرتا۔ بلکہ وُہ مذہبی فلسفے کا حامی اور مؤید ہے ایسے ہی مذہب بھی اخلاقی فلسفہ اپنے میں لئے ہُوئے ہے۔ جب قومیں اور افرادِ قوم اخلاق سے گر جاتے ہیں۔ اور اُن میں اخلاق کی وقعت حُرمت باقی نہیں رہتی۔ تو اُس کا نتیجہ مذہبی نفرت ہوتی ہے۔ مذہب اخلاق میں سوائے اِس کے کچھ آمیزش نہیں کرتا ہے۔ کہ اخلاقی فلسفہ اُس حالت میں بہمہ وجوہ قابلِ حرمت و قابلِ تعظیم ہے۔ جب اس میں وجُود باری جزو اعظم ہو۔ اخلاق ضمیر سے نشوونما پاتا ہے۔ اور اُس کا آوردہ بھی ہے۔ کوئی ضمیر وجود باری کے خیال سے معرا نہیں ہے۔ ہر ضمیر اُس پر شاہد ہے۔ ضمیر ہی نہیں بلکہ ساری مخلوق اُس کی ضرورت اور وجُود کو ثابت کر رہی ہے۔ جسے ساری مخلوق معرضِ اظہار میں لا رہی ہے۔ وُہ ایک چھوٹے

سے ضمیر میں ودیعت کیا گیا ہے۔ ھ

پرتو حُسنت نہ گنجد در زمین و آسماں

در حریم سینہ حیرانم کہ چوں جا کردۂ

یہ مطلب نہیں کہ اخلاقی فلسفہ میں خُدا کا ذکر نہیں ہے۔ یا وُہ اُس سے مُنکر ہے۔ بحث یہ ہے کہ جب بالخصوص خُدائی طاقتوں اور خُدائی اوصاف کی حیثیت سے اخلاق کی نسبت بحث ہوتی ہو۔ تو اُسے مذہب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ورنہ مذہب اور اخلاقی فلسفہ دو نہیں ہیں۔ اگر کبھی اُن میں مغایرت پیش کیجاتی ہے۔ تو وُہ مبلغ علم کا قصور ہے۔ بلکہ بحیثیتِ حقیقت الامر جب کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ مذہب[1] کی کیا ضرورت ہے کیوں اُس کی پابندی کیجاوے تو دُوسرے الفاظ میں اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ کیوں اخلاق کی پابندی کیجاوے۔ اُس کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم کہیں کہ کیا اخلاق کی ضرورت نہیں ہے تو ہر کہ ومہ کہہ اُٹھیگا کیوں ضرورت نہیں۔ سخت ضرورت ہے۔ صرف الفاظ کے ایر پھیر سے دراصل مذہب سے انکار کیا جاتا ہے۔ یا اُس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ ورنہ سب اُس کی ضرورت محسُوس کرتے ہیں۔ سب کی خواہش ہو کہ آزاد ہو جاویں۔ اور کوئی پابندی نہ رہے۔ لیکن یہ بہت مشکل ہے جو اپنے تئیں آزاد سمجھتے ہیں۔ وُہ قیدِ مذہب یا قیدِ اخلاق سے نکل کر اَور بھی ناگفتہ بہ مشکلات میں پھنس جاتے ہیں۔ کیا کوئی شخص اس دُنیا میں آزاد مطلق ہے؟ کوئی نہیں۔

کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مَیں پابند نہیں ہُوں۔ کوئی نہیں۔

اَوروں کا تفنید اور پابندی جُدا رہنے دو اپنی رائے کی پابندیاں ہی دم نہیں لینے دیتیں خیالات اور آرزو کی پابندی یا قید کیسی خوفناک پابندی یا قید ہے۔ پہلے اس سے رہائی کا پروانہ

---

[1] ہم اس مضمون میں یہ بحث نہیں کرینگے کہ مذہب کی ضرورت کہاں تک ہو۔ اور خود انسان کی قوتِ ضمیری انسان کو اس ضرورت کی طرف کس حیل سے لیجاتی ہے۔ ہم نے اس ضرورت کی بابت "رسالہ المذہب" میں مفصل بحث کی ہے۔ یہاں اس کا اعادہ ضروری نہیں سمجھتے ۱۲

ے لو پھر اخلاق اور مذہب کی پابندی سے نکلنے کی کوشش کرنا۔ ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی

کہ با آسماں ہم بپرداختی

کوئی قوم اور کوئی فردِ قوم اُسوقت تک ترقی یافتہ نہیں کہلا سکتا جب تک اُس کے اخلاق درست نہ ہوں۔ اور کوئی اخلاقی نصاب اسوقت تک اثر رس نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اُس میں مذہبی رُوح نہ ہو۔

تعلیم ایک روشنی ہے لیکن جب تک یہ روشنی اخلاقی منابر اور مذہبی معابد پر نہ پڑے اور اُن سے احساس کر کے نہ آئے تب تک اسے وُہ کمال نہیں حاصل نہیں ہو سکتا جس کی ضرورت ہے۔

تعلیم قواعد کا مجموعہ ہے اور اخلاقی سبق عمل ہیں۔ صرف علم کام نہیں دے سکتا۔ عمل کی سخت ضرورت ہے۔ سوچو اور سمجھو سیاسی قانون نے تمہارے افعال اور اعمال کی کہاں تک درستی کی ہے۔ اور تمہارے ذاتی نظائر نے تمہارے دیگر ابنائے جنس پر کیسا اثر ڈالا ہے۔ ہم میں سے ایک دوسرے کے واسطے ایک نظیری قانون ہے۔ کیا اس صورت میں ضرورت نہیں کہ ہم میں اچھی نظیریں پائی جاویں +

میرزا سلطان احمد

حکایاتِ لقمان منظوم (حصۂ اوّل) اس کتاب کے مُصنف ہمارے محترم خانصاحب پیرزادہ مولوی محمد حسین صاحب عارف صدیقی ایڈیشنل سشن جج ملتان ہیں۔ اس میں ایسپ کی مشہور حکایات اور پند لقمان کا صاف اور سلیس ترجمہ اُردو خوان طبقے کی دلچسپی کے لئے کیا گیا ہے اور دیباچے میں ایسپ اور حکیم لقمان کی ذات پر نہایت وضاحت سے بحث کی گئی ہے۔ ہمارے رائے میں یہ کتاب تعلیم اطفال کے لئے بہت مفید ہے۔ کاغذ اور لکھائی چھپائی عمدہ ہے۔ قیمت فی جلد ۸؍ (مصنف سے دستیاب ہو سکتی ہے)

دماغ

یُوں تو قدرت کی ہر بات میں کچھ نہ کچھ حکمت مضمر ہوتی ہے۔ اور نکتہ سنج اور ذہین طبائع اس سے کچھ نہ کچھ نتیجہ اخذ کر لیا کرتی ہیں لیکن اغلباً سب سے بڑھکر دلچسپ اور قابلِ غور انسان کی اپنی بناوٹ ہے۔ اس پر جتنا غور کیا جاتا ہے اسی قدر اس میں وہ وہ عجائبات اور قدرت کی کاریگریاں پوشیدہ ملتی ہیں جو ایک سلیم دل کے لئے صنعِ ربّ العالمین کی بیّن اور زندہ مثالیں ہیں۔ اگر تھوڑا سا غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بناوٹ میں ایسی باریکیاں اور پیچیدگیاں ترکیب دی گئی ہیں کہ جیسا انکا مثل بنانا ناممکن ہے ویسا ہی فہمِ انسان کے لئے انکی ماہیت کو کما حقہ سمجھنا اگر ناممکن نہیں تو ممکن سے بھی بہت دُور ہے۔

سب سے پہلے آپ انسان کے دماغ ہی کو لیں جسکی بدولت حکمت کی شعاعیں اطرافِ دنیا میں جہالت کی ظلمت کو دُور کر چکی ہیں اور کر رہی ہیں اور جو تمام انسانی احساس اور ادراک کا مرجع اور مرکز ہے۔ عالمانِ علم فزیالوجی نے اسکے تین حصے کئے ہیں جن پر انسان کے مختلف حرکات و سکنات و افعال منحصر ہیں۔ یہ سفیدی لئے ایک نرم مادہ ہوتا ہے۔ آپ یہ ناقابلِ یقین بات کر کے حیران ہونگے کہ اس تھوڑے سے مادہ کی بناوٹ میں اس قدر رگوں کا تار پود لگا یا گیا ہے۔ کہ زمانہ حال تک جتنے سیارے اور ستارے علم نجوم کی معرفت دریافت ہوئے ہیں وہ تعداد میں ان رگوں سے بدرجہا کم ہیں۔ ان عجیب و غریب آلہ احساس و ادراک کی نزاکت کے بارے میں یہ کہدینا کافی ہوگا کہ ایک مشاہدہ کنندہ نے تجربے سے دریافت کیا ہے کہ اگر ایک بچہ دُھوپ میں لیٹا ہوا ہو اور آفتاب کے سامنے بادل آ جائے تو بچے کے حرکاتِ تنفس اور نبض کی رفتار میں فرق پڑ جائیگا۔ اور اگر اس کے دماغ کو دیکھ سکیں تو معلوم ہوگا کہ اگر ایک روشن لیمپ اسکی آنکھوں کے سامنے لایا جائے تو اسکا دماغ جسامت میں پھول جاتا ہے۔ اور چونکہ اس کی نزاکت اس قدر زیادہ ہے اس لئے بیرونی اثرات کے جذب کرنے میں اس کی قوت دیر تک ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ تمام احساس کی قوت اثری میں ایک باقاعدہ جزر و مد واقع ہوتا رہتا ہے کسی چیز پر توجہ ایک منٹ بلکہ نصف منٹ تک ایک ہی حالت میں قائم نہیں رہ سکتی۔ مثلاً اگر ہم گھڑی کو اپنے

کان کے پاس لاویں تو باوجود ہماری کوشش کے اس کی ٹک ٹک کی آوازیں سے بعض آوازیں ہم نہیں سُن سکینگے - یا اگر ہم خاکی رنگ کی ایک مدوّر تختی کو محور کے گرد گھومتے ہوئے ٹکٹکی باندہ کر دیکھیں تو کبھی وُہ ہم کو شوخ اور کبھی ہلکے رنگ کی نظر آئیگی - بعض تجربہ کنندگان نے مختلف حواس میں کم وبیش ہونے کے اوقات مقرر کئے ہیں - چنانچہ قوتِ باصرہ ۳ سے ۴ ر ۳ سیکنڈ تک ایک حالت میں رہ سکتی ہے اور قوتِ سامعہ ۵ ر ۳ سے ۴ سیکنڈ تک -

اس دماغی جذب اثر کی بابت تو بعض باتیں بالکل ناقابلِ یقین ہیں - اینٹیلیز کی حبشی اقوام کی بابت بیان کیا جاتا ہے - کہ ان کی قوتِ شامہ اس قدر تیز ہے کہ وُہ صرف نقش پا کے سُونگھنے سے دریافت کر سکتے ہیں کہ آیا یہ کسی فرانسیسی کے ہیں یا حبشی کے - اسی طرح پیرو کے ہندوستانی کسی آتے ہوئے شخص کی قومیت محض سُونگھنے سے معلوم کر سکتے ہیں -

جس طرح جاہل اقوام قوتِ شامہ میں فوقیت رکھتی ہیں اسی طرح مہذب اقوام کی قوتِ ذائقہ بہت تیز ہوتی ہے - چنانچہ اہلِ رُوما کا ایک خاص عیش پسند فرقہ اس بات کا دعویدار تھا کہ وُہ صرف چکھنے سے دریافت کر سکتے ہیں کہ یہ مچھلی کہاں سے پکڑی گئی تھی اور خرگوش شکار ہونے کے وقت کونسے پہلو پر لیٹا ہوا تھا -

یہ امر خاصیت میں زیادہ تر فوٹوگرافی کی پلیٹ سے ملتا جلتا ہے یعنی جس طرح منفی شکل بیرونی اشیاء کی پلیٹ پر عکس ہو جاتی ہے - اسی طرح احساس اور ادراک دماغ کے پٹھوں پر ایک مستقل اثر چھوڑ جاتے ہیں اور جس طرح پلیٹ کی فلم پر سُورج کی شعاعوں کا اثر دیر تک قائم رہتا ہے - ویسا ہی دماغ پر بھی انکا اثر دیرپا ہوتا ہے - لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ ان دونوں مثالوں میں مماثلت تامہ ہے بلکہ یہ مماثلت صرف ان نتائج پر مبنی ہے جو کہ دونوں حالتوں میں ظہور میں آتے ہیں - مثلاً ہم نہیں کہہ سکتے کہ جیسے پلیٹ کی فلم پر تصویر ہو جاتی ہے ویسا ہی دماغ پر بھی احساس کا کچھ بدیہی نشان باقی رہ جاتا ہے -

اُستادانِ فن نے دماغ کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں معلوم کی ہیں - انسان میں بھی ایک قسم کی

قوتِ برقی موجود ہے - جس کی یا تو اپنی طرف کھینچنے والی یا اپنے سے دُور کرنے والی لہریں ہمیشہ جاری رہتی ہیں اور یہ ایتھیر کی لہریں دماغ کے نہایت ہی نازک ہونے کی وجہ سے ایک انسان سے خارج ہوکر دوسرے انسان کے دماغ پر اثر کرتی ہیں - اگر ایک آدمی کی مثبت طاقت دُوسرے آدمی کی منفی طاقت کی نسبت زیادہ ہوگی تو اوّل الذکر آخر الذکر کے دماغ پر کوشش اور توجہ سے بہت سا اثر ڈال سکتا ہے - اسی اثر کا نام علم مسمریزم یا علم سلیمیا ہے -

غرضکہ قدرت کے اس چھوٹے سے کرشمے سے وُہ وُہ علم کے دریا بہے ہیں اور بہینگے کہ جن کا علم اُسی سمیع و علیم کو ہو سکتا ہے - مگر کتنے ہیں جو اپنے ایسے قیمتی جوہر کی جو کہ ان کے صدفِ جسم میں نہاں ہے پُوری پُوری خبر گیری کرتے ہیں اور اس دُرِ بے بہا سے پُورا پُورا فائدہ اُٹھاتے ہیں - بہت سے ایسے ہیں جو اس سے کام لیتے ہیں - مگر اس کثرت سے کہ کبھی اس کو رفعِ کسل کا موقع نہیں دیتے اور نہیں جانتے کہ اسی طرح وُہ تھک تھک کر ایک دن بالکل ناکارہ ہو جائیگا - اور بہت سے ایسے ہیں جو اس کی قدر و منزلت ہی سے محض ناآشنا ہیں - اُن کے لئے اس کا ہونا نہ ہونا یکساں ہے - اہلِ مغرب نے اس کی ماہیّت کو جانا اور اس سے کام لیا - اُدھر استقلال اور ہمّت نے سہارا دیا - الغرض ترقی کے فلک الافلاک پر آفتاب بنکر چمکے جس سے جہالت کی آنکھوں میں خیرگی آگئی -

خُدائے تعالےٰ نے اس کے نشو و نما کے لئے خود انسان میں اس کے وسائل بہم پہنچائے ہیں جو ایسے مشکل بھی نہیں - دَورانِ خون کی بابت خام خیال - خُونِ صالح پیدا کرنے کی کوشش پُوری نیند - اور تھکنے کے بعد آرام - یہ ہیں چند باتیں جس سے کہ ہم اپنے اس اعلیٰ اور نہایت ہی مفید عضو کی حفاظت کر سکتے ہیں - اور اس سے اچھی خدمتگذاری کے متوقع ہو سکتے ہیں -

میرزا معراج الدین

ریویو

آثار الصّنادید - نامی پریس کانپور کے باحوصلہ مالک منشی محمد رحمت اللہ رعد نے سرسید احمد خان مرحوم کی ابتدائی تصنیف کا ایک نہایت خوش وضع اور صحیح ایڈیشن تیار کیا ہے۔ اس ایڈیشن میں زیادہ تر آثار صنادید کے دوسرے ایڈیشن کا تتبع کیا گیا ہے جو سرسید نے اپنی زندگی میں بعد ترمیم و تنقیح کے شائع کیا تھا۔ لیکن پہلے ایڈیشن کی خوبیوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا۔ لکھائی چھپائی نہایت صاف اور کاغذ عمدہ ہے۔ تصاویر اور نقشہ جات پہلے ایڈیشنوں کی نسبت زیادہ اہتمام سے تیار کئے گئے ہیں۔ اور سرسید مرحوم کی تصویر ایزاد کر دی گئی ہے۔ اس کا سرورق خصوصاً قابل تعریف ہے۔ کیونکہ باوجود رنگین اور طلائی ہونے کے سادہ ہے۔ اصل کتاب کے محاسن سے چونکہ ایک زمانہ واقف ہے۔ اس لئے اُن کے اعادہ کی یہاں ضرورت نہیں۔ **قیمت** غالباً عہ ہے۔ جو تمام خوبیوں کو مدنظر رکھ کر کچھ زیادہ نہیں۔ جو اصحاب جو کتابوں کے بارے میں جانسن کی طرح نازک خیال ہوں اسے ضرور خرید کریں +

کرشن کنور - اس مختصر ناول کو حکیم برہم صاحب نے ایک مشہور افسوسناک تاریخی واقعہ کی بنا پر تصنیف کیا ہے اور بقول انکے اس ناول کے لکھنے سے انکا منشا یہ ہے کہ نواب امیر خاں صاحب بانی خاندان ٹونک پر سے کرشن کماری کے قتل کا الزام اُٹھ جائے۔ مگر جہانتک ہمارا خیال ہے حکیم صاحب موصوف کو اپنے اس منشا میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اوّل تو ہمیں اس امر سے اختلاف ہے کہ افسانہ نویسی کو تاریخی رائے کے اظہار کا ذریعہ بنایا جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے بعض دفعہ غلط خیالات عوام کے دل میں گھر کر لیتے ہیں۔ دوسرے جب حکیم صاحب خود بھی اعتراف کرتے ہیں کہ اس ناول کا کچھ حصہ میواڑ کی چارنوں اور کبیشروں کی زبانی بھی لیا گیا ہے جنکی صداقت کے وہ خود ذمہ وار بھی نہیں تو یہ نتائج پر کیسے اعتماد کیا جا سکتا ہے جنکا ماخذ اسقدر غیر معتبر ہو۔ علاوہ ازیں اُدہیم سنگھ والی اودیپور کی کمزوری ثابت کر دینے سے نواب امیر خاں بالکل بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ پلاٹ خاصہ دلچسپ ہے۔ زبان بھی اچھی ہے۔ مگر بعض جگہ طول کلام سے پڑھنے والے کی طبیعت اکتا جاتی ہے۔ اکثر کیفیتیں اور نظارے نہایت پُرلطف اور دلچسپ ہیں۔ گو انکی دلچسپی بھی بعض دفعہ ایک ہی تشبیہ کی تکرار اور حد سے زیادہ مبالغہ کی وجہ سے پھیکی پڑ جاتی ہے۔ خاتمہ واقعی دردناک اور پُرزور ہے۔ اور بقول میر مرحوم حکیم صاحب کی نازک خیالی دل میں نشتر کی طرح چبھ جاتی ہے۔ اس ناول کا حجم ۹۵ صفحہ ہے اور مینیجر ریاض الاخبار گورکھپور سے مل سکتا ہے۔ قیمت کتاب پر درج نہیں +

عالمِ پیری اور یادِ ایام

کیا لطف کے تھے وہ دن! کیا خوب زمانہ تھا! — طفلی کی وہ سب باتیں کیا پیارا فسانہ تھا
کھلتے تھے مزے سے گل ایامِ بہاراں میں — سرمست پرندے تھے ذوقِ سرِ الحاں میں
اب بھی ہیں چمن میں گل خوش رنگ بھی خوشبو بھی — شوخی بھی ہے سوسن میں نرگس میں ہے جادو بھی
پر آہ! عجب پیارے وہ گل تھے بنفشے کے! — وہ غنچے تھے کیا ننھے وہ پھول تھے کیا بانکے

دنیا میں بہت گھر ہیں۔ اور ایک سے ایک اچھا — پر گھر تھا وہ کیا پیارا ہم جب میں ہوئے پیدا
جب پہلے پہل دیکھا سورج کے اجالے کو — امبر کے ستاروں کو اور چاند کے ہالے کو
غم سے نہ تھی آگاہی فکروں سے فراغت تھی — جنت کی بہاریں تھیں آغوش میں مادر کی
جنت کا فرشتہ تھی ماں کی نگہِ الفت — اب یاد جسے کر کے روتے ہیں بصد حسرت

ہیں دوست بہت لیکن جو دوست پرانا ہے — جس دوست سے وابستہ طفلی کا زمانہ ہے
ملتا ہے تو ملتا ہے کس جوشِ محبت سے — تعریف جو کرتا ہے تو عین صداقت سے
شہرت کی حقیقت کیا! ایک پھول ہے بھڑکیلا — مطلق نہیں بو اس میں گو رنگ ہے چمکیلا
پر دوستی اک گل ہے راحت دہ نظارہ — جو بو میں ہے جاں پرور اور رنگ میں ہے پیارا

عشق اور بھی کرتے ہیں۔ وہ عشق مزے کا تھا — سو جاں سے جب ہم نے اے پیاری تجھے چاہا
پنکھڑی کی صورت سے کملا چلے اب ہم تم — ہاں وقتِ خزاں آیا مرجھا چلے اب ہم تم
پھل پھول ہمارے ہیں پر خوب تر و تازہ — ہے ان کے بھی چہروں پر طفلی کا وہی غازہ

گو نور نہیں باقی خورشید جوانی کا / ہے ان کے تبسم سے ہر سمت اُجالا سا

اگلا جو زمانہ تھا ویسا نہیں آسکتا / دھیان اُس کا کبھی دل سے اپنے نہیں جا سکتا

وہ گھر جو پُرانا ہے ایسا نہیں گھر کوئی / آرام کی جا ایسی آئی نہ نظر کوئی

ہے باغ وفا کا گُل ہر یار کہُن اپنا / شاداب رہے یارب دائم یہ چمن اپنا

دلبر نہیں دنیا میں بی بی سے کوئی بہتر / دکھ درد کی یہ ساجھی ہر حال میں یاور

(ماخوذ)

نیرنگ

خیالاتِ منظُوم

دل اُس بتِ فرنگ سے ملنے کی شکل کیا / میرا طریق اور ہے اُس کی ہے شان اور

کیونکر زباں ملانے کی حسرت بیاں کروں / اُس کی زبان اَور ہے میری زبان اَور

بہت دن گذرے یہ قطعہ نظم کیا گیا تھا مگر طبع نہیں ہوا

تعجب سے کہنے لگے بابو صاحب / گورنمنٹ سید پہ کیوں مہرباں ہے

اُسے کیوں ہوئی اس قدر کامیابی / کہ ہر بزم میں بھی یہی داستاں ہے

کبھی لاٹ صاحب ہیں مہمان اس کے / کبھی لاٹ صاحب کا وُہ میہماں ہے

نہیں ہے ہمارے برابر وُہ ہرگز / دیا ہم نے ہر صیغے کا امتحاں ہے

وُہ انگریزی سے کچھ بھی واقف نہیں ہے / یہاں جتنی انگلش ہے سب بر زباں ہے

کہا ہنس کے اکبر نے اے بابو صاحب
سنو مجھ سے جو رمز اس میں نہاں ہے
نہیں ہے تمہیں کچھ بھی سید سے نسبت
تم انگریزی داں ہو وہ انگریز داں ہے

کھڑے ہیں یار ششدر حیرت و عبرت کا مضموں ہے
نہ جنگل ہے نہ ناقہ ہے نہ لیلیٰ ہے نہ مجنوں ہے
وہ رنگِ بزمِ اکبر اب کہاں - بہتر ہے اُٹھ جاؤ
یہی بس ایک تدبیرِ سکونِ جانِ محزوں ہے

دلوں پر مغربی تہذیب ہی سکہ جمائیگی
بدی کے ساتھ اکثر نیکیوں کو بھی مٹائیگی
نئے پودوں کے آگے تنکے کا کیا چلتا ہے اکبر
انہیں جوبن اُبھاریگا تجھے پیری دبائیگی

اکبر الہ آبادی

کنوارپن

ادا و غمزہ و شوخی و عشوہ و انداز
نمودِ حسن جوانی اُبھار کا آغاز
نہ دل میں رازِ محبت نہ رمزِ ناز و نیاز
حیا کے بس میں ہے مرغِ شباب کی پرواز
کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

وہ حسن نور کا سانچہ وہ سادگی وہ جمال
وہ شرم اور وہ خجالت وہ نازکی وہ جمال
وہ بھولاپن وہ لڑکپن وہ کم سنی وہ جمال
سڈول جسم یہ وہ شکل موہنی وہ جمال
کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

وہ دیکھئے مس کم سن حسین لنڈن کی
کہ جس طرح کوئی گوپی کنواری مدھ بن کی
مزے سے لوٹ رہی ہے بہار گلشن کی
اسے خبر نہیں نرگس کے چشم پرفن کی

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

وہ بھوری آنکھیں غضب اُن میں مردمک وہ کبود وہ تیکھی چتونیں اور ان میں شوخیوں کی نمود
زری ہے آنکھ شرارت کی - آنکھ سے بے سود کہ ہے حجاب کے بس میں نگاہِ شرم آلود

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

نہالِ حسن میں اعجازِ قدرتی کی بہار جوابِ برگِ گُلِ تر وہ پھول سے رخسار
شعاعِ حسن میں انوارِ مہر پُر انوار نسیمِ صبح میں کیا دم کرے جو بوس و کنار

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

شعاعِ مہر سے رخشاں کمر کمر تک بال ادائیں بادِ بہاریں سے لطف خیز کمال
اور اُس پہ اُس سِن عیسیٰ نفس کی سادی چال کنواری بھولی برس بارہ تیرہ کا سن و سال

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

وہ نازنین سمن اندام خوبرو و حسین ہلال ابرو و بدرِ منیر جس کی جبیں
کنواری کمسن عصمت کی پیاری پردہ نشیں کہ نازِ حسن ہے کیا شے یہ جانتی ہی نہیں

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

نہ لب پہ شیون و فریاد ہے نہ آہ کا نام سُنا نہیں کبھی کانوں سے اُس نے چاہ کا نام
یہ جانتی نہیں کیا چیز ہے گناہ کا نام جھکاتی شرم سے گردن ہی سُن کے بیاہ کا نام

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

نہیں ہے فرق اُسے معلوم دوست دشمن کا سماں دکھاتی ہیں پلکیں نظر کو چلمن کا
اثر ہے چشمِ منور میں سحرِ پُرفن کا شباب میں بھی وہی ہے مزاج بچپن کا

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

نہ کوئی خضر ہے اس کا نہ کوئی رہزن ہے لبھاتا عام کے دل اس کا اچپلا پن ہے
شگفتگی یہ گُل نونہال گلشن ہے وہ چشمِ نرگسی اس میں حیا کا مسکن ہے

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

یہ گُل وُہ ہے جسے کرتی نہیں خزاں پامال یہ نخل ہے ثمرِ آرزو سے مالامال
یہ مال وُہ ہے کہ دُنیا کا مال ہے کیا مال یہ وُہ زمانہ ہے دائم جسے عروج وکمال

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

یہ شمع وُہ ہے اُٹھاتی ہے جسکے ناز نسیم یہ وُہ ہے موتی کہ صدقے ہے جس پہ دُرِّ یتیم
یہ وُہ بہار ہے جسکو خزاں کا خوف نہ بیم یہ وُہ ہے گلشنِ عفت کہ جس پہ لُطفِ کریم

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

کچھ اُس کے حُسن میں وُہ قدرتی لطافت ہے کہ بول اُٹھتا ہے دِل کیا خُدا کی قدرت ہے
گو جو ہے بھی تو پتلی پُر از نزاکت ہے گہر اُمنگ پہ طُرفہ بہارِ عصمت ہے

کنوارپن بھی عجب سادگی کا عالم ہے

گہر (لکھنوی)

شیونِ عروس

سو گیا بالش پہ سر رکھکر دمِ فکرِ سخن ناگہاں آئی نظر اِک لُعبتِ سیمیں بدن
اُلجھے سُلجھے بال مستانہ ادا۔ متوالی چال تیکھی چتون۔ گورے گورے گال۔ چھوٹا سا دہن
ننھی ننھی انگلیاں۔ پتلی کمر۔ بوٹا سا قد اُس پہ سونے میں سہاگہ جامہ زیبی کی پھبن
گوری گوری ساق سیمیں۔ پیاری پیاری ژپاں قد چھریرا۔ جسم سانچے میں ڈھلا۔ نازک بدن
ننھے ننھے دانت۔ کلیاں موتیا کی خوشنما پتلے پتلے نرم و نازک ہونٹ۔ برگِ یاسمن

تھے لبِ رنگیں پہ مستی کی اداہٹ کے نشاں — اُودے اُودے فالسوں کا تھا شگفتہ اک چمن
دوش پر زرکش ردا - چہرے پہ زرّینہ نقاب — سیم قامت - سیمبر - سیمیں بدن - سیمیں ذقن
لب میں تھی جاں پروری - آنکھوں میں سحرِ سامری — قد میں تھی فتنہ گری - رفتار میں تھا بانکپن
رُخ کی افشاں کا عجب عالم تحیّر خیز تھا — دن میں آتی تھی نظر تاروں بھری اک انجمن
دستِ قدرت نے بنائی تھی عجب لٹِ سیاہ — کس دیا گویا کسوٹی پہ تھا کندن سا بدن
اُبھرے سینے پر جوانی کے نہ تھے نورس ثمر — ٹھونکتے دنگل میں خم تھے دو جوانِ صف شکن
تھا نزاکت کا اشارہ یہ دمِ مشقِ خرام — ایسے نازک کو ہوا اک ہلکی سی پھولوں کی فنٹن
گورے گورے ہاتھوں میں تھیں دھانی دھانی چوڑیاں — پیارے پیارے بازوؤں میں ہلکے ہلکے نورتن
بھینی بھینی بسکہ آتی تھی تنِ نازک سے بُو — صانعِ قدرت نے صندل کا بنایا تھا بدن
اُبھرا سینہ - اُس پہ جالی کی وہ محرم چپت چپت — اُٹھتا جوبن - اُس پہ اُودی اُودی کُرتی کی پھبن
کیا کہوں اُس نازنیں کا عالمِ حُسنِ شباب — پھوٹ نکلی تھی جوانی بن کے سُورج کی کرن
اِک نمونہ تھی یہ قدرت کا کانٹ ۔ الغرض — بھولی بھولی شکل تھی اور گورا گورا تھا بدن
حُسن کی ماتی ہوئی - اِک اِک سے اٹھلاتی ہوئی — چلبلی چنچل - رنگیلی - سانولی غنچہ دہن
جب نظر اس سمت سے آئی وہ عروسِ مہ لقا — لیگئی دل کو اُڑا کر صاف گھونگٹ کی پھبن
پھر کیا آہستہ مَیں نے یوں بصد اظہارِ شوق — او رنگیلی لمبے گھونگٹ والی شرمیلی دلہن
کیا ترا نام و نشاں ہے! کیا حسب ہے کیا نسب! — ہے کہاں تیرا گھرانا! اور کدھر تیرا وطن
کس کے نازوں کی ہے تو پالی ہوئی اے نازنیں! — کس کی آنکھوں کی ہے پُتلی اے بُتِ تقویٰ شکن
شمعِ محفل جسکی تو ہے وُہ شبستاں ہے کدھر — تو کلی ہے جس کی پھولوں کا کہاں ہے وُہ چمن
ہیں کسی عاشق کے قبضے میں جوانی کے ثمر — یا اچھوتا او حسینہ! ہے ترا سیبِ ذقن
مجھ سے سُنکر یہ سخن گردن جھکا کر شرم سے — یُوں ہُوئی گویا زباں سے وُہ عروسِ سیمتن
یادگارِ عزّ و شانِ دولتِ اسلامیہ — دِلّی والی ہُوں مَیں اُردوئے معلّٰی کی دُلہن

دورۂ اسلام میں تھا جو کبھی کرسی نشین
لوحِ اوراقِ زمانہ پر ہوں وہ نقشِ کہن

شاہزادی تھی کبھی دِلّی کی میں او بے خبر
میرے سر پہ چترِ شاہی تھا کبھی سایہ فگن

پھر کہا اُس شعلہ رُو نے یُوں بصد سوز و گداز
شمعِ محفل جسکی تھی میں اُٹھ گئی وہ انجمن

جس پہ لہرایا کیا صدیوں تک اسلامی نشاں
نذرِ طوفاں ہو گیا وہ تختۂ عہدِ کہن

بھینی بھینی جس میں اُمیدوں کی کلیاں تھیں کھلیں
تختۂ مشقِ خزاں ہے اب وہ پھولوں کا چمن

اب کہاں وہ افسرِ زرینہ و اورنگ و تاج
اب نہ جیغے میں ادا ہے اور نہ طرّے میں پھبن

خانہ ویرانی برستی ہے در و دیوار پر
نقشِ عبرت اب ہیں آثارِ صنادیدِ کہن

برشِ تیغِ عرب میں اب وہ دم خم ہی کہاں
اب نہ وہ بانکی ادا ہے اور نہ خنجر کا فشن

ہند میں اسلام کا جھنڈا ہے اب یُوں سرنگوں
کھا کے نیزہ خاک پہ جیسے گرے کوئی ہرن

گل کھلاتی رزم میں تھی جنکی تیغِ خونفشاں
اُن کے مرقد پر ہے پھولا لالۂ خونیں کفن

چُھپ گئے جا کر کتمِ عدم میں کیسے کیسے حکمراں
لگ گیا افسوس کس کس ماہِ کامل کو گہن

سر پہ دِلّی کے جہانداری کا سہرا اب کہاں
شاہدِ ماتم نشیں ہے اب یہ البیلی دُلہن

اب وہ آہنگِ تعیش ہے نہ وہ کوسِ نشاط
اب نہ وہ بزمِ شبانہ ہے۔ نہ لطفِ انجمن

ہیں کہاں دِلّی کی اب وہ پُر فضا گلیاں کہاں
ہائے وہ قصرِ مرصع اور وہ ایوانِ کہن

مٹ گئے سب رفتہ رفتہ میری عظمت کے نشاں
رہ گیا باقی فقط افسانۂ رنج و محن

وہ مرا ننھا سا سِن ۔ وہ جانفزا طفلی کے دن
وہ شرارت وہ نزاکت وہ ادا وہ بانکپن

آرزوئیں ناچتی پھرتی تھیں جھم جھم سامنے
پیاری پیاری تھی عجب کم سِن اُمیدوں کی پھبن

باتیں کرنا سیکھتی تھی بیگموں کی گود میں
ڈھل رہا تھا حُسن کے سانچے میں اندازِ سخن

اِک طلسمِ نو کلیدِ شوخیِ تقریر تھی
قفلِ ابجد بنکے کُھل جاتا تھا چھوٹا سا دہن

جب ہوا بوٹا سا قد نشو و نما پاکر بڑا
رکھدیا سر پر فصاحت نے مرے تاجِ سخن

لے اُڑی پردے سے باہر پھر تو شوخی حُسن کی
بنکے قصۂ مختصر یاروں میں آئی میں دُلہن

کچھ دنوں بارے رہی دلّی میں سرگرمِ نشاط — جا کے چمکایا ہر اک محفل میں رنگِ انجمن
رفتہ رفتہ لکھنؤ کو پھر مرا چالا ہوا — بن کے میکے سے گئی سسرال کو شرمیلی دلہن
نیچی نظروں نے کیا کتنے جوانوں کو شہید — کر گئی کتنوں کو بسمل میرے گھونگٹ کی پھبن
میرے مقدم کے بہت دن سے تمنائی جو تھے — بول اُٹھے "مرحبا" بے ساختہ اہلِ سخن
سر میں برسوں سے جو تھا جوشِ غزلخوانی بھرا — آ کے چھلکے حُسن کے پھولوں پہ رغانِ چمن
شاعروں نے ایشیائی طرز پر ڈھالا مجھے — کر دیا اُس پہ ملمع تھا جو کُندن سا بدن
زلف میں شانہ کیا۔ کاجل لگایا آنکھ میں — بھینی بھینی بدیاں پھولوں کی کیں زیبِ بدن
کچھ عجب انداز سے کھینچا مرا نقشِ وجود — کر دیا معدوم دونوں کو۔ کمر کیا۔ کیا دہن
رُخ پہ گلگونہ ملا۔ مہندی لگائی ہاتھ میں — رنگ دیا رنگِ تصنّع میں مرا سارا بدن
لوحِ ہستی پر بنا کر آہ! میرا کالبد — رنگ بھر بھر کر بگاڑا ہیکلِ حُسنِ سخن
او رنگیلی قوم! او دلدادۂ رنگِ نشاط! — او شہیدِ جلوۂ حُسنِ بتانِ سیمتن
او شرابِ عشق کے مخمور! او بدمستِ عیش! — تا کجا شوریدۂ سودائے زلفِ پرشکن
تا کجا سرگرمِ افکارِ پریشانِ کمر — تا کجا نکتہ طرازِ فکرِ مضمونِ دہن
او خود آرا! تا کجا ترتیبِ بزمِ حُسن و عشق — کب سے ہے اُجڑی پڑی افسوس تیری انجمن
ہے سپہرِ قوم پر چھائی ہوئی بے رونقی — لگ رہا ہے آہ! دونوں چاند سورج کو گہن
چھا رہا اسلام پر ہے اب بڑھاپا سر بسر — قوم کا پتلا ہے اب پیرِ نحیف و خستہ تن
کچھ خبر بھی ہے تجھے او! نیند کے ماتے ہوئے — بن رہی ہے اب تری شہرِ خموشاں انجمن
اب تو اُٹھ! سو کر کے سوتے سوتے صدیاں ہو گئیں — اب تو تو کروٹ بدل! بدلا زمانے نے فیشن
اب تو ظالم کھول دے زلفِ دوتا کی بیڑیاں — ہے تجھے انجام دینے کو بڑی قومی مشن
اب تو کر دے مرغِ دل کو دامِ گیسو سے رہا — سامنے ہے خوشنما نیچر کے پھولوں کا چمن
ایشیائی وضع سے جی میرا گھبرانے لگا — مجھ کو صدیاں ہو گئیں پہنے ہوئے یہ پیرہن

اے زمانہ! وہ بھی ہوگا کوئی دورِ روزگار
بن کے جب پردے سے نکلوں گی میں نیچری کی ہمن

میں سپہرِ قوم پر چمکوں گی بن کر آفتاب
وہ بھی دن ہونگے کوئی اے دورِ چرخِ کہن

سرور (جہان آبادی)

کلامِ شاطر

تو نے ڈھانکے ہیں ہمارے عیب اے خاکِ مزار
تا قیامت تیرے احساں سے رہینگے زیر بار

ناخدا کشتی کا جسکے ہوگیا اے عشق تو
بحرِ طوفاں خیزِ ہستی سے ہے بیڑا اسکا پار

ڈر نہ موجوں کا نہ کچھ بادِ مخالف کا خطر
اور نہ گردابِ بلا کا خوف اُس کو زینہار

ہر جگہ اور ہر گھڑی تیری نئی اک شان ہے
میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تجھے اے سحر کار

ایک ہی شے ہے حصولِ نفع اور دفعِ ضرر
اصل ہے تو - سارے افعالِ ارادی برگ و بار

کشتیِ دل کے لیے لنگر نہ ہوتا عشق اگر
جزر و مدِ جذباتِ انسانی کا کر لیتا شکار

تیرا سودا سر سے جاتا ہے کہاں اے مارِ زُلف
گوشۂ تاریک مرقد میں بھی تو ہے یارِ غار

جان سے بڑھ کر کبھی تو تھا دلِ مُردہ! عزیز
اب لئے پھرنا بھی پہلو میں تجھے ہے سخت بار

کیونکر اے دیدہ بجھے تو نے لگائی ہے جو آگ
رو پڑا اے ظالم خدارا دل کا تا نکلے بخار

تُو نے اے غفلت ہمیں دونوں جہاں سے کھو دیا
یُوں نہ پچھتاتے کبھی گر جانتے انجامِ کار

اے دلِ مایوس تیرے درد کا درماں نہیں
جلد مر چک تیرے حق میں اب یہی بہتر ہے یار

اے سرابِ دہر تھی بے بُود یہ تیری نمود
کھا کے دھوکا ہو گئے ہم یاس و حسرت کا شکار

ہم کو کب تک تم دیئے جاؤ گے دھوکے اے حواس
اک نہ اک دن موت کر دیگی حقیقت آشکار

گو ہمک کر پڑ کے جب پہنچا تو بازی جیت لی — ٹھوکریں اس رہ میں کھائی ہیں ابھی اے شہسوار

جوش میں آ اے خوں آ۔ اے دیدہ تو رو زار زار — اے زباں فریاد کر اے دل تڑپ بے اختیار
تو نے ناحق برق کو تکلیف دی اے آسماں — تھا جلانے کو گیاہِ خشک کے بس اک شرار
زہر تھا گھولا ہوا شاید پیالے میں ترے — ورنہ دل کو مردہ کرتا ہے کہیں ساقی! خمار
آندھیوں سے کیا غرض کیا زلزلوں سے ہم کو کام — چار دن میں خود بخود مٹ جائیگا اپنا مزار
اے دلِ پُر آرزو کس نے لگائی تجھ کو آگ — جل رہا ہے جیسے صحرا میں درختِ بار دار
وقتِ آخر یا الٰہی آنکھ اپنی وا رہے — اب یہ حسرت ہے نکلتی ہم بھی دیکھیں جانِ زار
سب تو صدمے سہہ چکے پھر موت کیوں آتی نہیں — کونسی باقی ہے اب آفت بتا اے روزگار
ہر بلا آتی ہے ہم پر یا الٰہی کس لئے — کیا خراباتِ جہاں میں اک ہمیں ہیں ہوشیار
اے اجل ہم اور اُٹھے فتنوں میں تجھ سے التجا — کوئی مشکل حل کرے ہے سخت ہم کو ناگوار
آسماں مردانِ عالیقدر پر کرتا ہے ظلم — ہم اگر یوسف نہیں تھے پھر ہیں کیوں اس طرح خوار
کر دیا ہے دو جہاں کو ہمتِ عالی نے رد — وہ الگ عالم ہے رہتے ہیں جہاں عشاق زار
اے محبت دیکھ یہاں کا رخ مصور کی طرح — حسرت و رسوائی و اندوہ ہے انجام کار
لیلیِ محمل نشیں کا ناقہ خود تیرا ہے دل — عرصۂ عالم میں بد ہے کیا خاک مجنوں جز غبار
مار ڈالا سخت جانی نے دلِ مرحوم کو — اپنے کشتے کو تو اب روتی ہے کیوں اے جانِ زار

داورِ محشر! نہ کر خوابِ عدم سے ہوشیار — ہم کو اب تک نشۂ دنیا کا باقی ہے خمار
وصل تیرا ہے دوامی چند روزہ ہے فراق — اس بھروسے پر اجل جیتے ہیں تیرے جاں نثار
اے ہوس کیمیا کا عشق ہے خود کیمیا — بن گیا ہے دیکھ دل تیرا زرِ کامل عیار
ہو گئی دشمن اگر ساری خدائی بھی تو کیا — چھین ہی سکتی نہیں ہم سے اجل کو زینہار
لُٹ گیا سارا چمن مارے گئے سب ہمصفیر — آشیاں اب ہم جلا دیں دل کو تا آئے قرار
ہو چکا تاراج سب ساماں خوشا آزادگی — ہم نے چن چن کر نکالے تھے جو دامنگیر خار

ڈوب مرجاتے جو ملتا چشمۂ حیواں کہیں
کیا سمجھ کر خضر نے اس کو کیا تھا زہر مار

کیوں نہیں کرتا قیامت اے دلِ وحشی بپا
تیری جولانگاہ اب لے دے کے ٹھہرا ہے مزار

بیکس و بے یار ہیں زور آزمالے اے فلک
کشتنی ہیں ہم یہ کر مشقِ ستم اے روزگار

کیوں نہ ہوں قائل بقائے روح کے اہلِ دل
موت سے ہم فانی تو ہوتا عشق بھی ناپائدار

غفلت و حیرت سے فرصت کب ملی ہم کو یہاں
رونے بھی پائے نہ تھے جی بھر کے آئے ابرِ بہار

آئے ان کے شعبدوں سے تیرے جی اکتا گیا
ذوقِ حیرت کا نہیں [illegible] دماغ اب روزگار

مرنے والے زندگی پر اور جو [illegible] اے فلک
کیا ٹلا ہے [illegible] ہیں جاں نثار

حیرت و حسرت میں رکھا عقل نے تجھ کو حکیم
مطمئن رکھنا ہے دیوانوں کو عشق اے ہوشیار

ہم ہیں اور اسباب میں جکڑے ہوئے اے روزگار
زندگی تو زندگی [illegible] کب ہے اختیار

تجھ سے اب کیا چاہیں ہو جا بندہ اے رب قبول
ہم دعا [illegible] خواستگار

قطرۂ شبنم کہاں اور نیّرِ اعظم کہاں
[illegible] دل میں سمائی تیری یاد

واہ کیا کہنا ترا اے جلوۂ حسنِ ازل
[illegible] آئینہ دار

تجھ سے ہے سب کی نمود اے مہرِ تابانِ وجود
ذرہ ذرہ کا ستارہ تو نے چمکا رکھا ہے یار

تو بھی اٹھ جائینگے تیرے دھوئیں آسماں
[illegible] انجام ایک آہ شعلہ بار

سچ بتا اے عشق کب خالی ہمارا [illegible] تھی
[illegible] بیقرار

بیچ میں ہم خوش ہیں آؤ تم بھی نظارہ کرو
ہے یہ حسرت جو نکلتی ہی نہیں ہے جانِ زار

جب خدا ہم ہو نہیں سکتے تو بندہ ہی نہیں
شیوۂ تسلیم مجبوری سے کرلیں اختیار

یہاں نظر آتا ہے غیروں کو فقط تیرا کمال
دیکھنے والے [illegible] عشاق زار

الوداع اے یاس و حسرت الفراق اے رنج و غم
پھر ہم آ بیٹھے [illegible] انتظار

خودکشی کی ہجر میں جرأت کہاں سے لائیے
دیکھنے والا بتا ہے کون تیغ آبدار

اے دلِ مردہ عدم سے کس لئے گھبرائیں اب
منتظر ہے ہم سے آگے جا کے تجھ سا غمگسار

اپنا اپنا ہے مقدر بال و پر کا کیا قصور
کوئی گل سمجھا ہے بلبل کوئی ہوتا ہے شکار

عیش و غم خوف و رجا کس پہ ہو ہم کو اعتبار
کونسی حالت بتا اے دل ہے تیری پائدار

ہم غذائی کرتے ہیں تیری بدولت اے خیال
ایک کن سے ہوتے ہیں عالم ہزاروں آشکار

وقت آخر ہم ہیں اور تیرے کرم کا ہے یقیں
یوں تو ساری عمر گذری تھی ترے شکووں میں یا

ہیں قفس میں گر جلایا آشیاں اچھا ہوا
ظلم کو بھی ہے سلیقہ شرط چرخ برق با!

یہ دلِ رنجور یارب کس مرض کی ہے دوا
عیش و غم کے اب نہیں قابل رہا یہ رازدا

نی اندیشہ میں ہی تصویرِ حیرت بنگیا
خامۂ قدرت کے صدقے واہ رے نقش و نگا

ہم ہیں بیدل اہلِ شوریدہ تو ہے بیدماغ
نبھ نہیں سکتی ہے اب صحبت ہماری تجھ سے یا

بعد مدت آپ میں اب آکے گھبراتے ہیں ہم
کس سے پوچھیں ہم وہی ہیں یا نہیں اے عشقِ یا

اب نہ گھبرائیگا اے سوزِ محبت تجھ سے دل
ہو کے کشتہ ہوگیا سیماب یہ قائم بنار

خوابِ ہستی نے بہت آخر پریشاں کردیا
ہم کو اب جلدی جگا دے اے اجل تیرے نثا

جی کے جی میں حوصلے اظہارِ الفت کے رہے
ہائے دل ہونے نہ پائے تیرے جوہر آشکار

اے دلِ زندہ تری کیا ہوگئیں وہ شوخیاں
آہی جاتا تھا ارے اس شوخ کو بھی جن پہ پیار

ہم کو مایوسی سے نفسِ مطمئنہ مل گیا
تجھ سے ہم راضی ہوئے راضی ہوا تو ہم سے یا

زندگی کہتے ہیں جسکو ہے مرض اپنے لئے
زہر سے ہوگی شفا اے چارہ گر اے غمگسا

دوست مرنے کی دعا کرتے ہیں دشمن زیست کی
ناامیدی سے اب اس حالت کو ہم پہنچے ہیں یا

جی میں کیا ٹھانی ہے تناطر سبز رہا ہی یہ کیوں
خیر ہے کمبخت ہے ہے کیا ہوا وہ اضطرار

بعدِ برسات

گئی برسات آیا موسمِ دلکش زمستانی
ہے آب سرد خنجر، اور خنجر، برف کا پانی

ہوئے برباد وہ جھونکے جو تھے بیداد کے بانی
ہوا کے تُند سے آزاد ہیں اب سروِ بُستانی

"خوش" بل گیا ہے خار کو بارد کے غلبے سے
کہ اب ہے دوستِ آتش، اور پانی دشمنِ جانی

تماشا دیکھئے دیرینہ سے رطب و یابس کا
وہاں اب خاک اُڑتی ہے جہاں بہتا تھا پانی

ہوئی جب رنگ کاری ختم رخصت ہو گئے بادل
بڑھا خاصہ جو پوری ہو چکی قدرت کی مہمانی

گرجنا یا برسنا چار دن کی چاندنی نکلی
سب آگے آ گیا۔ تھا بادلوں میں جس قدر پانی

غزل

ہوا جوشیدہ ایسا نارِ گل سے نہر کا پانی
چمن میں نرگسِ بیمار نے پایا بُجھا پانی

زمیں سوکھی، کلیجہ زرکتے حشراتِ ارض آئے
دوبارہ جی اٹھے کیڑے مکوڑے جب پڑا پانی

نہ وہ سیلابِ دریا ہے، نہ جوشِ آبِ دریا ہے
گئی بارش، کھلے بادل، ندی کا بندھ گیا پانی

ہوا تھا کثرتِ امطار سے دریا کو استسقا
طبیبِ ابرِ تر نے بند آخر کر دیا پانی

جہاں سبزے کے بوٹے سے قدر چڑھ گئیں بیلیں
سمن پر، سرو پر، شمشاد پر بانسوں چڑھا پانی

بنانِ سنگ اُس کے دانت کڑکڑ بول جاتے ہیں
وہ سختی پیش آئی ہے کہ گوہر بھی ہوا پانی

بڑی الشیں شوق اس قدر فیضِ رطوبت سے
طراوت کا جب آیا نام تو منہ میں بھرا پانی

تعجب کیا کشیں لکھوں ہزار اس آب پر قاتب
کہ اب تو خنجرِ برگِ سمن پر بھی چڑھا پانی

رہے برخاستہ کیوں شکرِ حق سے قلبِ انسانی
چو گہ از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

خرامِ ناز سے عالم میں جب بادِ بہار آئی
سنایا زہرہ[1] نے ننوری[2] کا ٹپہ "چال بہائی"

[1] بلبل ۱۲ [2] میاں ننوری پنجاب کے ایک ٹپہ باز تھے۔ "چال سہائی" اُن کا ایک مشہور ٹپہ ہے ۱۲

گلستاں گنجِ قاروں ہو رہا ہے ابرِ گل سے — بڑھا فیضِ بہاری کھل گئی غنچوں کی ہمیانی
نہا دھو کر جوانانِ پری پیکر نکھر اُٹھے — چمن کے برگ کا بوٹا بنا نقشِ سلیمانی
نہ اب طوفاں کا خطرہ ہے نہ اب باراں کا کھٹکا — کوئی گھر بیٹھتا ہے اب نہ اُٹھتا ہے کہیں پانی
بھرا ہے خانۂ تالاب یوں آبِ مصفا سے — ہے جوں صاحبِ دل مخزنِ اسرارِ یزدانی
ہوا سے یوں زمیں پر دھول کچھ باقی نہ ٹھہری — اُڑا دی ہے خاکساری جس طرح سے کبرِ انسانی
غبار دھو گئے یوں صاف دیکھی سپہر کی چادر — ہے بے جرم و خطا سے پاک جیسے قلبِ حقانی
گھٹا پانی بڑھا ہے مچھلیوں کا اضطرابِ دل — دلِ ممسک گھٹا دے جس طرح دولت کی نقصانی
کبھی اک سمت دھوپ اور اک طرف تھوڑا ترشح ہو — مذبذب کو رہے جوں نور و ظلمت سے پریشانی
فلک پر چاند دیکھا جل اُٹھا اس سے چکوا ایسا — پرائے مال پر جلتے ہیں جیسے رشک کے بانی
وہیں بادِ بہاری نے چمن کی نوک لے ڈالی — جہاں برسا گئی بارانِ رحمت چار دن پانی
حباب آنکھیں نکالے آتے دریا کے تموج پہ — جو تھا خودسر تو اس کے لئے لازم تھی گرانی
کنول پھولے ہوئے تالاب میں یوں جلوہ افشاں ہیں — مجازی میں حقیقی عشق جیسے حسنِ روحانی
ممولے اور صعوے ہر طرف اُڑ اُڑ کے آ پہنچے — خبر پھیلی جہاں میں آگیا دورِ زمستانی
کیا بازارِ گرما سرد جب دم سازِ مشرق نے — دوشالے بیچنے نکلے وہیں پچھم سے افغانی
بٹھایا دھوپ میں شعلہ رخوں کو فصلِ سرما نے — پہاڑوں نے بھی سبزی کھا کے چادر برف کی تانی
بچھایا ہر سحر کہروں نے اپنا فرش عالم پر — ملی شبنم کو ہر شب کے لئے گھر گھر کی دربانی
مزاج ایسا ہوا ہے عالمِ ایجاد کا ٹھنڈا — کہ ہرگز گرم ہو سکتی نہیں ہے طبعِ حیوانی
لہو تک جم گیا ہے برف سا رنگِ برودت سے — تری نے خشک کر ڈالی ہے اشکالِ ہیولانی
نہانے کا جو نام آیا پسینہ آگیا ڈر سے — لرز جاتی ہے مثلِ بید تھراتی ہے عریانی
فلک تک چھا رہی ہے سرد مہری آج گرما کی — پڑا ہے جھلملایا سا چراغِ بدرِ نورانی
پڑی ہیں پاؤں میں موجِ ہوا کی سرد زنجیریں — لحافوں میں ہوئے آشفتہ کاکل آ کے زندانی

مراد از مشرق ۔ ۱۲

نہ اٹھا صوم کو اور اوس پر رنگیب قانع
فلک نے دانۂ انجم سے کر لی سبحہ گردانی

[illegible] دیکھا فضائی میں اُسے بکا ہوا پایا
وہ سردی ہے کہ ٹھنڈی ہو چلی ہے نظم گیہانی

دھکے میں برف سے سارے شجر [illegible] کون کہتا ہے
یہ سب روئی کے کپڑے پہنے ہیں نخلِ بیابانی

نہیں لباس [illegible] کو ۔ مگر شاید
گئے آواز نقرا سے جو ہوں گرم ثنا خوانی

[illegible] دیوانوں کو
مظفر ہو رہے ہیں روئی پر گویا کہ جاپانی

[illegible] گرم جاڑوں میں
نہاں ہے کان میں آنکھیں چرائے لعلِ رمانی

[illegible] خورشید کی اس دھوپ [illegible]
[illegible] سینہ صافی ہیں جیسے رمزِ ربانی

[illegible] شب [illegible] پر
کھچا بارہ دری میں چاندنی کا فرش نورانی

کوئی [illegible] ہے کوئی معشوق مصری ہے
کوئی نسخہ ہے مصرانی کوئی نسخہ ہے یونانی

کوئی [illegible] ہے محبت [illegible]
کوئی ہے حُسن میں [illegible] کوئی ہو یوسفِ ثانی

[illegible] جب [illegible] چمن میں [illegible] گل کا
یہ قدرت کی استادی وہیں بہزاد نے مانی

[illegible] بوستاں میں عنادل عیش کے [illegible]
نواسنج طرب ۔ گاتے ہیں دیر دیر دیم تا دانی[1]

[illegible] بُت بنے آ بیٹھے
کنشتِ باغ میں ہونے لگی بلبل کی قربانی

[illegible] تک نہیں [illegible]
فلک نے دستِ حسرت سے زمیں کی خاک تک چھانی

[illegible] کھلے میں بیچ [illegible]
غضب ہوتا ہے [illegible] دکھاتے ہیں چند یرقانی!

[illegible] اپنی ذات پر آیا
سنا دی اس نے لیلیٰ کو شبِ سرما کو طولانی!

[illegible]
مضر ہوتا ہے صحت کے لئے اکثر [illegible] پانی

[illegible] رنگ سے [illegible] تو جاں آئے
پسند آئے تو کیا آئے [illegible] دل کو بریانی[2]

نصیحت ناصحوں کی میکشوں پر کیا مؤثر ہو
فرشتوں پر ہوا کب کارگر اغوائے شیطانی

[illegible] رزکا [illegible] میں
مثل ہے "بھاتے جو راجا کو کہلائے وہی رانی"

[1] [illegible] کا ایک [illegible] ہے ۔ [illegible] ۔ [2] [illegible] الطعام

سبو ئے میکدے سے راز کُنتُ کنزاً افشا ہے ۔ خطِ مینا سے روشن ہو سوادِ خطِ پیشانی

طالب بنارسی (از بمبئی)

تازہ غزلیں

یا وہ گو ہے جو کہے ردّ و بدل کیا ہوگا ۔ یہ خبر آج کسی کو نہیں کل کیا ہوگا
دردِ پنہاں دلِ محزوں کا بدل کیا ہوگا ۔ بڑھ گئے یہ آبلۂ زیرِ بغل کیا ہوگا
جُرعۂ آبِ بقا زہرِ اجل کیا ہوگا ۔ طعمہ کامِ زباں تیغ کا پھل کیا ہوگا
عقل کہتی ہے نہ رکھ وادیٔ اُلفت میں قدم ۔ وحشتِ دل کا تقاضا ہے کہ حل کیا ہوگا
غم کا ساماں ہو خوشی حد سے زیادہ اے دل ۔ آکے وُہ جائینگے جب پہلے پہل کیا ہوگا
دیکھ غافل نہیں توبہ کا زمانہ باقی ۔ اور مُہلت جو نہ دے تجھ کو اجل کیا ہوگا
ہم نے مانا کہ یہ وعدہ نہیں جھوٹا لیکن ۔ تم سے پہلے اگر آجائے اجل کیا ہوگا
بادۂ ناب تو روشن گرِ دل ہے واعظ ۔ اسکے پی لینے سے ایماں میں خلل کیا ہوگا
خود ہو معمول دُعائیں جو تو جِہ کبھی شیخ ۔ کارگر مجھ سے پڑھے جن پہ عمل کیا ہوگا
چارہ گر پرتو داغِ دلِ بیتاب ہے یہ ۔ مندمل آبلۂ زیرِ بغل کیا ہوگا
پاسِ ناموسِ محبت یہی کہتا ہے ٹھہر ۔ ہے صدائے دلِ بیتاب نکل کیا ہوگا
دلِ افسردہ کیا داغ دلانے پُرنور ۔ ہم تو سمجھے تھے کہ روشن یہ کنول کیا ہوگا
ہوتی رہتی ہیں خطاؤں پہ عطائیں مالک ۔ شکر میرا تیرے احساں کا بدل کیا ہوگا
کٹ گئی عمر اسی بیم و رجا میں آخر ۔ نہ کھلا آج کسی طرح سے کل کیا ہوگا

راتیں اپنے خیالات میں سرگرداں ہیں   وجہِ تسکینِ سفرِ دشت و جبل کیا ہوگا
نہیں لیتا دلِ پُر داغ میرا کوئی حسین   مشتری مالکِ اقلیم زحل کیا ہوگا

نابلد ہیں رہِ تحقیق سے جو لوگ حبیب
اُنکی تشبیب میں یہ لطفِ غزل کیا ہوگا

حبیب (کنتوری)

تو جو اپنے دھیان میں تھا میں بھی اپنے غم میں تھا   دل سرِ تشویش نا معقول بیش و کم میں تھا
قیس مجنوں دے نہ لیلیٰ تیری باتوں کا جواب   کیا خبر تجھ کو ترا دیوانہ کس عالم میں تھا
خونِ دل کشتِ تمنا کے لئے درکار ہے   کب عدن ہیں یہ خیالِ ناقصِ آدم میں تھا
وصل کی اُمیدِ لاحاصل میں غم کھاتے رہے   مزرعِ اُمید کا حاصل تمہارے غم میں تھا
چشم و عارض میں ترے پایا وہی رازِ نہاں   آئینے میں جو سکندر کے تھا جامِ جم میں تھا
خارزارِ دشتِ اُلفت میں بھٹکتا ہی رہا   دم ترے مجنونِ آوارہ کے جب تک دم میں تھا
منزلِ ہستی میں دل نالاں رہا مثلِ جرس   یعنی اپنی کوششِ بیکار کے ماتم میں تھا
ایک کے رونے سے ہنستا ہے جہاں میں دوسرا   خندۂ گلزار پنہاں گریۂ شبنم میں تھا
بڑھتے بڑھتے ایک آنسو نے دیا عالم ڈبو   نوح کا طوفاں ہمارے دیدۂ پُرنم میں تھا
کم نہ تھی زہرِ ہلاہل سے تمہاری بے رُخی   غور سے دیکھا تو آبِ زندگی اس سم میں تھا
خاکساری سے رسائی مہرِ رخشاں تک ہوئی   کیا کمال ایسا وگرنہ قطرۂ شبنم میں تھا
لیگیا اس خوانِ یغما سے جسے جو کچھ ملا   کام کا رم غنچہ کا اک قطرۂ شبنم میں تھا
دیدۂ محرم سمجھتا تھا ہنر اپنا جو عیب   جو کہ اک جُرمِ کبیرہ چشمِ نامحرم میں تھا
دم میں جا پہنچا مجھے اقلیمِ برزخ سے پرے   جانے کیا جادو کسی کی لے کے زیر و بم میں تھا
گتھیاں اُلجھی ہوئی تا اک عمر سلجھاتے رہے   پر نہ سلجھا پیچ جو اس گیسوئے پُرخم میں تھا
ہو کے ہم چشمِ حریفاں میں رہے آخر ذلیل   جو نہ بھایا انکو ایسا عیب کوئی ہم میں تھا

اشک کا فرِ سحر نے بھی لگا دی آگ سی — کچھ علاج داغِ دل تھا اگر تو بس مرہم ہی تھا
پہنچے الفت کے ماروں کے لئے تعویذِ حُب — نقشِ دولت اے سلیماں گو ترے خاتم میں تھا
ہر قدم پہ بڑھتا جاتا تھا ہمارا شوقِ صید — جذبِ مقناطیس آہو تیرے دام میں تھا
عندلیبِ خامہ کے منقار سے ٹپکا وہی
صادق اپنے مرغِ دل کے جو دل پر غم میں تھا

صادق علی خاں

الفت میں تیری پاک ہر الزام سے ہم ہیں — دل پاس نہیں ہے تو کس آرام سے ہم ہیں
جس چیز کو کہتا تھا برا صبح کو واعظ — بوتل میں وہی چیز بھرے شام سے ہم ہیں
افراط سے پی جانے میں جو کچھ نہ ہو کم ہے — شرمندہ بہت میکدہ و جام سے ہم ہیں
ڈھونڈھے سے نکالیںگے کسی روز پتہ بھی — اتنا ہے کہ آگاہ ترے نام سے ہم ہیں
واعظ کو مذمت کے سوا کچھ نہیں آتا — واقف ترے مجموعہ اکرام سے ہم ہیں
برعکس تخلص ہے مگر بات کریں کیا — مجبور ہیں مشہور اسی نام سے ہم ہیں

یوں اگر ملنے میں اک طرح کی رسوائی ہے — خیر گستاخ کی بھی کیا تم نے قسم کھائی ہے
تو خبردار وہاں کہیو نہ کچھ اے ہمدم — تیری باتوں پہ تو کہتے ہیں سودائی ہے
دیدِ گل کے لئے روتی ہے چمن میں بلبل — ہائے صیاد مجھے چھوڑ بہار آئی ہے
کوئی ایسا نہیں ملتا کہ ملا دے اس سے — یوں تو اپنی بھی زمانے سے شناسائی ہے
ہم لکھے دیتے ہیں پہلے سے جو پوری اترے — تو نے تصویر مصور سے تو کھنچوائی ہے
مار ہی ڈالو نہ کیوں رند کا جھگڑا مٹ جائے — تم کو منظور جو ہر بات میں خود رائی ہے
ایک وہ ہیں کبھی کھنچوانے پہ راضی نہ ہوئے
اک جہانگیر کی تصویر کہ ہر جائی ہے

۱

مخزن المجتبیٰ

[illegible]

محصول ڈاک بذمہ خریدار

(۱) مفصل ذیل کتابیں عہ کی ہیں اگر آپ اکٹھی خریدیں تو عہ میں مل سکتی ہیں۔

آثار الصنادید (سے)	سرسید مرحوم کی پہلی تصنیف جس میں دہلی قدیم کے تمام قابل دید مقامات معہ نقشہ جات نہایت تفصیل سے قلمبند کئے گئے ہیں۔
مجموعہ لیکچر سر سید احمد خاں (عہ)	اس مجموعہ میں ۱۸۵۶ء سے لیکر ۱۸۹۸ء تک سر سید کے کل لیکچر جمع کر دئے گئے ہیں۔
آبِ حیات مصنفہ آزاد (عہ)	جس میں تمام مشاہیر شعرا کی سوانح عمریاں نہایت تفصیل سے لکھی گئی ہیں۔
فلورا فلورنڈا (عہ)	مصنفہ مولوی عبدالحلیم شرر۔ نہایت دلکش اور دل پر اثر کرنے والا ناول۔
ثمرۂ دیانت (۸/)	مصنفہ منشی عزیز الدین صاحب ڈپٹی کلکٹر۔ اس کتاب میں عدالتوں میں رشوت ستانی اور اس کے بُرے نتائج دکھائے گئے ہیں۔
کیمیائے زراعت (عہ)	مؤلفہ شمس العلما خان بہادر سید امداد امام۔ یہ کتاب فن زراعت پر پوری قابلیت سے لکھی گئی ہے۔ زراعت کا کوئی پہلو نہیں چھوڑا۔

(۲) ذیل کی کتابیں سے کی ہیں اگر اکٹھی خریدی جائیں تو عہ میں مل جائیں گی۔

آثار الصنادید۔ آبِ حیات۔ ثمرۂ دیانت۔ فلورا فلورنڈا۔

سے — عہ — ۸/ — عہ

(۳) ذیل کی کتابیں عہ کی ہیں۔ اکٹھی لینے پر للعہ میں مل سکیں گی۔

سرسید کے آخری مضامین۔ حالاتِ روس۔ آثار الصنادید

عہ — ۱۲/ — سے

(۴) ذیل کی کتابیں سے کی ہیں اسوقت صرف عہ میں لے سکتے ہو۔

حالاتِ روس۔ اسباب بغاوت ہند (مصنفہ سر سید مرحوم)۔ بھیڑ بکری کی پرورش۔ ثمرۂ دیانت

حیاتِ زیب النسا۔ بدر النسا کی مصیبت۔ مسدس حالی معہ ضمیمہ۔ تذکرہ سقراط

آؤ ہم بتلائیں تم کو پچیس ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

خمیرہ کراماتی — مقوی بصر، محافظ بینائی، دافع ضعف القلب، خفقان، غبار، آب، پانی، دھند۔ قیمت فی تولہ دو روپے۔

حب ذیابیطس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر کو تندرستی بخشتی ہے۔ فی تولہ ۵۔

حب دائمی قبض — پرانی سے پرانی دائمی قبض معدہ اور تمام عوارض درد سر، گرانی معدہ کو فوراً دور کرتی ہیں۔

جوہر عشبہ — صفائی خون کے لئے بے مثل، گندے خون کو زہر کی طرح صاف کرتا ہے۔ دافع پھوڑا پھنسی، ناسور، بھگندر، خارش۔ شیشی کلاں ۱ روپیہ، شیشی خورد ۸ آنے۔

نور علی نور — چند منٹ میں بال دور۔ ۴ تولہ ایک روپیہ ۸ آنے۔

حب دافع وجع مفاصل — درد اعضا، جوڑوں کا درد دور ہو۔ ۲ ہفتہ کے لئے ۔ ۶ ۔

حب دافع طحال — تلی یا معدہ کے ورم کے لئے تیر بہدف۔ ۲ ہفتہ کے لئے دو روپے۔

سیر آمل — دلربا خوشبو کے علاوہ بال بے وقت سفید نہیں ہونے دیتا۔ نزلہ، زکام کو دور کرتا ہے۔ ضعف دماغ کو مفید۔ فی شیشی ۱ روپیہ۔

روغن زود رس — اس کے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے ۔ ۶ ۔

دوائے خارش — رانوں کی خارش اور بدن کے دانے دنوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ ۲ تولہ ۱ روپیہ۔

تریاق السعال — اخراج بلغم، درد سینہ، سر درد، کھانسی اور خراش گلو، نزلہ کا حیاتی تریاق۔

اس کے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کارآمد۔ ایک تولہ کی قیمت دو روپے ۔ ۶ ۔

حب قائم مقام افیون — چاندو، افیون بلا تکلف اس سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ایک تولہ ۸ آنے۔

روغن اعجاز — برسوں کا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر، ناسور کے لئے اکسیر اور مجرب الاثر۔ ۲ تولہ ۶۔

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو جاتا ہے۔ ہر ایک شیشی دو سو مریض کو کافی ہو۔

چورن مقوی معدہ — خوش مزہ، بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے۔ ۴ تولہ ایک روپیہ ۸ آنے۔

سنون مستحکم دندان — ہلتے دانت مضبوط اور مسوڑھے صاف کرتا ہے۔ ایک روپیہ ۸ آنے۔

ید اللہ دافع بخار — دو رتی بھر سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن ۸ آنے۔

دمہ یا ضیق النفس — سانس کا رکنا اور بلغم وغیرہ دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے ۔ ۶ ۔

رعنا — چہرہ کے بدنما داغ وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ ۶۔

سفوف درد گردہ — درد گردہ اور ریگ مثانہ بالکل خارج ہو جاتی ہے۔ ۴ تولہ ۶۔

اکسیر شفا — دوائی طاعون بطور علاج حفظ ما تقدم کے لئے، مرض کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ غرباء کو مفت، فی شیشی ایک روپیہ ۸ آنے۔

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکماء ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور (موچی دروازہ)


ڈنکے کی چوٹ
ایک خاص لمبے موقعہ بد گئی ہے
مشہور و معروف اسکوپ ٹیم واچ
گارنٹی ۵ سال
ریلوے ریگولیٹر واچ
مونچھوں کے بالوں کا تیل
معمولی سی خریدکر حاصل فرمائیں رعایت
نوٹ
ایم ۔ ظفی الدین مسعود دی حمیدیہ ٹریڈنگ کمپنی
سیالکوٹ
لاہور پنجاب

دریا کوزہ میں بند ہے کیسا عجیب مجموعہ قابل دید

جوہرِ غیب

۱۰۰ صفحہ — قیمت ۱۰؍

اس کتاب میں مفصلہ ذیل علوم کا بیان ہے۔ قیافہ سامدرک۔ کیا میرت شگون۔ نجومی پیشنگوئی۔ تعبیر خواب۔ مسمریزم۔ سرود۔ ان سب کے اصول نقشے دے کر سمجھائے گئے ہیں اور ان کو دلائل سے صحیح ثابت کیا ہے۔ تشریح اصطلاحات سنسکرت انگریزی۔ سنکرت عکریا۔ استاد کے ہر بات سمجھو اور غیب کا حال بتانے لگو گے۔ قحط وبا وغیرہ کی پیشنگوئی کرنا اپنی آفات کو جان لینا کسی کی شکل دیکھ کر مزاج و قسمت کا حال بتانا۔ اگر یاور نہ ہو تو آزما لیجئے۔ ضرور ہے کہ آپ ایک نسخہ تو منگا کر دیکھیں۔ قیمت کوئی بڑی نہیں ✦

جوہرِ مشاہیر

۱۲۰ صفحہ — قیمت ۱۲؍

اس میں دنیا بھر کے ساٹھ مشہور آدمیوں کی سوانح عمریاں معہ تصاویر جمع کی ہیں۔ ہر قوم و ہر زمانہ کے بڑے بڑے بادشاہ۔ پیغمبر۔ فلاسفر۔ موجد۔ عالم۔ ریفارمر۔ سیاح۔ نامی عورتیں۔ ممبران کانگرس وغیرہ حضرت محمدؐ۔ بودھ۔ زرد شت۔ سکندر۔ کولمبس۔ بکرم۔ تیمور۔ امیر کابل۔ بو علی سینا۔ اقلیدس۔ شنکر آچار۔ ارسطو۔ سعدی۔ دنی بسنٹ۔ سید احمد خان۔ دیانند۔ وویکانند۔ اسکاٹ۔ مکسمولر وغیرہ عقلمندی بہادری کے پھڑکانے والے قصے۔ ایک پیسہ فی سوانح کیا گراں ہے ✦

جوہرِ نباتات

صفحہ

اس میں ہر قسم کی مختلف نباتات کا بیان مفصل معہ تصاویر ہے۔ پھل اور پھولدار۔ خوشنما آرائشی گملے کو درخت۔ ہر قسم کی جڑی بوٹیاں۔ عجیب۔ دیسی۔ ولایتی۔ چھوٹے بڑے بیلدار ہر قسم نباتات۔ پتے و پھول۔ موسم استعمال طریق پیدائش۔ لگانے کی مسلسل ترکیبیں قلم پیوند چشمہ تیار کرنا۔ خرچ سے باغ لگانا وغیرہ وغیرہ ✦

جوہرِ باغبانی

صفحہ

اس کتاب میں وہ مخفی باتیں کہ جنکو مالی لوگ ہرگز نہیں بتلاتے بڑی کوشش اور لاگت سے حاصل کر کے لکھی ہیں۔ یعنی ایک نسخہ دس دس روپیہ کو بھی نہیں ملتا۔ مثلاً پھل بے دانہ کرنا۔ بے موسم یا بڑا پھل پیدا کرنا۔ فوراً سے لگانا۔ پھل کا ذائقہ۔ رنگت خوشبو بدلنا۔ بارہ ماسی پھل لگانا۔ درختوں کو سینچنے کے مسالے وغیرہ

جوہرِ تفریح

صفحہ

تاش۔ شطرنج۔ چوسر۔ گنجفہ اور غیر ملکوں کے کھیل۔ گیند۔ کرکٹ۔ فٹ بال۔ ٹینس۔ گلی ڈنڈا۔ گونٹا۔ کمبدہ۔ تیرنا اور کھیل جنکا نام بھی نہ سنا ہوگا سب کھیلنے کے قواعد استادوں کے ہتھکنڈے معہ پیچ اور نقشوں کے گویا بالکل نئی تحقیقات ہے۔ اسے خود پڑھو۔ بچوں کو پڑھاؤ۔ دوستوں کو تحفہ دو

جوہرِ حکمت

تمام ادویات کے نام سنسکرت۔ فارسی۔ انگریزی اردو میں معہ شناخت تاثیر۔ تمام بیماریوں عضاء و پٹھوں کے نام و اصطلاحات طب کی تشریح چارٹ بادوں میں تشریح جسمانی معہ تصاویر حفظ صحت کے علاوہ ایک اصول شاستروں کے بابت لباس۔ خوراک۔ موسم وغیرہ۔ ہر مرض کا علاج بقاعدہ ڈاکٹری ویدک اور یونانی۔ ہومیوپیتھی نسخوں کشتوں کا بیان معہ تشخیص۔ انگریزی ادویات پیٹنٹ کا مفصل بیان معہ ترکیب استعمال۔ احتیاط ایام حمل۔ حفاظت بچہ و دیکھ بھال۔ فصد۔ قارورہ نبض و آلات جراحی کا بیان۔ علاج کے مختلف طریقے۔ علم طب کے تاریخی حالات۔ قدیم حکما کے مشہور نسخے اور وید کے چٹکلے قرابادین

ملنے کا پتہ { مینیجر چھاپہ خانہ قیصر ہند بک ایجنسی لودیانہ پنجاب

پانچ ہزار روپیہ انعام | ممیرے کا سرمہ | پانچ ہزار روپیہ انعام

مصدقہ جناب اسسٹنٹ کیمیکل ایگزیمینر صاحب بہادر گورنمنٹ پنجاب

معززہ ڈاکٹروں میڈیکل کالج کے پروفیسروں سول ڈاکٹروں والیان ریاست اور ولایت کی یونیورسٹی کی سند یافتہ یورپین ڈاکٹروں نے بعد تجربہ اس سرمہ کی تصدیق فرمائی ہے کہ یہ سرمہ امراض ذیل کے لئے اکسیر ہے ضعف بصارت آنکھ کی تم دھند جالا پھولا ناخونہ پڑبال غبار پھولا جالا سرخی ابتدائی موتیا بند ناخونہ پانی جانا خارش وغیرہ معزز ڈاکٹر اور حکیم صاحبان اور ماہرین آنکھوں کے مریضوں پر اس سرمہ کا استعمال کرتے ہیں چند روز کے استعمال سے بینائی بہت بڑھ جاتی ہے اور عینک کی بھی حاجت نہیں رہتی ہے بچے سے لیکر بڈھے تک کو یہ سرمہ یکساں مفید ہے قیمت اس لئے کم رکھی ہے کہ عام و خاص اس سرمہ سے فائدہ اٹھا سکیں قیمت فی تولہ جو سال بھر کے لئے کافی ہے صرف دو روپے ممیرے کا سفید سرمہ اعلیٰ قسم فی تولہ صرف تین روپیہ خالص ممیرہ فی ماشہ ... روپیہ صرف سرمہ فی تولہ ... محصول ڈاک بذمہ خریدار۔

المشتہر
پروفیسر میاں سنگھ اہلووالیہ مقام بٹالہ ضلع گورداسپور پنجاب

اس سے بڑھکر اور کیا معتبر شہادت ہو سکتی ہے

۱۔ میں بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ ممیرے کا سرمہ جو میاں سنگھ اہلووالیہ نے ایجاد کیا ہے بڑی بیش قیمت اور مفید دوا ہے یہ سرمہ مفصلہ ذیل امراض کے لئے بہتر اکسیر ہے۔ آنکھوں سے پانی کا بہت جانا۔ دھند۔ سوزش ہر قسم جسکو آنکھ آنا کہتے ہیں۔ ضعف نظر۔ خارش۔ باہر اور اندر کی جھلی کا زخم اور ان دونوں کا گرنا۔ چونکہ اس سرمہ میں کوئی مضر کیمیاوی شے نہیں ہے اس لئے ہر کسی کو اسکا استعمال مفید ہے۔ خصوصاً ان مقامات میں جہاں لائق ڈاکٹروں کا ملنا مشکل ہو وہاں ایسی مفید دوا کو ضرور پاس رکھنا چاہئیے۔ اس کو میں بلا شک و شبہ شہادت دیتا ہوں کہ مذکورہ بالا امراض کے لئے ممیرے کا سرمہ نہایت ہی مفید ہے۔ **راقم** ڈاکٹر ایم۔ ایل۔ سانگلی صاحب بہادر ایم۔ ڈی۔ ایم۔ ایس سند یافتہ یونیورسٹی ایڈنبرگ (انگلینڈ) لاہور

۲۔ میں نے اور میرے بہت سے متعلقین نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میاں سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے استعمال کیا نہایت ہی مفید پایا۔ آنکھوں کی بیماریوں کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ آنکھوں کو تر و تازہ رکھتا ہے اور بینائی کو طاقت بخشتا ہے۔ درحقیقت یہ سرمہ بینائی کو قائم رکھنے کے واسطے نہایت ہی مفید اور زود اثر ہے کہ آج تک کبھی کوئی دوا اس سرمہ سے فائدہ بخش نہیں دیکھی۔ **راقم** نواب محمد حیات خان صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی۔ ریٹائرڈ ڈویژنل و سشن جج قسمت جالندھر ممبر کونسل گورنر جنرل ہند۔

۳۔ میں اس سرمہ کی بڑی خوشی سے تصدیق کرتا ہوں کہ میں نے ممیرے کا سرمہ جو کہ سردار میاں سنگھ اہلووالیہ نے تیار کیا ہے۔ ... کئی ایک قسم کے مریضوں پر استعمال کیا۔ میری رائے میں بینائی قائم رکھنے اور آنکھوں کی بیماری سے بچنے کے لئے ممیرے کا سرمہ کا استعمال ... **راقم** خان بہادر ڈاکٹر سید ... اسسٹنٹ سرجن ...

پانچ ہزار روپے انعام اگر کوئی شخص ممیرے کے سرمہ کی اسناد میں سے کوئی فریب یا جعل ثابت کردے تو اسکو مبلغ پانچ ہزار روپیہ انعام دیا جائیگا جو کسی بینک میں ... ۱۹۰ ...

مخزن صرف چھ آنے میں

گو یہ ہندوستان کا مشہور علمی ادبی رسالہ ملک کے تمام دیگر ماہوار رسالوں سے زیادہ چھپتا
ہے تاہم ابھی بہت سے لوگ اسکے دیکھنے سے محروم ہیں۔ **اِسلئے ہم** نمونے کے طور پر صرف
تین مہینے کے لئے **مخزن** بجائے **۱۲**ر کے صرف **۶**ر میں دینگے۔ اس عارضی خسارے
کی وجہ یہ ہے کہ ہم مخزن کو ہر ایک بامذاق شخص کے ہاتھ تک ایک دفعہ پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ہمیں
یقین ہے کہ جو شخص مخزن کو ایک دفعہ دیکھ لیگا وہ ضرور اسکا مستقل خریدار بنیگا۔ اسلئے جو اصحاب اس

غیر معمولی رعایت

سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہوں وہ ۳۱۔ دسمبر ۱۹۰۴ء تک

منیجر۔ مخزن لاہور

کے پتے سے دسمبر کا پرچہ بذریعہ ویلیوپے ایبل طلب فرمائیں۔ سردست صرف ایک ہزار نئے خریداروں
کی درخواستیں قبول کیجائینگی۔ اسلئے جو صاحب فوراً درخواست نہ بھیجینگے ممکن ہے کہ وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکیں

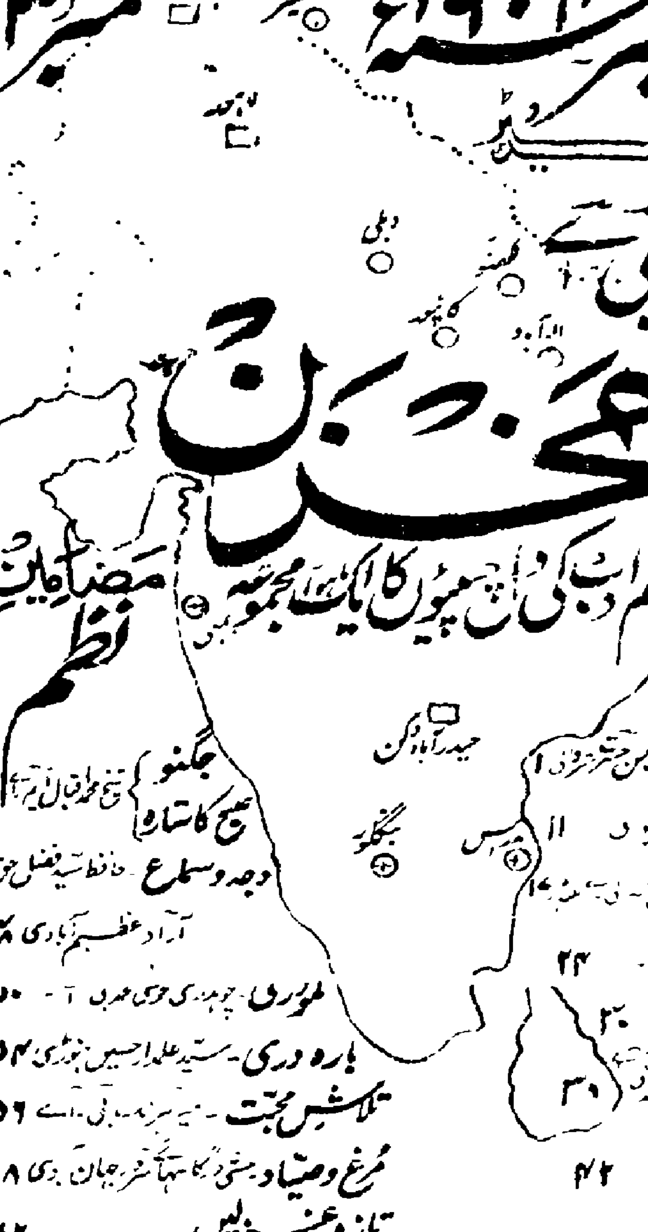
قیمت سالانہ مجموعہ ۱۲ لکھ قسم اول ۵ روپے، فی پرچہ ۸ آنے قسم دوم ۲/۸، فی پرچہ ۳ آنے

جلد (۸) دسمبر ۱۹۰۴ء نمبر (۳)

ایڈیٹر شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی ماہواری کا ایک مجموعہ



مضامین نثر

مضامین نظم

تو کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں - اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھ لیتے ہیں

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے □ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں ملک عبد العزیز مینیجر کے اہتمام سے چھپا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا

ایک نظر اِدھر بھی دیکھ لیجئے

حضرات! چند اشیا اپنے دواخانہ کی چھانٹ کر آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ آپ لوگ انکا ضرور تجربہ کیجئے فرق پڑے تو دوچند دام دینے کا ذمہ ہے پیشگی روپیہ آنے پر محصول بھی ہمارے ذمے ہے۔ ورنہ سب کو قیمت طلب پارسل کے ذریعے سے روانہ ہونگی

المشتہر

منشی امام الدین سوداگر دواخانہ انگریزی شہر متھرا

اثبات مسیحائی:- علیا حضرت قیصرہ ہند کے خاص کیمیا ساز ڈاکٹر مسٹر بنگھمٹن کو فارماسوٹیکل سوسائٹی کے آنریبل میمبران و گریٹ انٹرنیشنل کرامینیشن پروفیسران نے جو تمغے اور سارٹیفکیٹ دیئے ہیں جو بوتل پر چسپاں ہیں اسی لئے دعویٰ سے سفارش کیجاتی ہے کہ شربت فولاد دنیا کے تمام ایجاد شدہ ادویات کا بادشاہ۔ کمزوروں کا حاجت روا ہے۔ شربت فولاد کے ۲ قطرے ۔ ۔ دن پینے سے رگ پٹھوں نظام عصبی یعنی دل جگر و دماغ میں وہ تحریک اور طاقت پیدا ہوتی ہے کہ جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ کل داخلی فعل قوی اور قوائے حواس خمسہ ظاہری و باطنی تیز و روشن۔ چہرہ پر نور۔ دل میں فرحت و سرور۔ دوران خون میں تیزی و حرارت غریزی میں ترقی غلبہ تریح وریح کی جودت سستی کاہلی نابود۔ بھول چوک کا ذکر نہیں۔ خیالات مفید پیدا ہاضمہ قوی قبضیت۔ بدہضمی کا نام نہیں۔ بھوک لاانتہا۔ کمر میں انتہا درجے کی طاقت۔ بعد تولید خون زندگی کا لطف۔ گردہ قوی۔ اعصاب سخت۔ ہڈی ہڈی مضبوط مستحکم ہوکر لاغر سے لاغر اندام شخص توانا تندرست۔ چاق چوبند ہوجاتا ہے۔ نزلہ۔ زکام۔ سدہ ریش بلغم۔ درد گلو۔ درد سینہ۔ بدمزگی دہن۔ ہچکی زیادتی عکسی دفع ہوجاتی ہے۔ فی بوتل عہ تین بوتل صہ +

غازۂ یوسفی:- جس طرح بال و دانتوں کو صاف رکھنے کی ضرورت ہے اسی طرح چہرے کی صفائی و نمائش بھی ضروری ہے خوبصورت بننے کی دوا حضور شہزادہ پرنس آف ویلز کی سفارش سے ڈاکٹر نائٹنگیل صاحب نے نہایت عمدگی سے تیار کی ہے جسکو سات روز ملکر نہانے سے کالی رنگت گلاب کی پتی کی طرح سرخ سفید مخمل کے مانند نرم ہوجاتی ہے۔ آنکھوں کے حلقے گالوں کے سیاہ داغ چھائیں۔ چھپ جھریاں۔ فوراً دفع ہوکر خوبصورتی پیدا ہوجاتی ہے سیتلا تاکہ داغ خواہ کتنے ہی عرصے کے کیوں نہوں ایک ہفتہ میں دفع ہوجاتے ہیں اور مہاسے وغیرہ سے جو چہرہ کھردرا اور بے رونق ہوجاتا ہے اسکو شاکر چہرہ کو برابر صاف اور خوش رنگ نہایت عمدہ ملاحت دار کر دیتی ہے کہ دشمن کو بھی پیارا معلوم ہو جو خوبصورتی اور رنگت اس سے پیدا ہوتی ہے وہ تمام عمر قائم رہتی ہے۔ بالکل بڈھا و بدشکل چہرہ جسپر جھریاں پڑی ہوں خوب صورت معلوم ہوتا ہے خوشبو ایسی کہ شہزادوں کے لائق استعمال۔ ایک دفعہ لگاکر جبتک دوبارہ غسل نہ کرو دماغ معطر رہے پسینہ کی بدبو بھی گم شدہ۔

کھال کے کل عوارض۔ پھوڑا پھنسی۔ کھال کا ترخنا۔ داد خارش کو از حد مفید ہے۔ عطر و پاؤڈر وغیرہ لگانا شوقین لوگ معمول جانتے ہیں مگر یہ نہایت ہی عمدہ ولایتی پھولوں کی روح کھینچکر اسکو تیار کیا ہے قیمت فی شیشی عہ تین شیشی للعہ +


میاں عبدالعزیز

مخزن

دیباچۂ غُرّۃ الکمال امیر خسرو

پر

ریویو

یہ امر مسلم ہے کہ خسروِ اقلیم سخن امیر خسرو کا خزانۂ کلام شمار سے باہر تھا۔ نسل تیمور کے ایک فرماں روا کے کتابخانے میں امیر ممدوح کے لاکھ سے زیادہ شعر موجود تھے۔ جب نئے کلام کی آمد موقوف ہو گئی تو اُس کو دعویٰ ہوا کہ اب اس سے زائد نہیں ہے اگر ہے تو کوئی لائے اور انعام لے۔ انعام کے شوق میں لوگ تلاش کر کر کے نئے نئے مجموعے لاتے جو آتا یہاں موجود ملتا۔ جب دعویٰ فیصلہ بن چکا تو ایک غنچہ جلد آئی جو شاہی کتابخانے میں نہ تھی۔ بادشاہ کو کوکبۂ خسروی کے سامنے سر جھکانا پڑا اور اُس نے تسلیم کیا کہ امیر باکمال کا کلام حد شمار سے خارج ہے۔ داغستانی نے لکھا ہے کہ امیر خسرو کے تین دیوان ہیں۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیوٰۃ۔ غُرّۃ الکمال۔ لکھنؤ میں جو دیوانِ خسرو چھپا ہے اُس کے دیباچے میں فرماتے ہیں: "اب تک میرے چار دیوان ہو چکے ہیں۔ تحفۃ الصغر۔ وسط الحیوٰۃ۔ غُرّۃ الکمال۔ بقیہ نقیہ۔ یہ مجموعہ انہیں اربعہ عناصر سے صورت پذیر ہوا ہے۔ اس کے بعد جو کلام موزون ہو گا وہ پانچواں دیوان ہو گا"۔ خاکسار کو ایک قلمی مجموعہ ملا ہے جس کا نام نہایۃ الکمال ہے۔ جس میں دیباچہ۔ قصائد غزل وغیرہ سب کچھ ہے۔ ممکن ہے کہ۔ پانچواں

دیوان ہو۔ دیباچے میں اس کا ذکر نہیں کہ یہ کونسا دیوان ہے۔ اس کے سوا میرے یہاں ایک اور ضخیم قلمی نسخہ ہے۔ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مستقل مجموعہ ہے یا عطر مجموعہ۔ لکھنوی نسخے کی بعض غزلیں اس میں ہیں (جو مختلف دیوانوں کی ہیں) لیکن اس کی بیسیوں غزلیں اس میں نہیں۔

تحفۃ الصغر ہاتھ آیا تو اُس کے دیباچے کا خلاصہ ناظرینِ مخزن کی نذر کیا گیا۔ اب خوبیٔ قسمت سے غرۃ الکمال کا دیباچہ دستیاب ہوا ہے۔ شوق کہتا ہے کہ اس کے جواہرات بھی مخزن کو بھیج اگرچہ جوہری سات سمندر پار علم کے موتی رولنے چلا گیا لیکن جواہر خانے کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ ۵

ہنوز آں ابرِ رحمت دُر فشان است

مے و میخانہ با مہر و نشان است

خدا اس خزانے کو معمور رکھے۔ غریب الوطن دوست کی نشانی ہے۔ دیباچہ غرۃ الکمال کے نو صفحے ہیں۔ عبارت اوّل سے آخر تک مرصّع اور رنگین ہے۔ مگر دربارِ خسروی کا یہ آداب ہے کہ مرصّع اور رنگین عبارت کا خلعت واقعات کو عطا ہوتا ہے۔ کارچوبی پوشاک خیالی پیکر کو نہیں پہنائی جاتی۔ حمد کے بعد نعت ہے نعت کے بعد پیر کی مدح۔ پھر سلسلۂ سخن یوں آغاز فرماتے ہیں کہ انسان کا سرمایۂ ناز نطق ہے۔ اور نطق قدرتِ الٰہی کا برگزیدہ نمونہ۔ اسی سلسلے میں لکھتے ہیں کہ دیکھو بہرا اور گونگا چونکہ فیضِ سخن سے محروم ہے لہٰذا کسی بزم میں توقیر نہیں پاتا۔ طوطی اور شارک (مینا) حالانکہ جانور ہیں مگر انسانی کلام کی نقالی کی بدولت وہ قدر پاتے ہیں کہ انسان کی خوش بیانی کی مثال اُن سے دی جاتی ہے۔ نمونۂ عبارت ملاحظہ کیجئے:—

"طوطی[۱۵] کہ حیوان غیر ناطق است بسببِ نطقِ عاریتی درجے یافتہ است کہ اربابِ الباب جملہ فصحاء عالم و فضلاء عالم را نسبتِ سخن برو میکنند و مدام قفسِ عزت اورا در بالین گاہ سران و بائین جائے سروران بآئینِ مکنت مکانے بلند ارزانی میدارند . . . .

[۱۵] طوطی جو ایک حیوان غیر ناطق ہے اُس کا درجہ عارضی گویائی کی وجہ سے اتنا بلند ہے کہ سارے عقلا فاضلوں اور فصیحوں کی گویائی کو اس کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اور اسکا پنجرہ سرداروں کے یہاں سربلند ہے

ودر سوادِ ہندوستان کہ خیالِ بہشت در آئینہ بالہای طاؤسان او بتواں دید۔ مرغیست[له]
کہ آنرا شارک میگویند ودر خراسان سار میخوانند۔ وایں سبز سار در طوطیانِ جہان
حیران نمودہ کہ زبان آموزان ماہر (دانا بھول) مُہرِ دہانش چنان باز میکنند کہ ....
.. بسخنِ شیریں شکر خواری مے شود کہ پیشِ او بلبلاں را گاہ شکر خائی زبان شیریں
در کام گرفتہ میگردد بلکہ فن در دہان .. .. بازہم در .... ہندوستان
زنار داراند .... زبان ایشاں بر بیان منطق الطیر را قواعد نہادہ چنانچہ
در معرفت بانگ زاغ کتاب ہا ساختند وچیزے از مغیبات از آں سواد میتوانند کہ
بخوانند۔ واز تیزی زبان گنجشک بالقطع فالے میگیرند ومیگویند کہ بیشتر موافق
ومقابل مے افتد۔ بعضے مردان ناقص عقل کہ از مرتبہ عاقلی غافل اند ایشاں را
بجہت بیان منطق مرغے کہ میگوید ونمیداند کہ چہ میگوید شب وروز پرستش پرستش
میکنند وہر روایتے کہ آں بیچارہ از یں علم مے آرند آں جمع غیر سلامت وبنوہ نحو
آں میکنند ومتعلم وتلمذ بپذیرند۔

له ملک ہندوستان میں جسکے طاؤس کے پروں میں بہشت کا جلوہ دکھلا رہے ہیں۔ ایک جانور ہے جسکو
شارک کہتے ہیں (مینا) اور خراسان میں اس کا نام سار ہے۔ یہ تمام دنیا میں مشہور ہے کہ ماہر لوگ اسکو
ایسی اچھی طرح بولنا سکھاتے ہیں کہ بلبل اس کے سامنے بولنا بھول جاتی ہے۔

ہندوستان میں ایک گروہ ہے جسکی نسبت مشہور ہے کہ وہ پرندوں کی بولی سمجھتا ہے۔ چنانچہ
اس نے کوے کی آواز پر کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ جن سے وہ غیب کا حال بیان کرنے کا دعویٰ
رکھتا ہے۔ چڑیا کی آواز سے شگون لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ اکثر ٹھیک اور صحیح ہوتا ہے اور
بعض بے عقل کہ جو اپنے رتبہ سے ناواقف ہیں انکو جانوروں کی بولی سمجھنے والا سمجھکر رات دن
انکی پرستش و پرستش میں مصروف ہیں حالانکہ جن جانوروں کی وہ بولی ہے اسکو وہ (جانور) خود نہیں سمجھتے کہ ہم کیا
کہتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ نافہم بک دیتے ہیں یہ عقل اس کی تاویل گڑھتے ہیں اور انکی شاگردی اختیار کرتے ہیں۔

آگے یہ کہہ کر کہ انسان کیسا سادہ لوح ہے کہ باوجود نطق اصلی کے نقلی گویائی پر فریفتہ ہوجاتا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ **قطعہ**

گر بود بہتر زگفتِ آدمی گفتِ دگر　　　کے خدائے پاک مردم را خطابِ قُل کند
لیک نشناسد چو مردم قیمتِ گفتارِ خویش　　　فالِ میموں گیرد از پرندہ و غلغل کند
ناسپاسی میکند شاعر کہ با گفتِ چناں　　　ہر زماں وصفِ بیانِ قمری و بلبل کند
آرے آرے شاہ باچنداں خورش سر کرد و　　　خوب رویاں چناں رخسارِ میلِ گُل کند
نعمتِ کلیت نطق و گر بداند قدرِ آں　　　جزو جزو بندہ شکر نعمت آں کُل کند

فضیلتِ نطق ثابت کرکے اس کی دو قسمیں کی ہیں نظم و نثر۔ نثر پر نظم کی ترجیح کے جو دلائل لکھے ہیں اُن میں ایک یہ بھی ہے کہ موسیقی سا فن لطیف نظم کا محتاج ہے ۔ نظم نہ ہو تو ریشیم کے ساز کے نغمے بھی بے لطف ہیں ۔ کلیات میں یہ مضمون کیسے پاکیزہ پیرائے میں ادا کرتے ہیں **قطعہ**

مطربے میگفت خسرو را کہ ای گنجِ سخن　　　علم موسیقی زجنس نظم نیکوتر بود
زانکہ ایں علمیست کز دقت نیاید در قلم　　　واں نہ دشوار ست کاندر کاغذ و دفتر بود
پاسخش گفتم کہ من در ہر دو معنی کاملم　　　ہر دو را سنجیدہ بر وزنیکہ آں بہتر بود
فرق من گویم میانِ ہر دو معقول و درست　　　تا دہد انصاف کاں از ہر دو دانشور بود
نظم را علمے تصور کن بنفسِ خود تمام　　　کو نہ محتاجِ سماع و صوت خنیاگر بود
گر کسے بے زیر و بم نظمے فرو خواند رواست　　　نے بمعنی ہیچ نقصاں نے بلفظ اندر بود
ور کند مطرب بسے ہاں ہاں و ہوں ہوں بسرود　　　چوں سخن نبود ہمہ معنی او ابتر بود
نائے زن را ہیں کہ صوتے دارد و گفتار نے　　　لاجرم در قول محتاجِ کسے دیگر بود
پس دریں صورت ضرورت صاحبِ صوت و سماع　　　از برائے شعر محتاجِ سخن پرور بود
نظم را حاصل عروسی داں و نغمہ زیورش　　　نیست عیبے گر عروسِ خوب بے زیور بود

سلسلۂ بالا میں متقدمین شعرا میں مولانا رضی الدین نیشاپوری اور مولانا ظہیر الدین فاریابی کے علم و فضل

کی مدح کرتے ہیں اور متاخرین میں مولینا شہاب الدین مہمرہ اور مولینا بہاء الدین بخاری کی۔ اِس بحث کو ختم کر کے نظمِ فارسی و عربی کا موازنہ کیا ہے۔ یہ تسلیم ہے کہ عربی اپنی خوبیوں میں پارسی پر فائق ہے لیکن نظم پارسی نظم عربی سے بہتر ہے۔ اور اس کی تین دلیلیں ہیں۔ اوّل شعر کی جان وزن ہے۔ دراشعارِ فارسی کا وزن عربی نظم کے وزن سے زیادہ لطیف اور کامل ہے۔ کیونکہ جو زحاف عربی شعروں کے وزن میں جائز ہے وُہ اگر فارسی شعر میں لے آئیں تو ناموزوں ہو جائے۔ فارسی نظم ایک حرف بلکہ ایک حرکت کے تغیر سے غیر موزون ہو جاتی ہے۔ عربی نظم میں حرف بلکہ لفظ کا تغیر بھی کھپ جاتا ہے۔ جو خوبی زبانِ فارسی میں ہے عربی کیا عبری وغیرہ میں بھی نہیں۔ واقف کار جانتے ہیں۔ دُوسری دلیل۔ عربی زبان اپنی وسعت کے لحاظ سے بے پایان ہے۔ ایک معنی کے لئے ہزار لفظ اور ایک لفظ کے لئے دس معنی۔ جس کے قبضے میں یہ خزانہ ہو وُہ کسی موقع پر تنگدست نہیں ہو سکتا۔ فارسی میں برعکس ہے۔ یہاں ایک لفظ کے ایک سے زاید معنے بہت کم ہیں۔ اِنصاف سے دیکھئے پارسیوں کو کس قدر دشواری نظم میں مطلب ادا کرنے میں ہے اور عربی دانوں کو کس قدر آسانی۔ تیسری دلیل۔ ہم عربِ عَربا (خالص عرب) کے کلام سے بحث کرتے ہیں۔ وہاں قافیہ ہی قافیہ ہے۔ اگرچہ اہل فارس نے عربی نظم میں ردیف کو داخل کیا ہے لیکن اُنکا کلام ٹکسالی نہیں۔ فارسی میں قافیے کے ساتھ ردیف بھی ہے اور ردیف نظم کے لئے سرمایۂ آرایش و زیبایش ہو۔ خلاصہ یہ کہ عربی شعر عرب میں کیا باعتبارِ وزن اور کیا بلحاظِ وسعتِ زبان و ترکِ ردیف ہر طرح آسانی ہے باایںہمہ خوبی معنی کے لحاظ سے فارسی شاعری عربی شاعری سے بالاتر ہے۔ اس موقع پر یہ اعتراض نہیں کرنا چاہئے کہ شعرِ عربی کا مرتبہ اس لئے بلند ہے کہ اُس سے کلامِ ربّانی کی تائید ہوتی ہے اور نہ یہ کہ خود کلامِ ربّانی اس زبان میں نازل ہوا ہے۔ کیونکہ مَیں یہ خود تسلیم کرتا ہُوں کہ فارسی کلام اس مقام میں بمقابلہ عربی محض ہیچ اندر ہیچ ہے۔ ؎

درآں مقام کہ از شرعِ مصطفےٰ گویند نعوذ باللہ کہ از شاعری سخن رانم

لیکن یہ موقع شرعی بحث کا نہیں۔ ارباب معنی کو مضامینِ خاقانی کی بلندی۔ کلامِ انوری کی روانی۔
سبک حسن۔ نظامی وظہیر کی نظم کا حسن پیشِ نظر رکھ کر انصاف فرمانا چاہیئے۔ مقام دعویٰ سے مقام
انصاف میں آئیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم لُطف زبان عربی کے قائل ہیں وُہ لُطف نظم فارسی کے
وزن کو مانیں۔ ایک لطیف کا مقابلہ دُوسرے سے ہوگیا۔ ہمارے یہاں خیالات بدیع ہیں۔
اُن کے یہاں تخیلات رفیع یہ دونوں بھی برابر ہے۔ ہمارے ردیف کے مقابلے میں وُہ کوئی
خُوبی پیش نہیں کر سکتے۔ لہٰذا پارسی شعر کو فوقیت رہی۔ سلسلہ کلام دراز ہوچکا۔ دیباچے میں
اس سے زیادہ گنجایش نہیں لیکن ایک مضمُون جو دِل میں چُبھ رہا ہے بے اختیار زبانِ قلم پر
آتا ہے۔ یہ بات ثابت ہے کہ پارسیوں کو شاعرانہ طبیعت کے لحاظ سے عربوں پر ترجیح ہے۔
اگر عرب کا شاعر کامل وفصیح ملک فارس میں جائے۔ تو ممکن نہیں کہ وُہ زبان پارسی میں بات چیت بھی
صحیح اور درست طور پر کر سکے۔ معانی اہل فارس کا استنباط کرنا یا پارسی نظم وانشا پر قادر ہونا تو
دُوسری بات ہے۔ اس کے برخلاف پارسی کا شاعر اپنے مُلک میں عربی ادب وفضل حاصل کرکے
شعر عربی کہہ سکتا ہے بلکہ عربی الفاظ کو معانی پارسی سے ربط دیکر ایسا عُمدہ مجموعہ تیار کرسکتا ہے
کہ جو منصف مزاج دونوں مزوں سے واقف ہوگا وُہ بے اختیار احسنت کہہ اُٹھیگا۔ اور اگر شاعر
مذکُور ملکِ عرب میں جا پہنچے تو وہاں کے فصحا۔ کو اُس کے علم وفضل کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ زمخشری[1]
خوارزم کا باشندہ تھا عرب میں علّامہ مشہور ہُوا۔ سیبویہ[2] جو مجمل چھوڑ گیا تھا اُس نے مفصّل کردیا۔
ہندوستان کے باشندے طباعی میں تمام عالم سے بڑھے ہُوئے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہو کہ
عرب۔ خراسانی۔ تُرک۔ ہند وغیرہ جو ہندوستان کے اسلامی شہروں میں (مثلاً دہلی۔ ملتان۔
لکھنوتی) نہ اُن شہروں میں جو ہندؤں کے مرکز ہیں (مثل گجرات۔ مالوہ۔ دیوگیر) آئے اور تمام
عُمر یہاں کی زبان سیکھی ناممکن ہو کہ اُسکو صحیح اور درست بول سکے۔ اپنے ہی ملک کے انداز پر گفتگو
کریگا۔ عرب عربی پر قادر ہوتے ہیں جب یہاں کی بولی بولتے ہیں بھرم کُھلجاتا ہے۔ ہند وخواہ

[1] علامہ زمخشری مُصنّفِ تفسیر کشاف ومفصّل وغیرہ۔ [2] نحو کا امام مشہور۔ جو اس فن کے مُوجدوں میں ہو۔

شہر کے باشندے ہوں خواہ گانو کے دہلی میں آکر رہتے اور زبانِ پارسی سیکھتے ہیں۔ لیکن ماہر ہرگز نہیں ہوتے۔ خراسانی۔ عراقی۔ شیرازی اور ترک کی جودتِ طبع زبانِ ہندی کے آگے سر جھکا دیتی ہے اور وُہ بیچارے ہر چند کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں مُنہہ کی کھاتے ہیں۔ جو اہلِ قلم ہندوستان کے اسلامی شہروں خصوصًا دہلی میں نشو و نما پاتے ہیں۔ وُہ ہر مُلک کی زبان بولنے اور اُس میں نظم و نثر لکھنے پر قادر ہوتے ہیں۔ جس دیس میں پہنچ جائیں اُسی کی روش پر چل سکتے ہیں۔ یہ بات تجربے ثابت ہو چکی ہے کہ ہم میں بہت سے ایسے ہیں جنہوں نے ملکِ عرب دیکھا بھی نہیں تاہم زبانِ عرب کو اس فصاحت کے ساتھ حاصل کیا کہ بلغائے عرب اُن کے مرتبے کو نہ پہنچ سکے۔ اور بہت سے تاژیک (مقابل تُرک جیسے عجمی مقابل عربی) میں[1] نے دیکھے ہیں کہ اُنھوں نے زبانِ تُرکی ہندوستان میں سیکھ کر وُہ گویائی حاصل کی کہ اس گروہ کے فصحا اُن کی زبان سُنکر دنگ رہ گئے۔ زبانِ پارسی کی یہ کیفیت ہے کہ ہر چند وُہ پارس سے یہاں آئی ہے لیکن سوائے ماوراءالنہر کے (جہاں کی پارسی ہندوستان کی پارسی کے مطابق ہے) کسی مُلک کی فارسی کے الفاظ درست نہیں۔ خراسانی "چہ" کو "چی" اور بعضے "کجا" کو "کجو" کہتے ہیں۔ کتاب میں دیکھو "چہ" اور "کجا" لکھا جاتا ہے اور الفاظ صحیح وُہی ہیں جو کتابی ہوں۔ اُن کے یہاں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو اس کسوٹی پر کھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ اِسکے برعکس ہندوستان کی فارسی دریائے سندھ کے کنارے سے سمندر کے کنارے تک یکساں اور دری (خالص اور ٹکسالی) فارسی[2] ہے۔ ہندوستان کی زبان[3] کا یہ حال ہے کہ ہر سو کوس پر اَور بولی ہے۔ پارسی اس

---

[1] امیر خسرو کی مادری زبان ترکی تھی۔

[2] آگے چلکر تم دیکھو گے کہ ملتان سے لیکر بنگالے کے انتہا تک امیر خسرو مختلف مقامات میں رہے تھے لہذا اُنھوں نے جو کچھ لکھا ہے سُنکر لکھا ہے سُنی سُنائی بات نہیں لکھدی۔ ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے اگرچہ عہدِ سلطان محمود سے (چوتھی صدی ہجری کے آخر میں) شروع ہو گئے تھے۔ لیکن مستقل سلطنت قطب الدین ایبک نے آغاز صدی ہفتم میں قائم کی۔ امیر خسرو نے جس زمانے میں دیباچہ لکھا ہے وُہ ساتویں صدی کا آخری زمانہ تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت کا غایت اقتدار تھا کہ سو برس سے کم عرصے میں ٹکسالی فارسی پنجاب سے انتہائے بنگالہ تک مادری زبان ہو گئی۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ آج سے چھ سو برس پیشتر بھی ہندوستان میں کوئی عام زبان نہ تھی اگر تھی تو فارسی تھی۔

چار ہزار کی میل میں ایک ہی ہے۔ اور پھر اس خوبی کے ساتھ کہ گفتگو کتابی زبان کے مطابق ہے ... کی طرح نہیں ہے جو کردہ "کو کردہ کن" اور "کردہ ہین" بولتے ہیں۔ نہ سیستانیوں کے مثل جو ہر لفظ کے آخر میں "ہیں" ضرور بڑھاتے ہیں جیسے "گفتہ ہیں"۔ اور "رفتہ ہیں"۔ ولایت کے آنے والے علما و فصحا (عوام اور اوباش کا ذکر نہیں) دہلی کے فارسی کی مدح کرتے ہیں اور اہل دہلی انکی زبان پر ہنستے ہیں۔ یہاں کی زبان پر وہ گرفت نہیں کر سکتے اس لئے کہ یہاں کی زبان "نرم و شستہ و لطیف و نظیف و درست و فصیحانہ" ہے۔ لطف یہ ہے کہ ہم سب کی بولی بولتے ہیں ہماری (موزون) بولی کوئی نہیں بول سکتا۔ جو ہماری (ہک) زبان پہ کلام کرے۔ اُس پر میرا یہی دیباچہ حجت ہے

(۱) انقلاب پر دیباچہ کی عبارت منقول ہے

گو بیا و ببین و دم در کش گر دگر گوں بود قلم در کش

اہل دہلی کی زبان کی خوبی جس کو تسلیم نہ ہو اُس کو میرے سامنے لے آؤ تاکہ اُس کا دعویٰ سر تسلیم خم کر دے۔

اس سلسلے کے بعد لکھا ہے کہ شعر و سخن پر اس بُنیاد پر اعتراض کرنا کہ اُس میں ہجو و ذم وغیرہ مذموم مضامین ہوتے ہیں بجا نہیں۔ اس لئے کہ قابلِ مذمت یہ مضامین ہیں نہ نظم۔ کمال کی مدح سرائی میں سیف الدولہ اور متنبی کا یہ لطیف لطیفہ درج کر گئے ہیں۔ مشہور ہے کہ سیف الدولہ متنبی کے سامنے شعرا کی فلاکت او بے سر و سامانی پر طعن کر بیٹھتا تھا۔ اور مال کی بحیثیت مربی کمال ہونے کے تعریف کیا کرتا تھا۔ ایک روز سیف الدولہ حمام میں تھا متنبی کو بھی بلا بھیجا۔ دو نو لنگی باندھے ہوئے تھے۔ خلوت تھی اور امیر کی طبیعت شگفتہ۔ زندہ دل شاعر کو فی البدیہ ایک مضمون سوجھا۔ عرض کی کہ جہاں پناہ اسوقت آپ کی اور بندے کی یہ حالت ہے کہ سوائے ایک لنگی کے کچھ پاس نہیں۔ متنبی تو اب بھی متنبی ہے۔ مگر حضور ذرا غور فرمائیں کہ کتنے پانی میں ہیں۔ سیف الدولہ متنبی کی سیف زبانی سے کٹ گیا اور بل کھا کر کہنے لگا "أَنَسِيتَ قِرْبَتَكَ" یعنی کیا تو اپنی مشک بھول گیا (متنبی کی نسبت مشہور ہے کہ سقا تھا) متنبی نے برجستہ کہا "أَنسَانِي قُرْبُكَ" یعنی آپکے تقرب نے بھلا دی۔ جواب کی آبداری غصے کی جلتی آگ پر پانی کا کام کر گئی۔ شعراء کی تین قسمیں

قائم کی ہیں ۔ اوّل صاحب طرزِ خاص و جدید ۔ جیسے حکیم سنائی ۔ انوری ۔ ظہیر و نظامی ۔ چونکہ خاقانی مجیر و بیلقانی ،کا اور کمال اصفہانی رضی الدین نیشاپوری کا اور مُعزی مسعود سعد سلمان کا تتبع کرتے ہیں بس لئے اس قسم سے خارج ہیں ۔ دوم جو متقدمین یا معاصرین میں سے کسی کی طرز کے پیرو ہوں سوم جو پرائے مال کو تاکیں ۔ اوّل اُستاد ہیں دُوسرے شاگرد تیسرے غارتگر ۔ جس باکمال میں چار شرطیں جمع ہوں وُہ اُستاد مانا جائیگا ۔ پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی طرز اَوروں سے ممتاز ہو ۔ دُوسری یہ کہ اُس کے کلام کی عذوبت و سلاست شعرا کی طرز پر ہو نہ واعظوں اور صوفیوں کے انداز پر ۔ تیسری یہ کہ کلام خطا سے پاک ہو ۔ اور چوتھی یہ کہ اِدھر اُدھر کے پیوندوں سے اپنا مرقع آراستہ نہ کرے یعنی اَوروں کے مضامین نہ اُڑائے ۔ شاگرد تین طرح کے ہوتے ہیں ۔ شاگرد اشارت ۔ شاگرد عبارت اور شاگرد غارت ۔ شاگرد اشارت کی یہ صُورت ہے کہ مُبتدی کا شعر وزن میں گر جائے یا مضمون خبط ہو جائے ۔ تو اُستاد دانا اشارہ کر دے کہ اسکو یُوں درست کرو اور یُوں باندھو[۵۸] ۔ یونہی اشاروں اشاروں میں مُبتدی فن کی باریکیاں سمجھنے لگتا ہے ۔ شاگردِ عبارت وُہ مُبتدی ہے کہ اُستادوں کی پیروی کرے اور اُن کے کلام میں جو لفظ اور معنی دیکھے اُنکو اپنے کلام کا نمونہ قرار دے ۔ شاگرد غارت وُہ حریف ہیں جو خود کچھ کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر مُصنف بنے پھرتے ہیں ۔ یہ لوگ اُستادوں کے خزانے سے مال نکال کر اپنے ویرانے میں رکھتے اور دُوسروں کے قطرہائے خُون کو اپنا جگر گوشہ بتاتے ہیں ۔ خدا ایسے بے شرموں کے شر سے بچائے ۔ یہ نہ سمجھنا کہ اُستادی اور شاگردی کی بحث میں نے اس لئے اُٹھائی ہے کہ مجھ کو اُستادی کا دعویٰ ہے حاشا ۔ مَیں نے جو شرطیں اُستادی کی قرار دی ہیں اُن میں سے بعض مجھ میں موجود نہیں وجہ یہ کہ میرے کلام کے بہت سے شعبے ہیں اور وُہ اربعہ عناصر سے مرکب ہیں ۔ وعظ اور حکمت پر جو کچھ مَیں نے لکھا ہے اُس میں سنائی غزنوی کی پیروی کی ہے ۔ اور یہ انداز بوجہ بلندی آگ سے مشابہ ہے ۔ جو عالمِ بالا کی طرف میل رکھتی ہے ۔ مخلص (قصیدہ) اور خلاصہ خیال میں طرزِ عنصری و کمال اختیار کی ہے جو روانی اور صفائی میں پانی سے ملتی جُلتی ہے ۔ غزل اور مثنوی میں مصحفی و نظامی کے

[۵۸] معلوم ہوا کہ اصلاح کی اتنی ہی حد ہے ۱۲

قدم بہ قدم ہوں۔ اِس روش کو بلحاظِ لطافت و شادابی ہوا سے مناسبت ہے۔ میرے کلام کا حصہ مقطعات۔ رباعیات معما و لُغز خود میرے وجُود خاکی کا غبار ہے۔ جو اس لحاظ سے نمک ہے کہ اُس میں بہت سے جواہرات چھپے ہُوئے ہیں۔ میری نثر بھی میری ہی طبیعت کا جوہر ہے اور نثر کے معاملے میں کسی کا ممنُونِ احسان نہیں ہوں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اُستادی کی چار شرطوں میں سے پہلی شرط یعنی صاحب طرزِ خاص ہونا مجھ میں موجُود نہیں۔ مَیں خود کہہ چکا ہُوں کہ مَیں نے بہت سے اساتذہ کا تتبع کیا ہے۔ دُوسری شرط کہ کلام خطا اور قصُور سے پاک ہو اور اسکا بھی مجھ کو دعویٰ نہیں۔ بندے کی نظم اگرچہ رواں ہے لیکن غزل اور لغز (چیستاں) میں جابجا لغزشیں بھی ہیں ("نظمِ بندہ اگرچہ بیشتر روانست اما جابجا در غزل و لغز لغزیدنی ہم ہست") دونوں مذکورۂ بالا شرطوں کی نسبت مجھ کو اقرار ہے کہ پایۂ اُستادی تک میری رسائی نہیں۔ رہی تیسری شرط یعنی کلام شاعرانہ ہو نہ واعظانہ و صوفیانہ۔ مجھ کو دعویٰ ہے کہ میرا کلام شاعرانہ ہے صوفیانہ اور واعظانہ نہیں ہے۔ چوتھی شرط کہ مقطع دوزی نہ ہو یہ بھی مجھ میں موجُود ہے مَیں نے آج تک دُوسروں کے متاع نہیں تاکے۔ قصۂ مختصر مَیں مالکِ طرزِ خاص نہیں۔ خطا سے میرا کلام پاک نہیں۔ میرا کلام اسلوب شُعرا کے مطابق ہے سرقہ مَیں نے نہیں کیا۔ بس اُستادی کی دو شرطیں مجھ میں ہیں دو نہیں ہیں۔ مَیں نے اپنا محاکمہ خود کر دیا کہ سندِ اُستادی نصف میرے قبضہ میں ہے نصف نہیں ہے

ع ناتمام ناتمام ناتمام +

(باقی آیندہ)

ہندوستان

(۱)

اگر تم کسی طرح ہوا میں اتنے اونچے پہنچ جاؤ جتنا اونچا عقاب اڑتا ہے اور پھر وہاں سے ملک ہندوستان پر نظر ڈالو تو تمہیں ایک بڑا لمبا چوڑا زمین کا قطعہ بحر ہند کی طرف پھیلتا ہوا دکھائی دیگا شکل میں یہ بہت کچھ مثلث سے ملتا ہے۔ مثلث کہتے ہیں تکونی شکل کو۔ اس کے پورب کو دو سے ایک اور ٹکڑہ خشکی کا دکن کی طرف کچھ دور سمندر میں نکلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ یہ صوبہ برہما ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف بھی خشکی کا کچھ حصہ آگے کو نکل گیا ہے۔ یہ صوبہ سندھ ہے۔ اگر ادھر سے سندھ اور ادھر سے صوبہ برہما ہندوستان کی سرزمین سے تراش دیئے جائیں تو پھر یہ ہو بہو مثلث معلوم ہوگا جسکی چوٹی راس کماری سمجھو۔ مثلث کی چوٹی اوپر اتر کی طرف ہوا کرتی ہے۔ لیکن تم یہ سمجھ لو کہ یہ الٹا مثلث ہے۔ جسکی چوٹی نیچے دکن کی طرف ہے۔ اگر اس مثلث کی اتر کی طرف دیکھو تو تمہیں اس سرے سے اس سرے تک ایک بڑا بھاری سلسلہ پہاڑوں کا دکھلائی دیگا۔ یہ ۱۵۰۰ میل لانبا ہے اور ہمالیہ پہاڑ کہلاتا ہے۔ یہ ساری دنیا کے پہاڑوں سے بڑا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے اس کے کتنے ہی حصے ہیں۔ ان میں مشہور یہ ہیں۔ پورب کی طرف نیپال۔ سکم۔ بھوٹان یہ تینوں خودسر ریاستیں ہیں۔ اور پچھم کی طرف کماؤن۔ گڑھوال۔ الموڑہ۔ نینی تال۔ شملہ۔ ڈلہوزی۔ چمبہ۔ کاشمیر۔ ہمالیہ کی بعض چوٹیاں اتنی اونچی ہیں کہ بادلوں کے تختے سے بھی اونچی نکل گئی ہیں۔ اور ان پر بارہ مہینے برف جمی رہتی ہے۔ جیسے کچن چنگا۔ دھولگڑہ۔ ایورسٹ۔ یہ زمین سے کوئی ۲۹۰۰۰ فیٹ یا کچھ کم دس ہزار گز اونچی ہے۔ اور سدا بادلوں میں چھپی رہتی ہے۔ اس پہاڑی سلسلہ کے ہونے سے تمہیں یہ فائدہ ہے کہ اگر کوئی غنیم اتر کی طرف سے تمہارے ملک پر حملہ کرنا چاہے تو ہمالیہ کی یہ لوہا لاٹھ دیوار اسے ایک قدم بھی نہیں بڑھنے دیگی۔ ہمالیہ پربت کے بیچوں بیچ۔ دھولگڑہ کی چوٹی ہے جو ۲۸۰۰۰ فیٹ یا کچھ کم ۹۴۰۰ گز اونچی ہے۔ اگر تم دھولگڑہ سے دکن کی طرف سیدھے نظر دوڑاؤ تو اس کماری

تک پہنچنے میں کوئی دو ہزار میل کا راستہ طے کرنا پڑیگا۔ لیکن اس راستے میں افریقہ کے سے نرے گرم خشک۔ اُجاڑ ریگستان ہی نہ ملینگے۔ کہ انہیں دیکھ کر وحشت ہو۔ نہ کہیں مُلک رُوس کے سے صرف بنجر اور چٹیل میدان سُوجھینگے۔ بلکہ دھولاگڑہ کی ہیبت ناک اُونچائی سے اُترتے ہی ایسا معلوم ہوگا کہ گویا تم ایک پھلے پھولے باغ میں داخل ہو رہے ہو۔ پہاڑ کے دامن سے تھوڑی دُور چلکر وُہ سرزمین آتی ہے جس میں سے گنگا ہو کر گذرتی ہے اور پورب دکن کے رُخ بہتی ہُوئی خلیج بنگالہ میں جا گرتی ہے۔ گنگا کے پانی کی بدولت یہ علاقہ بڑا سرسبز اور پیداوار کا ہے۔ یہاں طرح طرح کے پھل پھول اور غلے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ وُہی سرزمین ہے جہاں ہزاروں برس ہوئے کہ آریہ قوم اُتر پچھم کے کھونٹ سے ہندوستان میں داخل ہو کر دریا کے کنارے آباد ہُوئی تھی۔ وُہ اس علاقے کو آریہ ورت کہتے تھے۔ اور جغرافیہ میں اس کو وادی گنگا کہتے ہیں۔ گنگا کے علاوہ ایک اَور بڑا دریا پورب کی طرف ہمالیہ پہاڑوں سے بہتا ہوا خلیج بنگالہ میں گرتا ہے۔ یہ برہمپتر ہے۔

برہمپتر کی وادی بھی اتنی ہی سرسبز ہے۔ اسی طرح پچھم کی طرف ایک اَور بڑا دریا ہے جو اُتر پچھم کے کونے سے بہکر اور پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لیکر مُلک سندہ میں داخل ہوتا ہے اور پھر یہاں سمندر میں جا گرتا ہے۔ یہ دریائے سندہ ہے۔

برہمپتر۔ گنگا۔ سندہ ان تین دریاؤں کے سبب ہندوستان کا اُتر کا حصہ ایک گلزار بن گیا ہے۔ جس میں طرح طرح کی قدرتی نعمتیں موجود ہیں۔ الغرض دھولاگڑہ کی چوٹی سے اُتر کر اور پہاڑ کے دامن کو طے کر کے تمہاری نظر اس وادی گنگا کی سیر کرے گی۔ پھر بندھیاچل پہاڑوں کا سلسلہ ملیگا۔ یہ سلسلہ ہندوستان کی پُرفضا زمین کے بیچ میں اس طرح واقع ہے جس طرح کوئی آدمی نفیس لباس پہنکر کمر میں ایک خوبصورت پٹکا باندھ لے۔ بندھیاچل کی اونچی نیچی چوٹیوں اور بڑی بڑی گھاٹیوں سے گذر کر تھوڑا ہی آگے بڑھ پاتے ہیں کہ ایک دُوسرا پہاڑی زنجیرہ پیش آتا ہے۔ یہ ست پُڑا ہے۔ اور سرسبزی و شادابی میں بندھیاچل پہاڑ سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دونوں کے بیچ کا علاقہ دریائے نربدا کی وجہ سے نہایت ہی ہرا بھرا ہے۔ یہ پُورب سے پچھم کو بہتا ہوا خلیج کھمبایت میں جا گرتا ہے۔ جہاں ست پُڑا پہاڑ کا

دامن ختم ہوتا ہے وہیں سے ملکِ دکن شروع ہو جاتا ہے۔ اسکو جزیرہ نمائے ہند بھی کہتے ہیں۔ اس علاقہ میں بھی دو مشہور دریا ہیں یعنی گوداوری اور کرشنا جو پچھم سے پورب کی طرف سرزمینِ دکن کو مالا مال کرتے ہوئے کارومنڈل گھاٹ پر سمندر میں جا گرتے ہیں۔ عقاب کی اونچائی سے تم شہر اور قصبے نہیں دیکھ سکتے۔ کیونکہ یہ چھوٹی چیزیں ہیں ملک کی بڑی اور ابھری ہوئی چیزیں پہاڑ اور گھاٹیاں اور دریا اور میدان ہی ہیں۔ یہ ایسے ہیں جیسے کسی آدمی کے چہرے پر آنکھ۔ ناک۔ کان خاص دکن سے راس کماری تک کوئی ابھری ہوئی چیز نہیں سوجھتی۔ البتہ مالا بار گھاٹ کے برابر اُتر دکن میں ایک لمبا سلسلہ پہاڑوں کا چلا گیا ہے جو کچھ کچھ ایسا ہے جیسے سمندر کی زبردست موجوں کے تھپیڑ سہنے کے لئے پتھروں کی ٹکر یا سدِ آب بنا لیتے ہیں۔ یہ نیلگری پربت ہے۔ اسی طرح کارومنڈل گھاٹ پر بھی دُور دُور تک ریت کے بیابان اور اوپر چلکر خلیج بنگالہ کے قریب دلدل پھیلی ہوئی سوجھتی ہے۔ اگر مالا بار اور کارومنڈل کو دکن کی دامن سمجھیں تو ادھر نیلگری پربت کا زنجیرہ ادھر ریت اور دلدل کا سلسلہ ان دامنوں کی سنجاف ہیں۔ اُتر کی طرف اگر ہمالیہ پربت نہیں غنیم کے حملے سے بچائیگا تو دکن کی طرف نیلگری پربت کی سنگین دیوار اور ریگستان دشمن سے محفوظ رکھینگی۔

اِس طرح ہندوستان اُن قدرتی فصیلوں کی وجہ سے گویا ایک قلعہ بند شہر ہے۔ وہ کونسی قدرتی خوبی ہے جو ہمارے ہندوستان میں نہیں ہے۔ پہاڑ اتنے اونچے اونچے اور لمبے کہ یورپ کا الپس پہاڑ بھی اُن کے سامنے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ بعض چوٹیاں اتنی اونچی معلوم ہوتی ہیں کہ انسانی قدموں نے آج تک اُنکو چھوا نہیں اور نہ کبھی چھو سکینگے۔ میدان ایسے سرسبز۔ ہموار اور ایسے لمبے چوڑے کہ اگر اُنکو زمرد کے بحیرے سے تشبیہہ دیجائے تو بجا ہے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے گویا سبز مخمل کا فرش پھیلتا چلا جاتا ہے اور آخر کو اُفق میں چھپ جاتا ہے۔ مالابار جیسے وسیع گھاٹ جس پر پہاڑوں کا زنجیرہ کھنچا ہوا ہے سمندر کے نیلگوں پانی کی موجوں کو اوپر نہیں اُٹھنے دیتا۔ کیونکہ سمندر کی طرف زمین ڈھلوان ہوتی گئی ہے۔ سال میں جتنا مینہہ یہاں برستا ہے اتنا دُنیا کے کسی اور حصہ میں نہیں برستا۔ وہ وہ چٹیل اور بنجر میدان ہیں کہ افریقہ کے صحرا بھی اُنکے آگے گرد ہیں۔ جنگل ایسے گنجان اور وسیع کہ

انجنوں کا پتہ نہیں لگتا۔ جیسے کجلی بن میں لکھوکھا درخت اور بیلدار جھاڑیاں سینکڑوں پیچ و خم کھا کر زمین سے بلند ہوتے ہیں۔ یہاں کے دریا اگرچہ لمبائی چوڑائی اور شان میں مصر کے رود نیل اور امریکہ کی مس سپی کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ مگر ملک کو سرسبز کرنے اور عام فائدہ پہنچانے میں ان سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ جیسے برہم پتر اور دریائے گنگا اپنے معاونوں سمیت باغ ہندوستان کے پورب کی طرف کے حصے میں پانی دیتے ہوئے خلیج بنگالہ میں گرتے ہیں اور دریائے سندھ پنجاب کے پانچوں دریاؤں کو ساتھ لئے اس باغ کے پچھم کے حصے کو سینچتا ہوا سمندر میں گرتا ہے اسی طرح نربدا۔ تاپتی اور مہاندی وسط باغ کی آبیاری کرتے ہیں اور گوداوری اور کرشنا دکن کے حصے کو سیراب کرتے ہیں۔ خیال کرو کہ یہ دریا سالانہ کتنے کروڑ من ریت اور مٹی سرزمین ہند سے بہا کر سمندر میں لیجاتے ہونگے۔ ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنا تو ناممکن ہے لیکن علم طبقات کے عالموں نے تخمینہ لگایا ہے کہ اگر ایک ہزار جہازوں کا بیڑا بنایا جائے اور ہر جہاز اتنا بڑا ہو کہ ۲ ہزار ٹن (۲۸ من = ٹن) بوجھ اٹھا سکے تو جتنا ریت مٹی یہ تمام بیڑا لیجائیگا اتنا ہی ریت ایک سال میں ہندوستان کے دریا سمندر میں بہا کر لیجاتے ہیں۔ پیداوار کے اعتبار سے دیکھو تو بھی ہندوستان دنیا کے کسی ملک سے کم نہیں۔ ایک ایک کرکے تو گننا مشکل ہے لیکن خلاصے کے طور پر یہ بتلایا جاتا ہے کہ دنیا کے تمام حصوں میں سے صرف ان حصوں کی پیداوار جو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے آس پاس ہیں یا سمندر کے ایسے گھاٹے پر ہیں جہاں آج تک انسان نہیں پہنچا ان پیداواروں کے سوا اور تمام روئے زمین کی پیداوار ہندوستان میں موجود ہے اور اگر نہیں ہے تو پیدا ہوسکتی ہے۔ کیونکہ یہاں کی زمین میں ہر طرح کی پیداوار کی صلاحیت ہے۔ ہر طرح کا غلہ۔ گیہوں سے لیکر جو اکثر اونچان میں پیدا ہوتا ہے اور چاول تک جو ہمیشہ دلدل میں پیدا ہوتا ہے جیسے بنگالہ یا دکن کے آس پاس کی زمین جو نچان میں ہے۔ ہر قسم کے میوے۔ لنگا کی سیب سے جو پہاڑی زمین میں پیدا ہوتا ہے اور انبہ اور امرود تک جو گرم سرزمین ہند میں پیدا ہوتا ہے ہر طرح کے پالو جانور (چوپائے) بیل اور کتے سے لیکر اونٹ اور ہاتھی تک۔ ہر قسم کے خونخوار جانور

بھیڑیا - بھگرا - شکاری جانور جیسے چیتا - ہر طرح کی کھالیں اور ہر طرح کے سمور سنجاب - شیر اور ریچھ سے لیکر بکری تک قسم قسم کے مویشیوں کے چمڑے جو بڑے قیمتی اور کار آمد ہوتے ہیں - ہر طرح کی اون اور پشم پہاڑی بکروں سے لیکر لومڑی تک - ان میں بعض ایسی ہیں کہ اگر یورپ کی مشہور لیڈیوں میں لیجاؤ تو بڑی بڑی پرکھنے والی نہ بتلا سکیں کہ کیا ہے کیونکہ وہاں اب تک ان کو کوئی جانتا بھی نہیں - ہر طرح کی رسّی بٹنے کے درخت ریشہ دار - لگاگی سن - پتوارے - بانس - کیوڑہ اور ناریل تک اسی پہاڑ کی بنی ہوئی چیزوں کی بڑی شہرت ہے - ہر قسم کے تیل کے درخت ناریل سے لیکر جس کے تیل سے مومی بتیاں بنتی ہیں اور عطر گلاب تک جو سونے کے تول تُل کر بکتا ہے - ہر طرح کے رنگ روغن نیل سے لیکر لاکھ تک اور اس کے علاوہ سینکڑوں ہزاروں رنگ پیدا ہوتے ہیں - نیل خاصکر مشہور ہے - یہ ہندوستان کے اُتر کے ملکوں میں پیدا ہوتا ہے اسکی تجارت زیادہ تر انگریزوں کے ہاتھ میں ہے وہی یہاں سے دُوسرے ملکوں میں بھیجتے ہیں - چنانچہ ان ممالک میں نیل کی تجارت کرنے والے انگریزوں کا ایک بڑا گروہ بن گیا ہے - ہر قسم کی منشیات اور مفرحات - افیون سے لیکر آسام اور دنیا کی کافی چاء تک ان میں افیون بڑے نفع کی چیز ہے - کیونکہ چینی اس کے بہت شایق ہیں اور اس کے بدلے میں ہمیں چینی چاء دیتے ہیں جو بڑی اچھی اور مزے دار چاء ہوتی ہے - اس کے علاوہ ہر طرح کے مصالحے - خوشبویات - بخورات - ادویات - ہر قسم کے شہتیر اور کار آمد لکڑیاں ہمالیہ کی دیودار سے لیکر ساگون تک جو جہاز بنانے کے کام میں آتی ہیں - اور شیشم سال سے لیکر صندل تک - ہر قسم کے بانس جو طرح طرح کے کام میں آتے ہیں - ہر قسم کی دھاتیں سونے سے لیکر اچھے سے اچھے لوہے تک - ہر طرح کے پتھر - سنگ خارہ - سنگ ابرک - سنگ مرمر - اور اور قیمتی پتھروں سے لیکر لعل و یاقوت - رمان - ہیرا - زمرد - پکھراج - نیلم اور یشب تک - اس کے علاوہ اور صد ہا طرح کے نگ جن کے رنگ کو کسی چیز سے تشبیہ دیکر وہی نام اُن کے رکھدئے ہیں - مثلاً گربہ چشم کیونکہ اس نگ کا رنگ کچھ کچھ بلی کی آنکھ سے مشابہ ہوتا ہے اور جب انگوٹھی میں جڑا جاتا ہے تو ہو بہو بلی کی آنکھ معلوم ہوتا ہے - آبادی کے لحاظ سے ہندوستان بڑا غدار ملک ہے قریباً ۲۸ کروڑ باشندے ہیں گویا انگلستان خاص اور صوبہ ویلز کی معمولی آبادی سے دس گنا زیادہ آباد ہے - اگر اس کی آبادی کے پانچ حصے

برابر کئے جائیں تو اُن میں سے صرف ایک حصہ آبادی کا ایسا ہے جو حضور ملک معظم ایڈورڈ ہفتم کی رعیت نہیں۔ باقی چار حصے زمین کے رعیت ہیں۔ ملک معظم کی حکومت میں اس قدر ملک ہیں کہ دُنیا میں جدھر سُورج گھومتا ہوا جاتا ہو اُدھر کچھ نہ کچھ حصہ زمین کا تاج برطانیہ کے ماتحت ضرور ہوتا ہے۔ ان میں اگر کوئی مُلک ایسا ہو جس پر دولت برطانیہ کو بڑا ناز ہے تو وُہ صرف ہمارا ہندوستان ہی ہو۔ اور مقامات ایسے ہیں کہ برطانیہ کے تاج میں گوہر ہیں اور ہندوستان ایسا ہے کہ گویا ان سب میں گوہرِ شب چراغ ہے۔ یورپ کے تمام بادشاہوں کو ہمیشہ سے یہ آرزو رہی کہ وُہ ہندوستان کو اپنا بنالیں۔ پندرھویں صدی کے اخیر میں شاہ ھسپانیہ کی طرف سے کلمبس نے ہندوستان کی تلاش میں بحرِ ظلمات کنگھالا۔ لیکن پتہ نہ ملا۔ پھر اور من چلے فرنگیوں نے سمندروں میں جہازرانی کی۔ کسی نے کہا ہم اتر پورب کے کھونٹ سے ہندوستان کا راستہ نکالینگے۔ کسی نے کہا ہم اُتر پچھم کی راہ نکالینگے۔ واسکوڈی گاما نے برّاعظم افریقہ سے گھوم کر پہلا راستہ پیدا کیا۔ ولندیزوں نے بھی قدم جمانے کے لئے اپنے سے بہت کی۔ فرانسیسیوں نے تو جنوبی ہندوستان کے بعض حصوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ لیکن اخیر کو پالا انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اور ہندوستان دولت برطانیہ کی مضافات میں داخل ہو گیا۔ ہم نے اب تک ہندوستان کی موٹی موٹی باتیں بتلائی ہیں اور باہر سے جو چیزیں معلوم ہو سکتی ہیں صرف وہی دکھلائی ہیں۔ آؤ اب ہندوستان کی اندر سے سیر کریں۔ اُسکے خوشنما شہروں اور اسکی مشہور عمارات کو دیکھیں۔ ریلیں اس ملک کی شاہراہیں ہیں اور وہ بڑے بڑے قصبوں، شہروں سے گذرتی ہیں۔ آؤ ان میں سے کسی بڑی ریل میں سوار ہو کر ہندوستان کا سفر کریں۔ کلکتہ اور بمبئی دو بڑے بڑے شہر ہیں۔ یہاں بندرگاہیں بھی ہیں اور یہاں سے تمام اطراف میں ریلیں جاتی ہیں۔ بہتر ہو کہ ہم اپنی سیاحت بمبئی سے شروع کریں۔ لیکن خشکی کی راہ سفر کرکے کنارے کے حالات معلوم نہیں ہو سکتے۔ کنارے یا ساحل یا گھاٹ پر مشہور آبنائے ہوتی ہیں۔ خلیجیں۔ کھاڑیاں۔ راسیں۔ جزیرے۔ بندرگاہیں ہوتے ہیں اور یہ بھی ملک کے جغرافیہ کے اُبھرے ہوئے خط و خال ہیں۔ انکا معلوم ہونا ضروری ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ اوّل ایک تری کا سفر بمبئی سے کلکتہ کو کریں اور کارومنڈل گھاٹ کے پاس پاس ہو کر چلیں کیونکہ بمبئی سے آگے مالابار گھاٹ اتنا آباد نہیں ہے اور نہ کراچی کے سوا اُس پر اور کوئی شہر قابلِ ذکر واقع ہے +

انسانی افعالِ اطاعت

یعنی

ڈالی - سلام - خوشامد پر ایک نظر اصول ارتقاء کے لحاظ سے

جس خوش اسلوبی سے حکیم ہربرٹ سپنسر نے قانون ارتقاء کے عمل کو مذہبی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دکھایا ہے ناظرین کو اسکا اندازہ اس دلچسپ مضمون کے پڑھنے سے ہو جائیگا جو ہمارے مکرم دوست لالہ دیوان چند بی-اے پلیڈر نے ہمیں عطا فرمایا ہے

اِنسان کے جملہ افعال دو قسم کے ہوتے ہیں - اوّل وُہ جنکا مقصود اسکی اپنی ذات ہے - دوم وُہ جنکا تعلق دیگر افراد سے ہے -

مؤخر الذکر کی دو اقسام ہیں - افعالِ محبّت و افعالِ اطاعت -

جو افعال بوجہ اُلفت - شفقت - عنایت یا رحم وغیرہ کئے جاتے ہیں (اور وُہ بے شمار ہیں مثلاً محبت - پیار - بوس و کنار - مصافحہ کرنا - بغلگیر ہونا - گلے لگانا - دُوسرے کو دیکھ کر خوشی میں اُچھلنا کودنا - نعرے مارنا - تالیاں بجانا - ہبہ - بخشش - تحفہ وغیرہ وغیرہ) یہ سب افعالِ محبت کی قسم میں داخل ہیں - ان سب افعال کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ فریقِ ثانی کی پسندیدگی کا اظہار ہو -

ان کو چھوڑ کر باقی تمام افعال افعالِ اطاعت میں داخل ہیں - اگر لفظ اطاعت کو وسیع معنوں میں لیا جاوے - ان افعال کا مدعا اظہار پسندیدگی کے بجائے حصولِ خوشنودی یا رضامندی ہے -

حیوانات میں بھی افعالِ اطاعت دیکھے جاتے ہیں - مثلاً ایک کُتّا مالک کو خفا دیکھ کر دُم کو دباتا - دبک کر - سہم کر - آہستہ آہستہ لیٹتا لیٹتا اور اطاعت کی دیگر علامات دکھلاتا ہُوا - مالک کے پاؤں میں آجاتا ہے - اور اپنے آپ کو اس کے رحم پر چھوڑ دیتا ہے - علیٰ ہذا القیاس جب وُہ ایک مضبوط و زبردست کُتّے کو حملہ آور دیکھتا ہے - اور تابِ مقابلہ نہیں رکھتا اور یہ معلوم کرتا ہے کہ دانت نکال کر بچاؤ پر کھڑا رہنا بھی لاحاصل اور خلافِ مصلحت ہے - تو پیٹھ کے

بل گر کے ۔ ٹانگیں اوپر کر کے ۔ مسکین شکل بنا کر آگے لیٹ جاتا ہے ۔ اور قدرے دردانگیز طور پر غرّانا شروع کرتا ہے ۔ گویا تمام ہتھیار وغیرہ ترک کر کے پورے طور پر اطاعت قبول کرتا ہے تاکہ جاں بخشی ہو اور حملہ کے نقصان سے بچے ۔ اِسی قسم کے دیگر افعالِ اطاعت گُتّا اور نیز دیگر حیوانات میں بھی پائے جاتے ہیں ۔ جن کا ذکر اگرچہ خالی از لُطف نہیں ۔ مگر انسانی افعالِ اطاعت کے مضمون سے باہر ہیں۔

اِنسانی افعالِ اطاعت کی تین موٹی اقسام ہیں :۔ ڈالی ۔ سلام ۔ خوشامد ۔

ڈالی یعنی قسم اوّل میں وُہ افعال داخل ہیں جن کے ذریعے سے کوئی چیز اپنی ذات سے علیحدہ کیجاوے اور دُوسرے کو دیجاوے تاکہ لینے والا خوش ہو ۔

افعال قسم دوم میں بھی اگرچہ اندرونی خیالِ اطاعت کا اظہار مقصود ہوتا ہے ۔ لیکن اپنے سے کوئی چیز علیحدہ نہیں کی جاتی ۔ صرف اعضاء بدنی کی حرکات پر اکتفا کیا جاتا ہے ۔ یہ سلام ہو ۔

قسم سوم خوشامد ہے ۔ یہ صرف لفظی جمع خرچ ہے ۔ نہ اپنے سے کوئی چیز علیحدہ کی جاتی ہے ۔ نہ بطور بیرونی علامت کے بدن یا بدن کے کسی حصّے کو جُنبش یا حرکت دیجاتی ہے ۔ صرف "زبان ہزار نعمت ہے" کے مسئلے پر عمل کر کے دُوسرے کی تعریف ۔ بڑائی ۔ صفت وثنا کر کے اسکو خوش کیا جاتا ہے ۔ یا دُوسرے کے مقابلے میں اپنا عجز ظاہر کر کے ٹیڑھے طریقے سے اس کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے ۔

ترقی تمدن کے مختلف مراحل میں یہ تین اف ... مول ۔ اور مختلف لباسوں میں نظر آتے ہیں ۔ اور جو تبدیلیاں ان ابتدائی افعال کے نام یا صُورت میں ہوئیں وُہ ضرورتِ تمدنی کی وجہ سے یکے بعد دیگرے ایک قابلِ فہم قدرتی سلسلے میں واقع ہوئیں ۔ اور اگر غور سے دیکھا جاوے تو مذہب میں بھی ڈالی سلام خوشامد کی رسم پائی جاتی ہے ۔ اور بعض موجُودہ رسُوم وعقائد کی بُنیاد میں یہ تین ابتدائی خیال ایک قدرتی سلسلے میں دیکھے جاتے ہیں ۔ سوسائٹی کے متعلق اِن تمام متفرق ۔ کثیر التعداد اور ہم شکل مگر بظاہر مختلف افعال کا سلسلہ وار ذکر کرنا ۔ اور یہ جتلانا کہ بعض رسومات یا عقایدِ مذہبی ان تین ابتدائی افعال سے کس طرح پیدا ہُوئے ۔ مضمون ہذا کا مدعا ہے :۔

ڈالی

آجکل اگرچہ مساوی حیثیت کے اشخاص میں ڈالی[1] کا رواج پایا جاتا ہے۔ لیکن یہ حالت شروع کی نہیں۔ آخری حالت ہے۔ آغاز اِس کا اس طریق سے ہوتا ہے کہ محکوم۔ حاکم کو۔ یا مغلوب۔ غالب کو۔ یا ادنیٰ۔ اعلیٰ کو کوئی تحفہ بطور رضاجوئی کے دیتا ہے۔ بعد میں دُوسری حالت یہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ۔ ادنیٰ کو یا حاکم۔ محکوم کو تحفہ یا ڈالی کے مقابلے میں بطورِ نشانِ خوشنودی کچھ چیز واپس کرتا ہے۔ جب ڈالی اور عطیئے کی رسم مستحکم ہو جاتی ہے۔ اور اپنے سے کچھ چیز علیحدہ کرکے دُوسرے کو دینے میں حصُولِ خوشنودی یا رضاجوئی مفہوم ہونے لگتا ہے۔ تو مساوی حیثیت اشخاص میں ڈالی کا رواج موجود ہو جاتا ہے۔ یہ صریحاً درست ہے کہ سوسائٹی کے آغاز میں جب کہ کل اشخاص مساوی حیثیت کے تھے۔ اور کسی ایک شخص کی حکومت دُوسروں پر نہ تھی۔ سلام۔ خوشامد کی طرح۔ ڈالی کا رواج بھی معدُوم تھا۔

اِس فعل کا آغاز بطورِ فعلِ اطاعت کے ہُوا۔ اور اس کا بیج اسوقت بویا گیا جب ایک شخص نے چند دیگر اشخاص کو بوجہ طاقتِ بدنی۔ یا طاقتِ دماغ و فکر قابو میں لاکر ان کو اپنے ماتحت کیا۔ اور مفتوح کی جان۔ اسکا مال۔ اس کی اولاد۔ غرض ہر ایک چیز فاتح کی ملکیت سمجھی جانے لگی۔

غالب کا مغلوب سے خارجی علامت اطاعت کا طلب کرنا۔ سب سے مقدم خیال ہوتا ہے۔ جو شخص مقابلہ چھوڑ کر اطاعت قبول نہ کرے۔ وُہ دُشمن ہوتا ہے جس کے زیر کرنے بلکہ بعض اوقات نیست و نابُود کرنے سے ہی شخص غالب کی طاقت باقی مغلوبین پر قائم رہ سکتی ہے۔ یہ ضروری ہوتا ہے کہ جو شخص مقابلہ کرے یا تو اس کی طاقت کو توڑ کر اس کو مطیع بنا لیا جاوے۔ یا اگر اس کی طاقت زیادہ ہو۔ تو مفتوُح ہونے پر وُہ تمام افراد جو شخص مغلوب کے مطیع ہوں۔ شخص غالب کے دائرہ اطاعت میں لائے جاویں۔ اِسی طرح لڑائی۔ جھگڑے۔ کُشت و خون کے بعد جب ایک شخص اپنی طاقت بمقابلہ دوسروں کے فائق ظاہر کرتا ہے۔ تو کمزوروں کے لئے مقابلہ و مخالفت کا ترک کرنا مصلحت

ہوتا ہے۔ اور فاتح۔ مفتوح سے علامتِ اطاعت طلب کرتا ہے۔ سب سے اوّل فعل اطاعت ہتھیار رکھ دینا ہوتا ہے۔ یعنی بیرونی علامتِ مخالفت و مقابلہ ترک کرکے اور مطابعت قبول کرکے مفتوح کے رحم پر یا اُس کے قابو میں اپنے آپ کو ڈال دینا۔ اِس کے بعد جب مسلسل تابعداری مغلوب ہوتی ہے۔ تو غالب مغلوب سے قدرتاً یہ طلب کرتا ہے کہ آیندہ کے لئے بھی فرمانبرداری و وفاداری کی حلف اُٹھالی جاوے۔ یعنی اطاعت غیر مشروط کے بعد قسمِ رفاقت لی جاتی ہے۔ لیکن اس کے سوا غالب مغلوب سے کچھ طلب نہیں کرتا۔ البتہ چونکہ آغاز تمدّن میں مفتوح کی جان و مال فاتح کے کلّی اختیار میں ہوتی تھی۔ اور کوئی شخص کسی چیز کو شخص غالب کی صریح یا معنوی اجازت کے بغیر استعمال نہ کرسکتا تھا۔ اور نیز چونکہ حاکم کی ناراضگی پر کل جائداد چھین لی جاسکتی تھی۔ اور ہر طرح کا نقصان پہنچنے کا احتمال ہوسکتا تھا۔ اِس لئے مصلحت زمانہ کے مطابق محکوم کی جانب سے حاکم کو خوش رکھنے کی پہلی ترکیب۔ اپنی مقبوضہ اشیاء میں سے بعض اشیاء کا خود بخود دیدینا شروع ہوا۔ تحفہ تحائف کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور ڈالی کا بیج ڈالا گیا۔ ہر ایک شخص اپنی ذاتی منفعت کو مدنظر رکھ کر۔ اس خیال سے کہ اگر شخص غالب دندانِ طمع دراز کرے۔ یا خوش نہ رہے۔ تو کُل اشیا مقبوضہ ضبط کرلیگا۔ خود بخود اپنی ملکیت میں سے کچھ حصّہ بطور تحفہ دینے لگ گیا۔ تحفہ تحائف کا دینا شروع میں فرض نہ تھا۔ بلکہ ایک مصلحت تھی۔ جس کا اصول یہ تھا کہ ملکی حاکم کو جس کے اختیار میں کُل کا چھین لینا ہے۔ اِس کو پیشتر ہی سے جزوِ جائداد دیکر اس اظہارِ اطاعت سے خوش کیا جاوے اور دوم اس کے ذاتی لالچ کو خود بخود پورا کرکے آیندہ کے زیادہ نقصان سے محفوظ ہوجاویں۔ اگرچہ شروع میں یہ رسم غیر لازمی تھی لیکن تمدّن کے ترقی کرنے پر اس کی شکل و ماہیّت میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایک پہلو سے تو یہ دیکھا گیا کہ ملکی حاکم کا اختیار غیر محدود سے محدود ہوگیا۔ اور کُل جائداد کے خواہ مخواہ چھین لینے کا اختیار جاتا رہا۔ جو مال و متاع کہ مغلوبین کے پاس صرف اُنکا مقبوضہ ہوتا۔ وُہ اب اُنکا مملوکہ خیال کیا گیا۔ ان کی ذات و جائداد محفوظ قرار دی گئی۔ تاوقتیکہ قانون کی خلاف ورزی پر بطورِ سزا۔ یا پاداشِ جرم قید۔ جُرمانہ۔ یا ضبطی جائداد کا حکم صادر نہ ہو۔ لیکن دوسرے

پہلو سے بادشاہ یا ملکی حاکم کو جو تحفہ تحائف غیر لازمی طور پر دیئے جانے شروع ہوئے تھے۔ وُہ لازمی ہوکر بادشاہ کا حق قرار دئیے گئے۔ بجائے گاہ بیگاہ دیئے جانے کے معین اوقات میں لئے جانے شروع ہوئے۔ اور بجائے کُل جائداد کے صرف جُزو جائداد پر حقِ شاہی قائم ہوا۔ یعنی آغاز تمدن میں جس وقت بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا۔ اور قانون اس کی زبان ہوتی تھی۔ کل جائداد کے آئندہ ضبط ہوسکنے کے احتمال سے مصلحتاً پیشتر سے ہی گاہ بیگاہ خود بخود ملکیت کو کچھ حصّہ بطور تحفہ و اظہارِ اطاعت پیش کیا جانا شروع ہوا۔ لیکن تمدن کے ترقی کرنے پر جب ذات و جائداد محفوظ ہوگئی (علاوہ اس کے کہ جُرم خلافِ قانون مقررہ سرزد ہو) اس کے ساتھ ہی جُزو جائداد کا بادشاہِ وقت کی خدمت میں بطور نذرانے کے اوقات معین پر پیش کرنا لازمی ہوگیا۔ گویا ڈالی ٹکس اور مالگذاری کی شکل میں نظر آنے لگی۔ شروع میں جب نقدی کا رواج نہ تھا۔ تو ہر ایک چیز کا حصّہ جنسی لیا جانا جاری تھا۔ بعد میں ٹکس نقدی کی صُورت میں منتقل ہوگیا۔ جب بجائے سابقہ غیر معین اشخاص سے غیر معین اوقات پر تحفہ تحائف لینے کے معین طریق پر مستقل آمدنی شاہی قائم ہوگئی تو ڈالی کی شکل میں ایک اور تبدیلی واقع ہونے کی صحیح وجہ موجود ہوگئی۔ ایک طرف سے تو علاوہ مقررّہ ٹکس کے کوئی فرض نہ تھا کہ شخص مطیع کوئی نذر نذرانہ خود بخود دیوے۔ لیکن دوسری طرف سے اس فعل کا وُہ اثر کہ جس کے باعث یہ رسم شروع ہوئی جاتا رہا۔ جب قانون ہوگیا کہ ہر شخص جو پانچسو سے زیادہ آمدنی رکھتا ہے اپنی آمدنی میں سے فی روپیہ ۵ پائی داخل خزانہ سرکار کرے۔ یا جب یہ بات فیصلہ پاگئی کہ پیداوار اراضی اٹھانے کے بعد سرکار کو فی کنال ۸ معاملہ ادا کیا جاوے تو انکم ٹکس یا مالگذاری یا یُوں کہو کہ فرائضِ قانونی ادا کرنے سے خاص طور پر بادشاہ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کا موقع جاتا رہا۔ یعنی وُہ اثر اور وُہ مطلب جو شروع میں رسم تحفہ کا محرّک تھا موجودہ صُورت میں حصُولِ خوشنودی کا محرک نہ رہا۔

جب یہ حالت ہُوئی تو جن اشخاص کو خاص ذاتی اغراض کی وجہ سے خصُوصیت سے اظہارِ اطاعت اور حصُولِ خوشنودیِ مزاج حاکمِ مُلکی مطلوُب تھا وُہ اس پر اکتفا نہ کرسکتے تھے کہ معمُولی

طریق پر مثل دیگر اشخاص صرف ٹکس۔ یا مالگذاری ہی دیدیں۔ اُنہوں نے خصوصیت ظاہر کرنے کی وجہ سے اور انسانی طبیعت سے فائدہ اُٹھانے کی نیت سے بروقتِ مُلاقات۔ حاکم ملکی کے پاس کوئی خاص تحفہ علاوہ معمولی ٹکس یا مالگذاری کے خود بخود لیجانا شروع کیا۔ اسی طرح سے ہر ایک شخص نے جس کو غرض حصُولِ خوشنودی بادشاہ تھی۔ تحفہ تحائف بروقتِ مُلاقات لیجا کر رواج نذر نذرانہ کی بُنیاد قائم کر دی۔ یہ رسم بھی اگرچہ قانونی فرض نہ بنی بوجہ اس کے کہ قانونی حق بادشاہ کا پہلے قائم ہو چکا تھا۔ لیکن مستحکم ہو کر مستقل رواج کے پائے تک پہنچ گئی۔ اور یہ رواجاً لازمی ہو گیا کہ ہر ایک شخص خواہ امیر ہو خواہ غریب۔ خواہ غرض رکھتا ہو خواہ محض مُلاقات کے لئے جاوے۔ جب حاکمِ وقت کی خدمت میں حاضر ہو تو بروقتِ حصُول نیاز کچھ نہ کچھ نذر نذرانہ ضرور پیش کرے۔

اِس درجے پر پہنچ کر۔ رواج واپسی نذرانہ کا قائم ہو جاتا ہے۔ شروع میں نذرانہ صرف اُن اشخاص کا واپس کیا جاتا تھا جو غریب ہوتے تھے۔ یا جن کو کوئی ذاتی منفعت مطلوب نہ ہوتی تھی۔ یا جن اشخاص میں یہ توقع پیدا کرنی مناسب نہ ہوتی تھی کہ اسکا معاوضہ بادشاہ کی طرف سے اُن کو کسی آئندہ وقت میں ملیگا بعد ازاں بلا تمیز ہر ایک حالت میں نذرانہ واپس ہونا شروع ہوتا ہے۔ لیکن نذرانے کے پیش کرنے کی رسم۔ بطور بیرونی علامت مطابعت و وفاداری کے قائم رہتی ہے۔ نذر نذرانہ پیش کرنا رواجی فرض ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ساتھ ہی جیسا کہ ٹکس اور مالگذاری کے بارے میں ذکر کیا گیا۔ پھر اصل مطلب و منشاء جس کی وجہ سے آغاز اس رسم کا ہوا وُہ معدوم ہو جاتا ہے۔ دیسی ریاستوں میں مثلاً مہاراجہ صاحب جموں و کشمیر کے دربار میں روپے نذر کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔ مہاراجہ صاحب چھُو کر واپس کر دیتے ہیں۔ اور اگرچہ روپے دکھلانے یا پیش کرنے میں کوئی خاص حصُولِ خوشنودی مزاج نہیں ہوتا کیونکہ ہر ایک شخص کے واسطے یہ ایک معمولی رسم ہے۔ لیکن اس رسم کا ادا نہ کرنا۔ باعث رنجیدگی خاطر ضرور ہوتا ہے۔

انگریزی حکام اعلیٰ مثلاً چیف کمشنر - لفٹنٹ گورنر - اور وایسرائے کو بھی خاص دربار کے موقعوں پر سفید ریشمی رومالوں پر اشرفی وغیرہ رکھکر پیش کرنے کا رواج اب تک موجود ہے - گو یہ اب محض ایک اظہارِ اطاعت ہے - اور اس کا اصلی مطلب یعنی خاص طور پر ذاتی منفعت کی غرض سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل کرنا اب معدوم ہوگیا ہے -

جب ایک رسم محض اسی غرض سے قائم ہوئی کہ غیر معمولی طریق پر بوقتِ ملاقات تحفہ پیش کرکے خاص طور پر حاکم ملکی کی رضاجوئی کرکے مطلب براری ہوسکے - اور جب یہ رسم عام ہوجانے کی وجہ سے رواجی فرض میں تبدیل ہوگئی - بلکہ رواج واپسی نذرانہ بھی قائم ہوگیا - تو ایک اور ترکیب اسی سلسلے میں دیکھی جاتی ہے - خاص عنایاتِ شاہی کے جو مطلوب ہوں - اُن کا خاص طور پر معاوضہ علاوہ معمولی ٹکس - اور علاوہ رواجی نذر کے جاری ہوجاتا ہے - یعنی خاص ضرورت اور غیر معمولی ضرورت امداد شاہی کے وقت خاص میں سے کام چلایا جاتا ہے - مہاراجہ صاحب گلاب سنگھ سابق والی جموں و کشمیر کا قاعدہ تھا کہ ایک روپیہ خاص طور پر دیئے جانے پر رعایا کے عرائض سُنا کرتے تھے -

انگلستان میں بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا - امداد شاہی خاص نذرانہ سے حاصل ہوسکتی تھی - بعد میں یہ استحقاق رعایا کا قائم کیا گیا کہ رسُوم مقررہ کے ادا کرنے پر امداد شاہی حاصل کرسکیں -

جس طرح سے تحفہ تحائف غیر لازمی سے لازمی ہوجانے پر ٹکس کی شکل میں تبدیل ہوگئے اور بعد ازاں ضرورت نے نئی رسم نذرانہ پیدا کی اور جس طرح کہ بعد میں یہ رسم بھی پایۂ مستقل رواج کے پائے پر پہنچکر - دوبارہ ضرورت خاص فیس کی ہوئی - اسی طرح سے خاص فیس کے دیئے جانے کی رسم مستحکم ہو کر لازمی بن گئی - اور قانون ہوگیا کہ سوائے رسُوم مقررہ کے کوئی امداد شاہی نہ دیجاویگی - اب اگر استغاثہ کرنا ہو تو کورٹ فیس - عرضی دائر کرنی ہو تو رسُومِ عدالت لازمی ہیں - سلسلۂ ارتقا میں ڈالی اسوقت کورٹ فیس کے لباس میں دیکھی جاتی ہے -

(باقی آئندہ)

قرۃ العین

ناظرین۔ آپ نے میرزا علی محمد باب کا نام اکثر سُنا ہوگا جس نے ایران میں پیغمبری کا دعویٰ کیا اور ۱۸۴۴ء میں بابی مذہب کی بُنیاد ڈالی۔ اِس شخص نے باب کا لقب اِس لئے اختیار کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو باب اللہ سمجھتا تھا۔ یعنی دروازہ جس سے آدمی خدا کے ایوانِ معرفت میں داخل ہو سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ اس مذہب کو ایسی ترقی ہوئی کہ ایک انبوہ کثیر میرزا محمد علی کا پیرو ہو گیا جس میں بڑے بڑے عالم اور ذی عزّت لوگ شامل تھے۔ ہر طرف اِس نئے فرقے کا ایک تہلکہ مچ گیا تھا یہاں تک کہ سلطنتِ ایران کو اس کے ساتھ مقابلہ و مجادلہ کرنا پڑا۔ اس مذہب کی بہت بڑی حامی ایک عورت قرۃ العین نامی گذری ہے جو بابیوں میں مثل خواتینِ اہل بیتِ رسالت بہت ہی احترام کے قابل مانی جاتی ہے۔ اور اُسی کے حالات اِس وقت لکھے جاتے ہیں جو دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔

قرۃ العین کا اصلی نام "زرین تاج" تھا جو اُس کے سر پر سُنہری بال ہونے کی وجہ سے رکھا گیا تھا۔ اور علمائے قزوین کے ایک مشہور خاندان سے تھی۔ چنانچہ اس کا باپ حاجی محمد صالح ایک مشہور فقیہہ تھا اور اس کا چچا ملا محمد تقی قزوین کا ایک معزز عالم تھا۔ علاوہ ان کے اس خاندان کے اور چند ممبر بھی اعلیٰ درجے کے عالم مانے جاتے تھے۔ بچپن سے اس لڑکی کو تحصیل علم کا بہت شوق تھا اور اسی وجہ سے اپنا گھر چھوڑ کر کربلا تک گئی اور وہاں کے مشہور فضلا سے تعلیم پائی۔ غرضکہ اپنی کوشش سے وہ علم و فضل کا مجسم نمونہ ہو گئی تھی۔ بارگاہ ایزدی سے اُسے حُسن بھی خوب عطا ہوا تھا اور ساتھ ہی نہایت باحیا اور باعصمت تھی۔ باب کا شہرہ سُن کر اوّل اوّل قرۃ العین نے اس سے خط کتابت شروع کی اور پھر ملاقات کے بعد اُس کی ایسی معتقد ہوئی کہ بابی مذہب کو سب سے اچھا اور سچا مذہب سمجھتی تھی۔ آخرش یہاں تک نوبت پہنچی کہ اُس نے علانیہ بابی مذہب کی ترقی و اشاعت میں کوشش شروع کر دی۔ جہاں وہ جاتی اور جس مجمع میں اس کا گذر ہوتا وہاں وہ نہایت

آزادی کے ساتھ باب کے فضائل بیان کرتی - بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلاتی اور اس کے لئے بڑے شد و مد کے ساتھ عقلی و نقلی دلائل پیش کرتی - اسی غرض کے لئے اُس نے کربلائے معلّے کا سفر اختیار کیا - یہاں کے اہل علم اُس کے عالمانہ اوصاف سے پہلے سے واقف تھے اور اب اسکا پُراثر وعظ سُننے کے لئے ہزاروں آدمیوں کا مجمع ہونے لگا - اور شہر کے بہت سے آدمی اسکی جادو بیانی کی بدولت بابی ہو گئے - جب یہ حالت ہوئی تو علماء کی شکائت پر گورنر نے اُس کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن اس کو پہلے خبر ہو گئی تھی اس لئے وُہ یہاں سے بغداد کو چلدی - بغداد میں بھی اُس نے وُہی طریقہ اختیار کیا اور گورنمنٹ عثمانیہ کے حکم کے موافق یہاں سے بھی نکلنے پر مجبور ہوئی - تاہم اس نے بغداد سے کرمان شاہ اور ہمدان تک پہنچتے پہنچتے چند مشہور علماء و عمائدِ دین کو بابی بنا لیا - ہمدان سے اپنے وطن قزوین میں آکر اس نے ایک ایسا قصد ظاہر کیا جس سے سُننے والوں کو اس کے جوش پر تعجب ہوتا تھا - وُہ یہ تھا کہ محمد شاہ بادشاہ ایران کو بابی بنایا جاوے - یہ ارادہ کر کے وُہ طہران کی طرف روانہ ہوئی مگر وقت پر اس کے باپ کو معلوم ہو گیا - چنانچہ اُس نے ڈر کے مارے چند سوار بھیجکر قرۃ العین کو واپس قزوین بُلا لیا -

قرۃ العین کی شادی اُس کے چچا کے بیٹے مُلا محمد سے ہوئی تھی جو بابی مذہب کا دشمن تھا - اس وجہ سے ہر وقت آپس میں ناراضمندی رہتی تھی - آخرش مُلا محمد نے قرۃ العین کو طلاق دینے کے سوائے کوئی چارہ نہیں دیکھا - اور اب قرۃ العین کو باب کی تائید کے لئے کامل آزادی مل گئی جس کی وُہ نہائت خواہشمند تھی - مگر قزوین میں اس کے مخالفوں کی تعداد بہت زیادہ ہو گئی تھی - جو ہر وقت اس کی جان کے درپے رہتے تھے - اس لئے وُہ قزوین سے نکل کر طہران اور طہران کے بعد خراسان گئی - خراسان سے رشت پہنچی جہاں بابیوں کی ایک جماعت موجود تھی - رشت سے وُہ اشاعتِ مذہب کے لئے مازندران گئی اور یہاں ایک بہت بڑی مجلس میں نہایت عمدہ تقریر کی - اثنائے تقریر میں اُس کا نقاب چہرے سے ہٹ گیا تو تمام حضار مجلس اُس کی نُورانی صُورت اور خداداد حُسن دیکھ کر حیرت زدہ ہو گئے - مگر یہاں بھی

وُہ چین سے ندرہ سکی اور بیچاری کو جنگل جنگل پھرنا پڑا۔ اس عرصے میں مانندراں کے بابیوں اور بادشاہی فوج سے تکرار ہو گئی اور ایک بڑا ہنگامہ برپا ہو گیا جس میں ایک ہزار بابی قتل کئے گئے۔ اب قرۃ العین قزوین پہنچی اور یہاں کے حاکم نے اسکو حراست میں طہران روانہ کیا۔ اب محمد شاہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا تھا اور شاہ ناصر الدین قاچار تخت پر تھے۔ جب ہز مجسٹی کے سامنے قرۃ العین پابزنجیر لائی گئی۔ تو شاہ کو اس کے حُسن و جادو بیانی اور علم و فضل کا بہت خیال ہُوا اور آپ نے حکم دیا کہ ایسی عورت کا مرنا بہت افسوسناک ہوگا۔ اِس لئے اُسکو چھوڑ دیا جائے۔ مگر وُہ کوتوالِ شہر کی نگرانی میں رہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ مگر وُہ یہاں بھی برابر اشاعتِ مذہب میں کوشش کرتی رہی۔ زنانہ مجلسوں میں جا کر تقریریں کیں اور طہران کے بعض معزز خاندانوں کو بابی بنا لیا۔

المختصر قرۃ العین اپنی ساری قوت اس مذہب کے پھیلانے میں صرف کرتی تھی اور اسکی اور خود مرزا علی محمد باب کی کوشش سے اس مذہب کے ماننے والے روز بروز بڑھتے جاتے تھے اور عجب نہیں کہ ایک روز تمام سلطنت کا مذہب بابی ہو جاتا مگر ایک ایسا واقعہ پیش آگیا جس نے بابیوں کی حالت کو بہت ہی خراب کر دیا۔ یعنی ۱۵۔ اگست سنہ ۱۸۵۲ء کو شاہ ناصر الدین کوہ البرز کے دامن میں گھوڑے پر ہوا خوری کو نکلے۔ ایک مقام پر تین شخص شاہ کے سامنے آئے جنکی نسبت اُنہوں نے خیال کیا کہ کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ جب وُہ پاس پہنچے تو ایک شخص نے پستول نکالکر بادشاہ کی طرف فائر کیا مگر نشانہ خطا ہُوا۔ پھر ایک دُوسرے شخص نے بادشاہ کو گھوڑے سے گھسیٹ کر زمین پر گرا دیا اور سر کاٹنا چاہتا ہی تھا کہ ایک شاہی فراش نے نہایت چُستی سے خود اُسی کا سر اُڑا دیا۔ یہ دیکھ کر اُس کے اور دو ساتھی فرار ہو گئے اور بادشاہ کی جان بچ گئی مگر اُس روز سے بابی سلطنت کے بدخواہ خیال کئے گئے اور بابی ہونا ایک سخت جُرم ہو گیا۔ تمام سلطنت میں تفتیش کی گئی اور ہزاروں بابی گرفتار ہوئے اور نہایت بیرحمی سے قتل کئے گئے۔ بہت سے آدمیوں نے ہر طرح کی تکلیف و اذیت اُٹھائی مگر بابی مذہب سے منحرف نہیں ہوئے اِس کے بعد بھی بارہا کثیر التعداد بابیوں کو قتل کیا گیا مگر یہ گروہ اب تک موجُود ہے۔

بعض صاحبوں کا خیال ہے کہ میرزا علی محمد اس واقعہ سے چند روز پہلے قتل کیا گیا تھا اور بعض کا خیال ہے کہ وُہ بھی ان لوگوں میں تھا جو اس حملے کے بعد گرفتار ہُوئے اور نہ صرف وُہ بلکہ قرۃ العین اور بہت سے نامور بابی لیڈر بھی۔ اور سب قیدی تو بہت سی تکلیفوں کے بعد قتل کر دئے گئے مگر قرۃ العین شاہ کے سامنے پیش کی گئی۔ اس موقعہ پر اکثر وزرا و افسرانِ فوج موجود تھے اور ہر ایک چاہتا تھا کہ کسی طرح اس عورت کی جان بچ جائے۔ اس لئے اُس سے ایسے سوال کئے گئے کہ وُہ باب کی تائید اور اس کے مذہب کی طرفداری سے انکار کرے اور یہ بھی کہدیا گیا کہ اگر انکار نہ ہوگا تو قتل لازمی ہے۔ مگر اُس نے باب ہی کا کلمہ پڑھا اور اُس کو پیغمبر یا امام برحق سمجھا بلکہ صاف یہ کہدیا کہ "میری موت تم کو میری صداقت کا یقین دلائیگی"۔ آخرش قتل کا حکم دیا گیا اور اسکو پھانسی دیکر نعش ایک اندھے کنوئیں میں ڈالدی۔ مگر بعض انگریز سیاحوں کا بیان ہے کہ وُہ جلائی گئی۔ اِس طرح اس علم و فضل کی تصویر کا خاتمہ ہُوا جس نے بڑے بڑے عُلما، و مجتہدین سے عرصے تک بحثیں کیں۔ اُن کے اعتراضات کے دنداں شکن جواب دیئے اور اپنے دعویٰ کو قرآن۔ حدیث اور مذہبی دلائل سے ثابت کیا۔ جس نے ہزاروں آدمیوں کے مجمعوں میں پُرزور تقریریں کیں اور ہزاروں کو اپنا گرویدہ بنالیا۔

قرۃ العین نے نظم و نثر دونوں میں بہت لکھا اور چند کتابیں بھی تصنیف کیں مگر یہ تمام سرمایہ تلف ہوگیا۔ وُہ طاہرہ تخلص کرتی تھی اور یہی وُہ لقب تھا جو باب نے عصمت و پاکدامنی کی وجہ سے اسکو عطا کیا تھا۔ اب اُس کی مفصلہ ذیل دو غزلیں مصنّفوں کو بہت تلاش سے دستیاب ہوئی ہیں۔

(۱)

جَذَباتُ شَوْقِکَ اَلْجَمَتْ بِسَلاسِلِ غم والبَلا — همه عاشقانِ شکسته دل که دهند جان بره بلا
اگر آں صنم ز سرِ ستم پئے کشتنِ منِ بے گنه — لَقَدِ اسْتَقامَ بِسَیْفِهٖ فَلَقَدْ رَضِیْتُ بِمَا رَضَا
سحر آں نگار ستمگرم قدمے نهاده به بسترم — وَاِذَا رَأَیْتُ جَمَالَهٗ طَلَعَ الصَّبَاحُ کَاَنَّمَا
نه چو زلف غالیه بارِ او نه چو چشم فتنه شعارِ او — شده نافهٔ بهمه ختن شده کافرے بهمه خطا

توکہ غافل از مے و شاہدی پئے مرد عابد زاہدی　　چہ کنم کہ کافر جاہدی ز خلوص نیت اصفیا
ہمہ او زلف معلقے پئے اسپ و زین مغرقے　　ہمہ عمر منکر مطلقے ز فقیر فارغ بے نوا
تو و ملک و جاہ سکندری من و رسم و راہ قلندری　　اگر آں خوش ست تو در خوری وگر ایں بدست مرا سزا
بگذر ز منزل ما و من بگزیں بملک فنا وطن　　فاذا فعلت بمثل ذا فلقد بلغت بما تشا

(۲)

لمعات وجہک اشرقت و شعاع طلعتک اعتلا　　ز چہ رو الست بربکم نہ زنی بزن کہ بلے بلے
بجواب طبل الست تو ز ولا چہ کوس بلے زدند　　ہمہ خیمہ زد بدر دلم سپہ غم و حشم بلا
من و عشق آں مہ خوبرو کہ چو زد صلائے بلا برو　　بنشاط و قہقہہ شود فرو کہ انا الشہید بکربلا
چو شنید نالۂ مرگ من پے ساز من شد و برگ من　　فمشیٰ الیّ مہرولا و بکیٰ علیّ مجلجلا
چہ شدہ کہ آتش حیرتے ز نسیم لعبتۂ طور دل　　فلکتہٗ و دککتہٗ متدککا متزلزلا
پئے خوان دعوت عشق او ہمہ شب ز خیل کروبیاں　　رسد ایں صفیر مہیمنے کہ گروہ غمزدہ الصلا
تو چہ فلس ماہیٔ حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم　　بنشیں چو طاہرہ دمبدم بشنو خروش نہنگ لا

اِس قدر حالات معلوم کرنے کے بعد ناظرین کو وہ اصول دریافت کرنے کا انتظار ہوگا جنپر بابی مذہب قائم ہوا اور خود باب اور قرۃ العین جنکی تعلیم دیتے تھے - لہٰذا وہ مختصر طور پر بیان کیے جاتے ہیں :-

(۱) مخلوق خالق کو نہیں پہچان سکتی اس لیے مشیتِ اولیٰ نے انسان کی صورت میں حلول کیا۔

(۲) خدا نے جن صورتوں میں حلول کیا انکو پیغمبر کہتے ہیں -

(۳) پیغمبر بے شمار ہو چکے ہیں اور آیندہ بھی اسی طرح ہوتے رہینگے -

(۴) مشیت اولیٰ اب باب کے ذریعے سے بولتی ہے -

(۵) اگر قرآن حضرت محمد صلعم کی رسالت کی دلیل ہے تو "بیان" باب کی صداقت کے لیے کافی ہے -

(۹) قرآن کے لفظوں میں لاثانی فصاحت و بلاغت نہیں ہے بلکہ جو اثر اُن میں پیدا کیا گیا وُہ لاثانی ہے -

(۱۰) حضرت باب اللہ ہی مہدی موعود ہیں -

یہ وُہ اصول ہیں جن کی تعلیم و تلقین میں قرۃ العین نے تمام عمر صرف کر دی اور جن کے پھیلانے میں وُہ خود اپنے آپ کو اور تمام دُنیا کو بھولی ہُوئی تھی - اُسکو کسی ذاتی یا دنیاوی معاملے سے کچھ سروکار نہ تھا اور صرف ایک مقصد تھا کہ لوگوں کو بابی مذہب کی سچائی کا یقین دلایا جاوے اور جنکو یقین ہو جاتا تھا وہ بابی ہو جاتے تھے - اس مقصد کے حاصل کرنے میں اُسکو کسی بات کا حتیٰ کہ اپنی جان تک کا بھی خوف نہ تھا - اور اگر ہوتا تو وُہ بابی مذہب سے انکار کر کے اپنی جان بچا سکتی تھی - مگر اُس کے دل نے کسی طرح گوارا نہیں کیا کہ وُہ مرنے کے خوف سے ایک سچی بات سے انکار کرے *

نیاز احمد (از میرٹھ)



اے مہِ عید بے حجاب ہے تو — حُسنِ خورشید کا جواب ہے تو
اے گریبانِ جامۂ شبِ عید — شاہدِ عیش کا شباب ہے تو
اے نشانِ رکوعِ سورۂ نور — نقشۂ کلکِ انتخاب ہے تو
اے جوابِ خطِ رکوعِ نیاز — طاعتِ صوم کا ثواب ہے تو
ہائے اے حلقۂ پرِ طاؤس — قابلِ ذٰلک الکتاب ہے تو
چشمِ طفلی نے جب تجھے دیکھا — کہہ دیا خواب کو کہ خواب ہے تو
طوقِ منزلگہِ زمیں کے لئے — ہمہ تن پائے در رکاب ہے تو
یوں ابھرتے ہی آنکھ سے چھپنا — روشنی کا مگر حباب ہے تو

تو کمندِ غزالِ شادی ہے
لذت افزائے شوقِ طفلی ہے

(سید نذیر حسین بی اے و اقبال)

کرشن جی

وُہ سبزہ زار جو دریائے جمنا کے کنارے پر واقع ہیں۔ باوجود سبز قدم فتحمندوں کے پیروں کے نیچے پے درپے روندے جانے کے بھی۔ اب تک اپنی رعنائی اور دلفریبی سے ہر ایک سیاح کے دل کو مسخر کر لیتے ہیں۔ کوسوں تک زمین نے سبز لباس پہن لیا ہے۔ اور مولسری اور تمال کے خوشنما درخت عجب آن بان سے قطار در قطار کھڑے ہیں۔ اور اُن کے سائے نے اس سرزمین پر سحر کا سا اثر ڈال رکھا ہے۔ پانی کی بھی یہاں کمی نہیں۔ جگہ جگہ صاف شفاف پانی کے نیلگوں چشمے ہیں جنکے گرد ہر وقت چرند و پرند کا رمنا رہتا ہے۔ علاوہ قدرت کی گوناگون خوبصورتی کے اس منظر کی دلچسپی کو ایک اور خیال نے بھی بڑھا رکھا ہے۔ یہی مقام ہے جسے ہند و مذہب کا گہوارہ کہنا چاہئیے۔ اور یہیں سے علم و فضل کی وُہ ندی بھی نکلی جس سے اہلِ یونان اور دیگر اقوامِ قدیمہ سیراب ہوئیں۔ اسی جگہ وُہ شہر (متھرا) واقع ہے۔ جو لاکھوں بندگانِ خدا کے لئے مؤدبانہ توجہ کا مرکز اور مقدس خیالات کا مرجع ہے۔

یہیں وُہ شخص پیدا ہُوا جس نے انہیں نیکی اور محبت کے راستے پر چلنے کی تلقین کی اور یہی زمین تھی جس نے اس کے ان قدموں کو چھُوا جنکی برکت سے وُہ نجات اور مغفرت کی اُمید رکھتے ہیں۔

تاریخ سے ثابت ہے کہ متھرا کسی زمانے میں ایک نہایت عظیم الشان شہر تھا۔ یہاں کی عمارات مندر وغیرہ ہندوستان میں آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اور کیوں نہ ہوتا ایک دولتمند اور صاحب جاہ راجے کا پایہ تخت تھا۔ مگر اب اس کی وُہ اگلی سی خوبصورتی زمانے کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہی۔ مگر اب بھی ہندو مذہب کا جس قدر چرچا یہاں ہے وُہ شاید ہی کسی اور جگہ ہو۔ ہر روز صبح کو بے شمار مندروں میں ناقوس اور گھنٹوں کی آواز سُنائی دیتی ہے۔ اور سینکڑوں زن و مرد جمنا میں اشنان

کر کے پُوجا پاٹ کے لئے جاتے ہیں۔ اِن سب مندروں میں زیادہ مشہور کیشب دیو کا مندر ہے جسے تعمیر ہوئے غالباً کچھ بہت عرصہ نہیں گذرا۔ اس مندر کے قریب ایک کوٹھری ہے۔ جو اس مقام کا پتہ دیتی ہے۔ جہاں آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے دو حرمان نصیب میاں بی بی۔ جادون خاندان کے ایک ظالم راجے اور بے مہر رشتے دار کے حکم سے مقید تھے۔ نازو نعمت میں پلے ہوئے شاہی خاندان کے نونہالوں کے لئے قید خانہ جہنّم سے بدتر تھا۔ اور زندگی بالکل تلخ ہوگئی تھی۔ جینے کا کچھ مزا نہ رہا تھا۔ بلکہ زیست موت سے بدتر تھی۔ طرح طرح کے ظلم و تعدی اور خصوصاً اولاد کی موت کے داغ سہتے سہتے کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا۔ مگر ایک پیشین گوئی کے پورا ہونے کی اُمید انہیں کچھ سہارا دیئے ہوئے تھی۔ اور انکی زندگی کے گراں بوجھ کو ایک کمزور دھاگے سے لٹکائے ہوئے تھی۔ انکو ایک موہوم سا خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی ہمارے بھی بُرے دن پھرینگے اور کوئی نہ کوئی بے رحم راجہ کنس سے ہمارا بھی بدلہ لینے والا پیدا ہوگا۔

قریب ہے یار روزِ محشر چھپے گا کُشتوں کا خُون کیونکر
جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہُو پکاریگا آستیں کا

یہ دل خوش کن خیال اس تنگ و تاریک محبس کے اندھیرے میں اور اس سے بڑھ کر انکی اپنی سیاہ بختی کی اندرونی ظلمت میں ایک روشنی کی شعاع ڈالدیتا تھا۔ اور اپنے انعکاس سے انکی زندگی کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کی لو کو بھی اکسا دیتا تھا۔

بی بی کو جسکا نام دیو کی تھا صبح و شام بچہ پیدا ہونے کی اُمید تھی۔ مگر یہ خیال بجائے انکو خوش کرنے کے اور بھی افسردہ خاطر بنائے دیتا تھا۔ پہلے سات بچے اُن کے ہاں پیدا ہوچکے تھے۔ مگر انہیں کسی کو بھی آغوش میں لینا نہ نصیب ہوا تھا۔ ساتوں کے ساتوں راجہ کنس کے حکم سے پیدا ہوتے ہی مروا دیئے گئے۔ اور ان کے پاس سوائے حسرت و ارمان کے۔ اور کچھ باقی نہ رہا۔ آٹھویں بچے کی پیدائش کا انہیں خصوصاً فکر تھا۔ کیونکہ یہی بچہ تھا جسکی نسبت نجومیوں نے راجہ کنس کو خبر دی تھی کہ تیرے تخت و تاج کو تاراج کریگا۔ اور جس کا وبال پہلے ساتوں

کی بھی معصوم جان پر پڑا تھا۔ گو دیوکی کے شوہر واسدیو نے اسے خفیہ طور پر قید خانے سے غائب کر دینے کا انتظام کر لیا تھا۔ مگر پھر بھی دل میں طرح طرح کے خدشات اور وسواس پیدا ہوتے تھے۔ اور ایک عجیب امید و بیم کی کیفیت تھی۔

بھادوں کی آٹھویں تاریخ تھی۔ شب نے اپنی زلف کو پریشان کر رکھا تھا۔ اور سیاہ سیاہ بادلوں نے اُس کی ظلمت کو اور بھی زیادہ تاریک کر دیا تھا۔ آسمان کی ڈراؤنی صورت کسی اہم واقعہ کے وقوع پذیر ہونے کا پتہ دے رہی تھی۔ مینہہ موسلا دھار برس رہا تھا۔ گویا دیوکی اور واسدیو کی خستہ حالت پر زار و قطار آنسو بہا رہا تھا۔ اور چڑھے ہُوئے دریا کی موجیں مُنہہ کھول کھول کر تمام شہر کو نگل لینے کی دھمکی دے رہی تھیں۔ شاید وُہ اپنی موج خیز طغیانی سے ان انقلابات کی اطلاع دیتی تھیں جو سرزمین ہند میں طوفان بپا کرنے والے تھے۔ بجلی قرطاسِ فلک پر آتشیں حرفوں کی تحریر میں ایک روشن بخت کی آمد سے لوگوں کو خبردار کر رہی تھی۔ اور آسمان کا خوفناک اَرگن رعد اپنی اُونچی سروں میں ایک عظیم الشان شخص کی خوش آمدید کا دِل ہلا دینے والا راگ سُنا رہا تھا۔ پرندے گھونسلوں میں بیٹھے کانپ رہے تھے۔ اور آسمان کی یہ کیفیت دیکھ کر گردن بھی نہ اُٹھا سکتے تھے۔ تمام عناصر میں ایک ہل چل مچی ہُوئی تھی۔ اور آسمان و زمین دونوں میں ایک عجیب شورش مچ رہی تھی۔ واسدیو اور دیوکی کے دلوں کی گھبراہٹ موسم کی اس تیزی سے اور بھی دوبالا ہوگئی تھی اور اُنکی اندرونی دُنیا کی شورش۔ اس بیرونی دُنیا کی شورش سے کسی طرح کم وحشت خیز نہ تھی۔ مینہہ اور تاریکی کا یہی عالم تھا کہ یکایک مشرق میں زور سے بجلی کوندی جس سے ایک لحظہ کے لئے تمام منظر منوّر ہوگیا۔ لیکن دُوسرے لحظے میں تاریکی پیشتر سے بھی زیادہ ہوگئی۔ ہاں اسی بجلی کے کوندنے کے ساتھ ایک رُوح عالم بالا سے عناصر میں اُتر آئی۔ یعنے کرشن پیدا ہُوا۔

اگر یہ راجکمار کسی اَور وقت اور حالت میں پیدا ہوتا تو خبر نہیں کتنے خوشی کے شادیانے بجتے۔ اور کیا کیا جشن منعقد ہوتے۔ مگر اُس وقت تو اس کی جان کے لالے پڑے ہُوئے

تھے۔ اور یہی کوشش تھی کہ کسی کے کان میں اُس کی بھنک تک بھی نہ پڑے۔ بدنصیب والدین نے اپنے لال کی پوری طرح شکل بھی نہ دیکھی اور واسدیو اُسے کپڑے میں لپیٹ کر قید خانے سے باہر پہنچا دینے کے ارادے سے چلا۔ محبس کے دروازے پر جگہ جگہ دربان بیٹھے تھے۔ جو آتے جاتے آدمی کا جائزہ لیتے تھے۔ مگر قسمت یا طوفان نے اسوقت اُنکی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور واسدیو اپنے قیمتی خزانے سمیت ان سب کی آنکھ بچا کر نکل گیا۔ اور شہر سے کچھ دُور جنگل میں جا نکلا۔ یہاں ان دنوں ایک خانہ بدوش فرقے کے لوگ ٹھہرے ہوئے تھے جو گوپوں کے نام سے موسوم تھے۔ اس فرقے کے سردار نند سے واسدیو نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ حسب قرار داد کرشن جی نند اور اسکی بیوی جسودھا کے حوالے کئے گئے۔ اور نند نے کمال بہادری اور انسانی ہمدردی سے اپنی نوزائیدہ لڑکی واسدیو کو دیدی۔ جنہوں نے اُسے لا کر دیوکی کے پہلو میں لٹا دیا۔ دُوسرے دن ظالم کنس کو خبر ملی کہ دیوکی کے ہاں کوئی لڑکا بالا پیدا ہوا ہے۔ وُہ سنگدل جلاد فوراً قید خانے پہنچا۔ اور آتے ہی اس ننھی سی جان کا قید خانے کے سنگین فرش کے ساتھ خاتمہ کر دیا۔

یہاں پر لوگ ایک حکائت بیان کرتے ہیں کہ وُہ لڑکی فرش پر گرتے ہی آسمان کی طرف اُڑ گئی۔ جس سے راجہ کنس کو بہت کچھ خوف و ہراس پیدا ہوا۔ لیکن یہ حکائت قابلِ تسلیم نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہو گی۔ کہ راجہ کنس کے نفسِ لوامہ نے اس خونی فعل پر اسے ملامت کی ہو گی۔ اور اس کی آئندہ بربادی اور پاداشِ جرائم کا نقشہ اُس کے سامنے کھینچ دیا ہو گا۔

ادھر کی تو یہ کیفیت رہی۔ اُدھر کرشن جی جسودھا اور نند کے سایۂ عاطفت میں پرورش پانے لگے۔ چونکہ گوپوں کی قوم ایک جگہ مقیم رہنے کی عادی نہ تھی۔ اِس لئے تھوڑے دن متھرا میں قیام کر کے نند نے گوکل کی طرف کوچ کر دیا۔ اور اسی مقام میں کرشن جی کا زمانۂ طفولیت بسر ہوا۔

جو حکائتیں جو انکی اوائل عمر کی نسبت ناعاقبت اندیش عقیدت کیشوں کی افترا پردازی کی بدولت مشہور ہیں۔ سب اسی زمانے اور اسی جگہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ لیکن اگر ان حکائتوں کو ایک مورخ کی غائر نظر سے دیکھا جائے، تو سوائے ایک نوعمر لڑکے کی طفلانہ شوخی کے اور کوئی بات ان کی تہ میں نہیں

معلوم ہوتی۔ خصوصاً جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ اس وقت کرشن جی کی عمر پندرہ سولہ برس سے بھی کم تھی۔ تو ہمیں ان لوگوں کی کدرباطنی پر نہ صرف افسوس ہوتا ہے بلکہ انکی کم عقلی پر ہنسی بھی آتی ہے۔ جنہوں نے ایسی بے بنیاد روائتیں بلاکسی ثبوت کے ایک نوعمر لڑکے کی طرف منسوب کردی ہیں۔ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ کرشن جی کو بچپن میں طفلانہ کھیلوں میں بہت انہماک رہتا تھا۔ اور اپنی شوخی اور چلبلے پن کی وجہ سے گوپوں کے تمام طائفہ میں ہر دلعزیز ہو گئے تھے۔ انکی رضاعی ماں جسودھا خصوصاً ان سے محبت کرتی تھی۔ اور یہ لقب کاہن یا کنھیا جس سے وہ عوام میں مشہور ہیں۔ اسی کا دیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

گوپوں کے تمام لڑکے لڑکیاں کرشن جی کے حکم کی متابعت کرتی تھیں۔ اور انھوں نے اپنے ہمجولیوں کا خاصہ ایک لشکر بنا لیا تھا۔ جس کے سرگروہ خود بدولت تھے۔ کرشن جی کا گروہ گوکل کے میدانوں میں سارا دن رنگ رلیاں منایا کرتا تھا۔ اور انکے قہقہوں اور چہل سے جنگل میں منگل ہو جاتا تھا۔

چاندنی رات میں خوب لطف رہتے تھے۔ کرشن جی کی بانسری سے تمام جنگل گونج اٹھتا تھا۔ اور صحرائی جانور بھی محو ہو جاتے تھے۔ گوپوں کے لڑکے اور لڑکیاں ہاتھ میں ہاتھ دیکر ایک حلقے میں ناچا کرتے تھے۔ اور اپنے ناچ رنگ سے جنگل کو راجہ اندر کا اکھاڑا بنا دیتے تھے۔ گوپیوں[۱] کا لباس نہایت سادہ ہوتا تھا۔ مگر اس سادگی میں دلفریبی کا ایک عالم نکلتا تھا۔ انکی زیبائش زیادہ تر قدرتی پھول تھے۔ جو پیشانی پر اور کانوں کے پیچھے باندھے جاتے تھے۔ اور جن کی چاندنی میں اس قدر بہار ہوتی تھی۔ کہ خود چاند بھی انکے معصوم چہروں کی آب و تاب دیکھنے کو۔ درختوں کی شاخوں میں سے جھانکا کرتا تھا۔ اور اپنی ہلکی ہلکی روشنی انپر رحمت کے سائے کی طرح ڈالدیتا تھا۔

[۱] گوپیوں یعنی گوپوں کی لڑکیوں کے لباس اور آرائش کی نسبت یہ کنایات ایک مصور ڈاکٹر گنگولی کی ایک تصویر سے اخذ کیے گئے ہیں۔ راقم

کرشن جی نے قدرت سے شاعرانہ طبیعت پائی تھی۔ برج کے میدان ان کے لئے مشاغل اور تفریحات کی ایک کان تھے۔ پتے پتے میں انہیں معرفتِ حق کا ایک دفتر نظر آتا تھا۔ اودھر نظر اُٹھتی تھی۔ اُدھر ایسا قدرتِ کاملہ کا ظہور پاتے تھے۔ کہ طبیعت میں خواہ مخواہ عجیب رُوحانی جذبات پیدا ہوتے تھے۔ تناور درخت اپنی لمبی لمبی شاخوں کو ہاتھوں کی طرح پھیلاتے تھے اور اس قدرت کے شیدائی کو اپنی آغوش میں بلاتے تھے۔ چشمے اپنی لُطف خیز روانی میں وُہ درد بھرا راگ سناتے تھے۔ جسے سوائے درد بھرے دل کے اور کوئی نہیں سنتا۔ کرشن جی اپنے وقت کا بیشتر حصہ جنگلوں کی سیر ہی میں گذارا کرتے تھے۔ کبھی کسی چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ کبھی کسی درخت پر چڑھ گئے اور اُس کی چوٹی پر بیٹھ کر بانسری بجانے لگے۔ بانسری بجانے میں انہیں خاص کمال تھا۔ ان کے ہاتھ میں یہ بیجان چیز بالکل گویا ہو جاتی تھی۔ اور ایسی آوازیں نکالتی تھی۔ گویا اس کی رُوح پر صدمہ پہنچا ہے۔ نالہ نے کرشن جی کی بانسری پر ہی صادق آتا تھا۔ وُہ تمام جذبات جو انکی اپنی بیچین طبیعت میں جوش مار رہے تھے۔ بانسری کے چاک سینے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ اور وہاں سے ان دردناک صداؤں کے پیرائے میں نکلتے تھے۔ جن کے سُننے سے ہر ایک شخص کا دل موم ہو جاتا تھا۔ انہیں اس کمال کا ہونا کچھ تعجب خیز بات نہ تھی۔ کیونکہ ان کے کان اس موسیقی سے آشنا ہو گئے تھے جو تمام کائنات کی تہ میں ہے۔

مگر یہ سب باتیں خواب وخیال کی طرح گذر گئیں۔ ابھی کرشن جی کی عمر پُورے پندرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی۔ کہ راجہ کنس کو اس بات کی خبر لگ گئی۔ کہ دیوکی اور واسدیو کا فرزند زندہ سلامت ہے۔ اور گوکل میں پرورش پا رہا ہے۔ کنس کے مظالم کی وجہ سے اس کی رعایا سخت ناراض تھی۔ اس لئے اُسکا یہ توحوصلہ نہ ہُوا۔ کہ کھلم کھُلا کرشن جی کی موت کا حکم دیدے۔ مگر دل میں یہ ٹھان لی کہ متھرا بُلوا کے دھوکے سے مروا ڈالے۔ لیکن خُدا کو کچھ اور منظور تھا۔ کرشن جی متھرا آئے۔ لیکن کنس اُنکا بال بھی بیکا نہ کرسکا۔ اُلٹا اُنکے ہاتھ سے خود قتل ہُوا۔ اور تمام ملک ومال انکے ہاتھ میں آگیا۔ مگر اب دُنیاوی جاہ و مرتبہ کی انہیں آرزو نہ تھی۔ گوکل ہی میں انکے خیالات روحانیت

کی بابت واقف ہو گئے تھے۔ اوہام پرستی اور اعتقادات باطلہ سے تو انہیں ابتدا سے نفرت تھی۔ جادو ہن گئے شکست دے کر کنس کے مقتول ہونے پر اگرسین کو بٹھا کر آپ تعلیم و تعلم میں مشغول ہو گئے۔ اور راج پاٹ چھوڑ کر جنگل میں رہنا اور درویشوں کی صحبت اختیار کر لی۔ اس طرز زندگی کو انہوں نے صرف دو مرتبہ ترک کیا۔ ایک تو جب راجہ جراسندھ نے متھرا پر چڑھائی کی تو انہیں چار و ناچار اس کی سرکوبی کے لئے جانا پڑا اور دوسرے پانڈوں کے ساتھ ہو کر کوروں اور پانڈوں کی عظیم الشان جنگ میں حصہ لیا۔

اگرچہ ہندو مورخ لکھتے ہیں۔ کہ مہابھارت کی لڑائی میں کرشن جی کسی کی طرف سے ہو کر عملاً نہیں لڑے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ انکو پانڈوں سے ہمدردی تھی اور پانڈوں کی فتح زیادہ تر انہیں کی مناسب وقت صلاح اور عمدہ مشورے کی بدولت تھی۔

پانڈوں کی لڑائی سے فارغ ہو کر کرشن جی نے ارادہ کر لیا۔ کہ اب باقیماندہ حصۂ عمر رہبانیت کی زندگی ہی میں گذاریں گے۔ اور اس لئے سب خویش و اقارب اہل و عیال کو الوداع کہہ کر جنگل میں نکل گئے۔ مگر اب ان کے اس منزلِ ہستی سے کوچ کرنے کا وقت آگیا تھا۔ ایک دن ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے۔ کہ ایک شکاری کا تیر اتفاقیہ ان کے پاؤں میں آ لگا۔ شکاری جب اپنی غلطی سے متنبہ ہوا تو بہت کچھ عذر معذرت کرنے لگا۔ اور دوا درمن کی تدبیر میں مشغول ہوا۔ مگر کرشن جی نے اس کی تشفی کی اور کہا کہ دوا سے اب کچھ فائدہ نہیں۔ قسمت میں یہ بات یونہی لکھی تھی۔ اس میں تمہارا بھی کچھ قصور نہیں۔ اسی قسم کی باتیں کرتے ہوئے جہانِ فانی سے سدھار گئے۔ اور اپنے پیچھے ایک ایسا نام چھوڑ گئے۔ جو باوجود افترا پردازیوں سے زنگ آلود ہو جانے کے بھی ہمیشہ تک کندن کی طرح چمکتا رہیگا۔

کرشن جی کی تعلیم زیادہ تر بھاگوت گیتا میں شامل ہے۔ اور یہ وہ نصیحت آمیز نظم ہے جو کرشن جی نے ارجن کو میدانِ جنگ میں سُنائی تھی۔ اس نظم کا فلسفہ بدھ مذہب کے فلسفے سے بہت کچھ ملتا جلتا ہو اور اس لئے اس کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں۔ مگر علاوہ فلسفے کے اس میں بہت سے کارآمد نصائح اور بھی ہیں۔ چونکہ فی الحال ہمارا مقصد روحانیت کے جھگڑوں میں پڑنے کا نہیں اس لئے کرشن جی کی تعلیم

سے قطع نظر کرتے ہیں۔

ہاں ایک بات اس میں ضرور ہمارے لئے دلچسپی کا موجب ہے۔ وُہ یہ کہ اس کا میلان وحدانیت کی طرف بہت زیادہ ہے۔

بہرحال کرشن جی کی تعلیم کی نسبت جو جسکا جی چاہے رائے رکھے مگر اس بات کے ماننے میں تو شاید کسی منصف مزاج شخص کو تامل نہ ہوگا۔ کہ وُہ دنیا کے برگزیدہ آدمیوں میں سے ایک تھے وُہ صفات جو ان میں پائی جاتی تھیں۔ ہر ایک بشر کے حصے میں نہیں آتیں۔ بلکہ خدا کی طرف سے خاص خاص لوگوں ہی کو عطا ہوتی ہیں۔ ؎ این شجاعت بزورِ بازو نیست + تا نہ بخشد خدائے بخشندہ +

اختر دہلوی

جو تصویر آج ناظرینِ مخزن رسالے کے شروع میں دیکھتے ہیں۔ وُہ کئی لحاظ سے دلچسپ ہے۔ یہ ایک مجمع احباب ہے۔ سوائے شیخ عبدالعزیز صاحب بی۔ اے ایڈیٹر اخبار آبزرور لاہور کے اس مجمع کے سب ارکان ایسے ہیں جن کے نام اور مضامین مخزن کے صفحات میں ناظرین مخزن نے بارہا پڑھے ہیں۔ میر نیرنگ صاحب بی۔ اے کا حسن بیان اُنکے کلام کی پختگی اور ان کا فلسفیانہ تخیل اکثر دلوں کے لئے تنہائی میں باعثِ تسکین ہوا ہے۔ زندگی کے بعض مسائل پر جو روشنی انکی شمع فکر نے ڈالی ہے۔ اور جو افسردگی آمیز مسرت اُنکے اشعار پڑھنے سے پیدا ہوتی ہے۔ انکی خصوصیت انداز کی کافی شہادت ہے مرزا اعجاز حسین صاحب اعجاز بی۔ اے وکیل انبالہ کی نظمیں اپنی شیرینی اور تاثیر سے پڑھنے والوں کے دلوں کو متاثر کر چکی ہیں۔ میاں عبدالعزیز صاحب ایم۔ اے اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر پنجاب کے مضامینِ نثر ہمیشہ نتیجہ خیز اور چستی عبارت اور بندش فقرات کے لحاظ سے قابلِ قدر اور لائقِ تقلید ہوتے ہیں۔ مولوی عبدالرشید چشتی بی۔ اے (مرحوم) کے مضامین مرحوم کی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے۔ اور اُن کی وفات کے بعد اُن کے مسودات نظم و نثر ان اوراق میں حسرت و ارمان کے ساتھ شائع کئے گئے۔ یہ ایک غنچہ تھا کہ بن کھلے مرجھا گیا۔ یہ مرقع ہم کو اتفاق سے مل گیا ہے۔ چونکہ یہ سب صاحب آپس میں رشتہ محبت و صداقت سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ہمیں مناسب ہوا کہ ان کی تصویر یکجا چھاپی جائے۔ دُوسری بات اس تصویر میں یہ ہے کہ سب کے سب دوست دوستانہ بے تکلفی کی بنا پر اس تصویر میں بڑی سادگی کی حالت میں ہیں +

زندگی کی محبّت

جُوں جُوں عمر گذرتی ہے اگرچہ اُس کے ساتھ ساتھ ہی ہماری زندگی کے مقصُودہ حظائذ کم ہوتے جاتے ہیں مگر زندہ رہنے کی خواہش بڑھتی رہتی ہے۔ وُہ خطرات جنہیں جوانی میں ہم حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اب بڑھاپے میں نئی خوفناک صُورتیں بنا کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ہی دُور بینی بھی بڑھتی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارا دِل خون کا دائمی مسکن ہو جاتا ہے۔ اور عمر کا باقی حصّہ ایسی بیکار کوششوں میں صرف ہوتا ہے جن سے ہمارا مقصُود یا تو انجامِ حیات (موت) سے بچنا یا حیاتِ ابدی کا حصُول ہوتا ہے۔

ہماری فطرت میں عجیب تناقض واقع ہوا ہے جس سے عُقلا بھی مستثنےٰ نہیں۔ اگر ہم اپنی آئیندہ زندگی کا مقابلہ اپنی گذشتہ زندگی سے کریں تو منظر نہایت ہیبت ناک دکھائی دیتا ہے۔ تجربہ بتلاتا ہے کہ گذشتہ حظائظ سے ہمیں کوئی سچی خوشی حاصل نہیں ہُوئی۔ اور احساس یقین دلاتا ہے کہ گذشتہ حظائظ آئیندہ کی لذتوں سے زیادہ مزیدار تھے۔ مگر تجربے اور احساس دونو کا عمل بے سُود ہوتا ہے۔ اُمید جو اِن دونوں سے زیادہ قوی ہے مستقبل کے منظر کو خیالی خوبصُورتی سے منوّر کرتی ہے اور کوئی نہ کوئی خوشی اِس وسیع میدان میں ایسی نظر آجاتی ہے جو ہمیں دُور سے اشارہ کرتی ہے کہ ادھر میری طرف چلے آؤ"۔ پس ایک قمار باز کی طرح جتنا ہم ہارتے جاتے ہیں۔ ہماری ہر ایک ناکامیابی ہمیں اور زیادہ شوق دلاتی ہے کہ ہم اِس قمار کو جاری رکھیں۔

تو پھر میرے عزیز! یہ روز افزوں (زندہ رہنے کی) خواہش کس طرح پیدا ہوتی ہے۔ جو ہماری عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے؟ یہ بات کیسے ہوتی ہے کہ ہم اپنے وجُود کے قائم رکھنے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں اور پھر اس وقت جب اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا ہے (بڑھاپے میں)؟ کیا یہ ہماری فطرت ہے جو بقائے نسلِ انسان کے لئے ہمارے زندہ رہنے

کی خواہش کو زیادہ - اور ہمارے حظائظِ زندگی کو کم۔ کرتی رہتی ہے - چونکہ یہ فطرت حواس کو ہر ایک خوشی سے محروم کر دیتی ہے۔ - قوتِ متخیّلہ کو اس محرومی میں بلند پروازی کا خاصا سامان مل جاتا ہو- ایک ضعیف العمر کے لئے جو صدہا قسم کی کمزوریوں کے بوجھ میں دبا ہوا ہو زندگی وبالِ جان ہو جاتی ہے۔ اگر وہ موت سے صرف اتنا ہی خائف ہو جتنا جوانی میں تھا۔ گھٹتی ہوئی طاقت کے بیشمار مصائب اور ان خوشیوں کا مزا جو گذر چکی ہیں دفعتہً اس کو آمادہ کر دیگا۔ کہ اس مصیبت کی زندگی کا اپنے ہی ہاتھوں سے خاتمہ کر دے - مگر خوش اتفاقی سے اس کی موت سے لاپروائی اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس وقت جبکہ یہ نہایت نقصان رساں ثابت ہوتی - اور زندگی اُسی نسبت سے جب اسکی اصلی قیمت کچھ نہیں رہتی ایک خیالی قیمت حاصل کر لیتی ہے -

ہمارے گرد کی ہر ایک شے سے ہمارا تعلق جُوں جُوں ہم اُن سے زیادہ اور زیادہ آشنا ہوتے جاتے ہیں بڑھتا جاتا ہے - ایک فرانسیسی حکیم کا قول ہے کہ "مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے کہ مَیں ایک ایسے کھمبے کو جس سے مَیں ایک عرصہ سے آشنا ہوں اُکھڑا ہوُا دیکھوں"۔ پس دل جب مختلف چیزوں سے مانوس ہو جاتا ہے تو وُہ خود بخود ان کے دیکھنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ اُن سے ملتا تو ہے عادتاً۔ مگر جُدا ہوتا ہے طوعاً و کرہاً اِسی وجہ سے ضعیف العمر اکثر ہر ایک قسم کی ملکیت کے حریص ہوتے ہیں - انہیں دُنیا سے اور کُل مخلوق سے محبت ہوتی ہے - انہیں زندگی سے اور اس کے تمام منافع سے محبت ہوتی ہے - اِس لئے نہیں کہ وُہ اِس سے حظ اُٹھاتے ہیں بلکہ صرف اِس لئے کہ وُہ اِس سے مانوس اور دیر سے آشنا ہوتے ہیں -

شہزانگ جو معصوم کے نام سے مشہور ہے جب چین کے تخت پر بیٹھا تو اُس نے حکم دیا کہ تمام قیدی جو سابقہ بادشاہوں کے عہد میں بے انصافی سے قید خانے میں اسیر ہیں فوراً رہا کر دیئے جائیں۔ اِس آزاد کردہ تعداد میں سے جو بادشاہ کے شکریہ کے لئے آئے ایک بوڑھا بھی تھا۔ جو بادشاہ کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا "اے چین کے بڑے مالک مجھ کمبخت کی طرف دیکھ ! جس کی عمر اس وقت پچاسی برس کی ہے اور میں بائیس برس کی عمر میں جیلخانے میں قید کیا گیا تھا۔

مجھ بیگناہ کو بغیر اس کے کہ میرے الزام لگانے والے میرے سامنے بھی لائے جاتے - قیدخانے میں بھیجدیا گیا - مَیں پچاس برس سے زیادہ تنہائی اور اندھیرے میں رہا ہُوں - اور اس مصیبت سے مانوس ہوگیا ہُوں - اب اس سُورج کی چمک سے جس کا دیدار تیری بدولت مجھے نصیب ہوا میری آنکھیں چُندھیائی ہیں - مَیں بازاروں میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا - کہ شاید کوئی دوست مِلجائے - جو میری مدد کرے مجھے تکلیف سے بچائے اور مجھے پہچانے - لیکن میرے دوست اور میرا خاندان سب کے سب مرگئے اور میرا کوئی بھی شناسا نہ رہا - اَے شہنشاہ تُو مجھے اجازت دے کہ مَیں اپنی بقیہ مصیبت کی زندگی بھی اُسی قیدخانے میں گزاروں - میری اندھیری کوٹھری کی دیواریں مجھے ان شان وشوکت کے محلوں سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی ہیں - میری زندگی کے دِن اب تھوڑے ہی سے باقی رہ گئے ہیں - اور میں نہایت ناخوش اور رنجیدہ رہونگا اگر مَیں اسی قیدخانے میں جس سے تو نے رہا کیا ہے اور جس میں اپنی جوانی کے دن مَیں نے گذارے ہیں واپس نہ بھیجدیا جاؤں "

جیسا کہ یہ ضعیف العمر قید کا شائق تھا اسی طرح ہم بھی زندگی کے ہیں - ہم اِس قیدخانہ دُنیا سے مانوس ہوگئے ہیں - اگرچہ ہم چاروں طرف ناراضگی سے نظر کرتے ہیں اور اس مسکن سے بیزار ہیں مگر ہماری قید کی طوالت ہماری اس قیدخانے کی اُلفت کو بڑھاتی ہے - جن درختوں کو ہم نے لگایا ہے - جن مکانوں کو ہم نے بنایا ہے اور وُہ اولاد جن کو ہم نے جنا ہے - سب کے سب ہماری دُنیا سے بندش کو تنگ کرتے ہیں - اور اِن سے علیحدگی تلخ معلوم ہوتی ہے - زندگی نوعمروں کو ایک نئے آشنا کی طرح بُھاتی ہے - کیونکہ وُہ آشنا جسکی صُحبت سے سیری نہ ہوئی ہو ہمیشہ پیارا اور بھلا معلوم ہوتا ہے - پس زندگی مثل ایک نئے حبیب کی صُحبت کے دلکش معلوم ہوتی ہے - اگرچہ اِس کی پروا ایک صُورت میں بھی کم کیجاتی ہے - ہمیں جو بُڈھے ہوگئے ہیں زندگی مثل ایک دیرینہ دوست کے معلوم ہوتی ہے جس کی خوش مذاقیوں کا لُطف ہم پچھلی صُحبتوں میں اُٹھا چکے ہیں - پس کوئی نئی بات ایسی پیش نہیں آتی جو تعجب انگیز ہو - تاہم ہمیں زندگی سے محبت ہوتی ہے - اگرچہ ہم ہر ایک لذت سے محروم ہوں لیکن ہماری اس کے ساتھ محبت بدستور رہتی ہے - ضائع ہونے والے سرمائے کی حفاظت ہم روز افزوں لیتے ہیں!

اور کفایت شعاری سے کہتے ہیں اور اس کی مہلک جدائی کے سبب تمام صدمات کی تکلیفیں جھیلتے ہیں۔

معرفلپ مورڈانٹ ایک نوجوان۔ خوبصورت۔ دلیر اور سچا انگریز تھا اوّل تو اُس کی اپنی ہی ذاتی جائداد بہتیری کچھ تھی اور پھر اس پر بادشاہ کا منظورِ نظر ہوگیا تھا۔ جو امر بذاتہ ایک دولتِ عظمیٰ سے کم نہ تھا۔ زندگی نے اپنے تمام (خوشیوں کے) خزانے اس کے سامنے کھول دیئے۔ اور آئندہ خوشیوں کے ایک غیر متناہی سلسلے کا یقین دلایا۔ اُس نے آکر ان لذائذ کا مزا چکھا اور فوراً اُن سے متنفر ہوگیا۔ زندگی سے اُسے نفرت ہوگئی۔ اُسی اثنا کے اندر بار بار پھرنا اُسے بارِ خاطر گذرا۔ اُس نے ہر لذت کا مزا چکھا اور دیکھا کہ دوسری دفعہ اس میں وُہ مزا ہی نہیں رہتا۔ اُس نے اپنے دل سے چلّا کر کہا "جب جوانی ہی میں ہی زندگی ایسی بدمزہ ہے تو بڑھاپے میں کیا حالت ہوگی؟ جب اس وقت اس میں کچھ لطف نہیں تو اُس وقت تو یقیناً وبالِ جان ہوجائیگی"۔ اس خیال نے اُس کے افکار کو تلخ بنا دیا۔ یہانتک کہ اُس نے اپنی گمراہ عقل کی ہدایت سے اس جھگڑے کا فیصلہ پستول سے کر دیا۔ اگر اس اپنی ذات پر دھوکہ کھانے والے شخص کو یہ معلوم ہوتا۔ کہ عمر کے بڑھنے ہی سے ہماری زندگی کی محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے تو وُہ شاید بڑھاپے کا استقبال بلاخوف کرتا۔ وُہ زندہ رہنے کی جرأت کرتا۔ اور اپنی آئندہ محنت سے اس سوسائٹی کی خدمت کرتا جس کو اُس نے تنگدلی سے خیرباد کہہ کر نقصان پہنچایا ✦

(ترجمہ از گولڈ سمتھ)

لطیف احمد (از پانی پت)

ایک مُسکراہٹ۔ ایک مسکراہٹ کی قیمت کون بتا سکتا ہے؟ دینے والے کا اس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ لیکن پژمردہ خاطر۔ گنہگار۔ افسردہ دل اور بیکس کے حق میں یہ انمول ثابت ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر تند خو بدمزاج رام ہوجاتے ہیں۔ نفرت محبت سے۔ انتقام مہربانی سے بدل جاتا ہے۔ اور تنگ و تاریک مکانات جواہرات کی روشنی سے جگمگا اُٹھتے ہیں۔ خندہ پیشانی۔ نیک دل انسان۔ جانی دوست۔ محبت کرنیوالے بھائی۔ تابعدار بیٹے اور مہربان شوہر کی نشانی ہے۔ اس سے حُسن دوبالا ہوجاتا ہے۔ بدصورتی پر پردہ پڑجاتا ہے۔ اور حسین عورت بہشتی فرشتوں سے مشابہ ہوجاتی ہے ✦

اہلِ قلم کی اپیل

(اہلِ رسالہ کی خدمت میں)

آج کل چشمِ بدمُور رسالوں کی پلٹنوں کی پلٹنیں کھڑی ہوگئی ہیں اور ہم غریب اہلِ قلم پر وُہ دُھواں دھار چاند ماری ہو رہی ہے کہ الامان والحفیظ - ناچار تابِ مقاومت نہ لاکر ہم مخزن کی آڑ میں پناہ لیتے ہیں اور اس رسالے کے کمان افسر کی خدمت میں بہ ادب عرض کرتے ہیں کہ ع اے صبا ایں ہمہ آوردۂ تست - رسالوں کی تعداد میں یہ روز افزوں ترقی ایک لحاظ سے تو فالِ نیک ہے اور اس سے ادبِ اُردو کی ترقی کی توقع ہوتی ہے مگر ایامِ غدر کی سی بیقاعدہ فوج سے قلعہ کشائی کی اُمید رکھنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں - بندوق میں گولی نہیں جھولے میں روٹی نہیں - قواعد پریڈ کی فرشتوں کو خبر نہیں اور چلے میرے جنگی کشورکشائی کو ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند -

شیخ جہانیاں جہاں گشت نے جب پہلے پہل مخزن نکالا تو خُلق سے مُروّت سے حیلے سے فریب سے سازو نیاز سے سازوباز سے ہم سب سادہ لوح اہلِ قلم کے مچلکے لکھوالیئے اور عہدوپیمان کی زنجیروں سے ایسا جکڑا کہ کسی میں جُنبش کی سکت باقی نہ رہی - اِدھر شیخ کی چرب زبانی اُدھر مخزن کی ملتانی غرض کچھ ایسے اسباب جمع ہوگئے کہ کلکتے سے پشاور اور کشمیر سے حیدرآباد دکن تک سب اہلِ قلم شیخ کے مسخر ہوگئے - حضرت تو اپنا جادو منتر چلاکر چلتے بنے اور ساتوں سمندر سے پار ہوگئے مگر منتر اپنا کام کر رہا ہے اور کرتا رہیگا -

مخزن کے دیکھا دیکھی درجنوں رسالے نکل آئے - اور کوڑیوں نکلتے چلے آتے ہیں - جو نیا رسالہ نکلتا ہے اس کی ایک کاپی بڑے لمبے چوڑے اشتیاقیہ خط کے ساتھ ہمارے پاس بھیجی جاتی ہے اور قلمی امداد جیسی امداد کا تقاضا کیا جاتا ہے - سچ پوچھو تو ہم کچھ ایسے بڑے لکھنے والے بھی نہیں - ہماری جدید شیں ڈھیلی قافیے غلط اور نیم انگریزی نیم فارسی سٹائل آدھا تیتر آدھا بٹیر کا مصداق پایا جاتا ہے -

مگر پہلے قدردان ہیں کہ لٹو ہوئے جاتے ہیں ہم اہلِ قلم کی آمدنی عموماً ساٹھ سے ستر روپیہ ماہوار تک ہوتی ہے اس سے جس کی زیادہ آمدنی ہو وہ اہلِ دولت ہے اہلِ علم نہیں۔ اور جس دماغ میں نشۂ دولت ہو وہاں سے ذوقِ علمی اپنا بستر اٹھا لیا کرتا ہے۔ اور اہلِ دولت کی تصنیفات میں وہی مزہ آتا ہے جو . . . . صاحب کی غزلوں میں۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ ہم لوگ دولتمند نہیں اور جب دولتمند نہیں تو ایک کوڑی رسالے جو ہمارے ہاں آتے ہیں پانچ کوڑی کے بھی نہیں کیونکر خریدیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اگر ہم قلمی امداد بھی ان سب کی کریں تو دنیا کے اور کاروبار کس وقت کریں اور کاروبار چھوڑ دیں تو کھائیں کہاں سے۔ آپ کے اشتہار سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا و مافیہا کی اصلاح کا بارِ امانت آپ نے اٹھا لیا ہے مگر سچ فرمائیے کہ اس رسالے کی فتوحات سے آپ اپنا پیٹ نہیں پالتے۔ کیا یہ انصاف ہے کہ آپ کی ضیافتِ طبع اور ضیافتِ شکم کے لئے ہم خونِ جگر بہائیں اور اس کا کچھ معاوضہ نہ ہو آج کل رسالوں کی کثرت کی وجہ سے ہمارے وقت کا ایک معتدبہ حصہ انکاری خطوط میں ضائع ہوتا ہے مگر صاحبِ رسالہ اور صاحبِ اخبار اس انکار کو تسلیم نہیں کرتے اور مکرر سہ کرر لکھتے ہیں جس میں کچھ نرمی ہوتی ہے کچھ گرمی کچھ دھمکی کچھ تھپکی۔ یہ بھی شکایت کی جاتی ہے کہ مخزن کے لئے تو آپ کے پاس وقت ہے مگر ہمارے لئے نہیں ہم بھی تو آپ کے پرانے نیازمندوں میں ہیں"۔ یہ آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے اور آپ کی خدمت میں ہم کو بھی نیازمندی کا دعویٰ ہے۔ مگر اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ مخزن یا کسی اور پرچے کے ساتھ جو ہمارا سابقہ معاہدہ ہے اسکو اس وجہ سے فسخ کر دیں کہ آپ نے بھی ایک رسالہ نکالا ہے جس کی قلمی امداد کی ہمیں فرصت نہیں اور جس کا پڑھنا شاید مفت میں بھی ہم کو گوارا نہیں۔

بندہ نواز! اگر پولیٹکل اکانومی کے اصولِ تقسیمِ محنت کو آپ ملاحظہ فرمائینگے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ہم غریب اہلِ قلم پر آپ بیجا سختی کر رہے ہیں۔ اگر آپ خریداری کے لئے ہم کو لکھتے ہیں تو صاف صاف لکھئے اور قلمی امداد کا معاملہ علیحدہ رکھئے۔ اگر ہمارے پاس کافی ٹکے ہونگے اور ہم آپ کے رسالے یا اخبار کو اس قابل سمجھیں گے کہ کچھ ٹکے اس پر خرچ کئے جائیں تو آپ کی

خدمت میں خریداری کی درخواست بھیجدینگے۔ ورنہ ہرگز آپ اپنا قیمتی رسالہ نہ بھیجیں۔ اور اگر آپ قلمی امداد چاہتے ہیں تو اس کا اقل معاوضہ یہ ہے کہ آپ پرچہ مُفت بھیجیں۔ آپ کے پرچے کی سالانہ قیمت دو تین روپیہ ہے اور اگر ہمارے ریختہ قلم کی اتنی بھی قیمت نہیں تو تُف ہو ہماری قلم رانی پر اور حیف ہے آپ کی قدردانی پر۔ یہ دُوسری بات ہے کہ کوئی اہل قلم اپنی رضامندی سے کسی پرچے کی قیمت ادا کرتا رہے مگر ویلیو پے ایبل پارسل بھیجنا اور قلمی امداد کے لئے اصرار کرنا سخت بے انصافی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض اہل قلم جن میں ایک بندۂ درگاہ بھی ہے قلمی امداد کے معاوضے میں مُفت پرچہ لینا بھی پسند نہ کریں اس لئے اس بات کا بھی شروع میں تصفیہ ہوجانا چاہئے۔ اور جب کوئی بھلا مانس کسی مجبوری کی وجہ سے اِنکار کردے تو اس کو قبول فرمالیا کریں اور خط وکتابت کو طول دیکر بیچارے قلم زن کو کج خلقی یا سکوت پر مجبور نہ کیا جائے۔ یہ اعلان عام اس غرض سے شائع کیا جاتا ہے کہ اہل رسائل و اہل اخبار اہل قلم کے حقوق سے واقف ہوں اور یکطرفہ ڈگری اُن پر نہ کیا کریں *

راقم بندہ قلم باز خان

مُطالعۂ تواریخ مذہب کے بعد انسان کی اصلاح کے واسطے کوئی شے علم سے بڑھ کر نہیں۔ اگر فلسفے کی خاردار جھاڑیوں کو ہاتھ لگاتے ہُوئے ڈرتے ہو تو مطالعہ تواریخ میں تو کوئی اندیشہ نہیں۔ اس سے بڑھکر آسان کام کیا ہوگا۔ جس میں تفریح اور فائدہ دونوں موجُود ہیں۔ ایسے شخص کو دیکھ کر ہمیں کیسا افسوس ہوتا ہے جسکی گردن اکڑ گئی ہو اور پیچھے مُڑکر نہ دیکھ سکے۔ لیکن وہ شخص جو گذشتہ کارہائے نمایاں سے بے خبر ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر قابل رحم ہے۔ تواریخ نوجوان کو بغیر جھریوں اور سفید بالوں کے بڈھا بنا دیتی ہے۔ اس سے بڑھاپے کا تجربہ بغیر بڑھاپے کی تکلیفوں کے حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ صرف ماضی کو حال ہی نہیں بنا دیتی۔ بلکہ آیندہ کی بھی خبر دیتی ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں کوئی بالکل نیا واقعہ نہیں پیش آتا۔ ہر ایک چیز ایسی ہی نئی ہوتی ہے جیسے کہ نیا چاند۔ جو اصل میں محض پُرانا چاند بدلی ہُوئی صورت میں ہوتا ہے۔ اسی طرح پُرانے واقعات بھی بار بار نئی نئی اور مختلف صُورتوں میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ریویو

معین الآثار - المعروف بہ تاریخ آگرہ - موسومۃ الصمد کتاب کے مصنف محمد معین الدین صاحب اکبرآبادی جنرل سپرنٹنڈنٹ کلکٹری متھرا ہیں - اس سرتاج عمارات روضہ تاج محل اور آگرے کی دیگر مشہور قدیم عمارات کا تاریخی حال دکیفیت نہایت شرح و بسط کے ساتھ رقم کی گئی ہے - مصنف نے حالات اور واقعات کے فراہم کرنے میں بہت کچھ کوشش کی ہے اور متعدد انگریزی فارسی اُردو کتب سے مدد لی ہے علاوہ معنوی خوبیوں کے ظاہری حیثیت بھی دلکش ہے - ہاف ٹون تصاویر کی خوبصورتی و لطافت خصوصاً قابلِ تعریف ہے - یہ کتاب بہ قیمت عہ مصنف یا محمد فخر الدین صاحب کی نہری کھاٹ آگرہ سے مل سکتی ہے

قند پارسی - محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب رئیس آگرہ نے ملک میں زبانِ فارسی کا مذاق پھیلانے کے لئے علیگڈھ سے یہ ماہوار رسالہ شائع کرنا شروع کیا ہے - ہمیں کامل اُمید ہے کہ جناب ثاقب اس رسالے کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرینگے - پہلا نمبر خاصہ دلچسپ ہے - گو مضامین کے اسلوب طرز تحریر میں قدیم رنگ کی جھلک پائی جاتی ہے - اگر ایران کی موجودہ زبان کے بھی کچھ نمونے ہوں تو یقین ہے کہ رسالے کی دلچسپی دوبالا ہوجائیگی - حجم سولہ صفحے علاوہ سرورق اور لکھائی چھپائی عمدہ - چندہ سالانہ عہ - درخواست بنام ایڈیٹر رسالہ "قند پارسی" علیگڈھ ہو +

جنگِ روس و جاپان - اس نام کی ایک کتاب مطبع مطلع العلوم مرادآباد سے شائع ہوئی ہے جسے سید محمد ابراہیم صاحب مجمی نے ترتیب دیا ہے - چونکہ ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کو اس جنگ سے دلچسپی ہے اس لئے اس کتاب کا مطالعہ پبلک کے لئے خالی از مفاد نہ ہوگا - جنگ کے اسوقت تک کے حالات خوب وضاحت سے لکھے ہیں - اور علاوہ ازیں یہ کتاب جنگ کے متعلق ہر قسم کی واقفیت مہیا کرتی ہے قیمت ۸ر - درخواست بنام ایڈیٹر صاحب اخبار نیر اعظم مرادآباد ہونی چاہیے

جُگنو

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں
یا شب کی سلطنت میں دن کا سفیر آیا
غربت میں آ کے چمکا گمنام تھا وطن میں
تکمہ کوئی گرا ہے مہتاب کی قبا کا
ذرہ ہے یا نمایاں سورج کے پیرہن میں
حُسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اِک جھلک تھی
لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

پروانہ اک پتنگا جُگنو بھی اِک پتنگا
وُہ روشنی کا جویا یہ روشنی سراپا

ہر چیز کو جہاں میں قدرت نے دلبری دی
پروانے کو تپش دی جُگنو کو روشنی دی
رنگیں نوا بنایا مُرغانِ بے زباں کو
گل کو زبان دیکر تعلیمِ خامشی دی
نظارۂ شفق کی خوبی زوال میں تھی
چمکا کے اس پری کو تھوڑی سی زندگی دی
رنگیں کیا سحر کو بانکی دلہن کی صورت
پہنا کے لال جوڑا شبنم کی آرسی دی
سایۂ دیا شجر کو پرواز دی ہوا کو
پانی کو دی روانی موجوں کو بیکلی دی
اِک مُشتِ گل میں رکھا احساس کا شرارہ
اِنساں کو آگہی کیا ظلمت کو چاندنی دی

یہ امتیاز لیکن اک بات ہے ہماری
جُگنو کا دن وُہی ہے جو رات ہو ہماری

حُسنِ ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے
انساں میں وُہ سخن ہے غنچے میں وُہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دِل ہے گویا
واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے

انداز گفتگو نے دھوکے دیئے ہیں ورنہ نغمہ ہے بوئے بلبل بو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی جگنو میں جو چمک ہے وُہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شے میں جبکہ پنہاں خاموشیٔ ازل ہو

اقبال

صُبح کا سِتارہ

لُطفِ ہمسائگیٔ شمس و قمر کو چھوڑوں اور اس خدمت پیغامِ سحر کو چھوڑوں
مدعیٔ حسن ہے دشمن ہے مرا نُورِ سحر یہ ملا خسرو خاور کا سپاہی بن کر
میرے حق میں تو نہیں فلک کی بستی اچھی اس بلندی سے زمیں والوں کی پستی اچھی
آسماں کیا عدم آباد وطن ہے میرا صبح کا دامنِ صدچاک کفن ہے میرا
میری قسمت میں ہے ہر روز کا مرنا جینا ساقیٔ مَوت کے ہاتھوں سے صبُوحی پینا
نہ یہ خدمت نہ یہ عزت نہ یہ رفعت اچھی اِس گھڑی بھر کے چمکنے سے تو ظلمت اچھی

میری قدرت میں جو ہوتا تو نہ اختر بنتا
قعرِ دریا میں چمکتا ہوًا گوہر بنتا

واں بھی موجوں کی کشاکش سے جو دل گھبراتا چھوڑ کر بحر کہیں زیبِ گلو ہو جاتا
ہے چمکنے میں مزہ حُسن کا زیور ہو کر زینتِ تاج سرِ بانوئے قیصر ہو کر
ایک پتھر کے جو ٹکڑے کا نصیبہ جاگا خاتمِ دستِ سلیماں کا نگیں بن کے رہا
ایسی چیزوں کا مگر دہر میں ہے کام شکست ہے گہرہائے گرانمایہ کا انجام شکست
زندگی وُہ ہے کہ جو ہو نہ شناسائے اجل کیا وُہ جینا ہے کہ ہو جس میں تقاضائے اجل

ہے یہ انجام اگر زینتِ عالم ہو کر
کیوں نہ گر جاؤں کسی پھول پہ شبنم ہو کر

کسی پیشانی کے افشاں کے ستاروں میں ہوں — کبھی مظلوم کی آہوں کے شراروں میں ہوں
اشک بن کر سرِ مژگاں سے اٹک جاؤں میں — کیوں نہ اس بیوی کی آنکھوں سے ٹپک جاؤں میں
جس کا شوہر ہو رواں ہو کے زرہ میں مستور — سوئے میدانِ وغا حبِّ وطن سے مجبور
یاس و امید کا نظارہ جو دکھلاتی ہو — جس کی خاموشی سے تقریر بھی شرماتی ہو
جس کو شوہر کی رضا تابِ شکیبائی دے — اور نگاہوں کو حیا طاقتِ گویائی دے
زرد رخصت کی گھڑی عارضِ گلگوں ہو جائے — کششِ حسن غمِ ہجر سے افزوں ہو جائے
لاکھ وہ ضبط کرے پر میں ٹپک ہی جاؤں — دل سے مانندِ مئے تند چھلک ہی جاؤں
صبر کا خون نکل آیا ہو رل کر مجھ میں — ایک طوفان ہو افکار کا مضمر مجھ میں

خاک میں مل کے حیاتِ ابدی پا جاؤں
عشق کا سوز زمانے کو دکھاتا جاؤں

اقبال

وجد و سماع

وجد میں ہے پیکرِ خاکی کہ ہو عرش آشیاں — شہپرِ پروانہ ہے کھولے ہوئے شہبازِ جاں
بند آنکھیں ہیں کہیں گاہیں پئے عنقا شکار — رقصِ صوفی آہوئے رم خوردہ ہے ضیغم سوار
جوششِ بیتابی ہے ۔ موجِ عالم آشوبی نہیں — ہاں ۔ لگدکوبِ ملائق ہے یہ پاکوبی نہیں

بیقراری ہے دلِ بیتاب کی منزل رساں — دستِ بالا کشتیٔ دل کے لئے ہے بادباں
مجلسِ وجد و سماعِ جاں فشاناں بوتہ وار — قلب سے کرتی ہے نقدِ قلب کو کامل عیار
یہ وہ آتش ہے کہ آپ ہی آپ جاتی ہے سُلگ — یہ وہ آتش ہے کہ اس سے صاف الگ تلچھٹ الگ
یہ وہ آتش ہے دلِ دریا میں بھی ہے اس کا گھر — شاہدِ رقصِ روانی موجِ دریا سر بسر
ہے اسی شعلے سے روشن رقصِ فانوسِ فلک — پردۂ رقصِ صنوبر میں ہے رقصاں خاک تک
اُشتر و آہو و گاؤ و اژدہا و مار و مور — دم بخود ہیں وادی و کہسار و دشت و خاکِ گور
چہچہے ہیں طائرانِ باغ کے اس پر گواہ — وجد و حال و کیف سے لبریز ہے یہ خانقاہ
خامشی در پردہ ہے سازِ نوائے بیخودی — بیخودانہ ہے یہاں جو ہے صدائے بیخودی
بے بجائے آپ بجتا ہے یہ سر آہنگ ساز — چیرتی ہے دل نفیرِ نَے یہاں بے نَے نواز
بے مے و ساقی سرورِ بزم نوشا نوش ہے — بے نَے و مطرب سرود پردہ ہائے گوش ہے
نغمہ پرداز ہوائے شوق ہے دمسازِ سیل — تارِ جاں پر زخمۂ مضراب ہے آوازِ سیل
یعنی پابندِ صدائے ساز یہ ہستی نہیں — بے سرِ مستی مگر ہنگامۂ ہستی نہیں
قطرہ تا دریا ہے سرگرداں اسی سرجوش سے — ذرہ تا خورشید ہے رخشاں اسی سرجوش سے
ہے گلِ یک جلوہ برقِ خرمنِ صد شمعِ طور — اک تبسم ہے بہارِ صد گلستانِ ظہور
ایک اشارہ ہے صد آہنگِ نویدِ کامِ دل — اک نگاہِ شوق ہے صد دفترِ پیغامِ دل
عقدۂ سربستۂ دل ہے گرہ بابِ فتوح — بستۂ خار و خس وادی یہاں طوفانِ نوح
جلوۂ گلزارِ ابراہیم اس آتش سے ہے — سرکشی ہاؤ ہو اس شعلۂ سرکش سے ہے

اس سے خالی آتش و آب و ہوا و گِل نہیں
دل جو ہے بے کیف کم از مشتِ گِل ہے دل نہیں

حافظ سید فضل حق آزاد



لمودری

ذیل کی مستانہ اور مستی انگیز نظم حضرت ناظر کی نواسنجیوں کا ایک تازہ نمونہ ہے۔ کیوں نہ ہو۔ جو بلبل کشمیر جنت نظیر جیسے چمن میں بسیرا کرے۔ اگر وہ ایسی رنگین نوائی نہ کرے تو اور کون کرے۔ نہر لمودری وادی لدر میں نگاہ نظّارہ جو کے لئے ایک کانِ حُسن ہے۔ حضرت ناظر لکھتے ہیں "نہر لمودری کا سلسلہ نسب کوہ ہمالیہ سے ملتا ہے اور وہ شیشرم ناگ کے بطن سے پیدا ہو کر برف کے پنگوڑے اور مخمل کے بچھونے پر لوٹ لگاتی ہنستی کھیلتی وادی کشمیر کی طرف چلی آتی ہے۔ لمودری کے چاہنے والے زیادہ تر یوروپین سیّاح ہیں۔ پہل گام سے عیش مقام تک لمودری کا گذرگاہ نہایت دلکش منظر ہے اور ناظرین کے دلوں میں عجب ولولہ پیدا کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ایسی فضا دیکھ کر اگر ایک شاعر گنگنانے لگ جائے تو قابل معذوری ہے۔ پہلے بند میں شاعر لمودری کا سراپا بیان کر کے مجاز سے حقیقت کو پہنچ جاتا ہے۔ اور گہرا غوطہ لگاتا ہے"۔ ہم بلا تمہید مزید اس نظم کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

کیا آب و تاب تجھ میں نہرِ لمودری ہے
پربت کی تو ہی دیبی یا قاف کی پری ہے
آبِ حیات ہے تُو روحِ نبات ہے تُو
تُو جان و دل کی ٹھنڈک اور آنکھ کی تری ہے
تو کھیلتی ہے بن میں اور لوٹتی چمن میں
نسرین و نسترن میں تیری مصوّری ہے
گُلہار وہ نکیلی شالی وہ پیلی پیلی
ریحاں وہ نیلی نیلی کیا صنعِ داوری ہے

درخشندہ سنگ پارے ہیں چاند یا ستارے
تیری جو کنکری ہے الماس سے کھری ہے

لعل و گہر کے معدن ہیں تیرے جیب و دامن
اور موتیوں سے ہر دم جھولی تری بھری ہے

چشمے ترے مقطر ہیں جام جم سے بڑھکر
چیلوں کی فوج سر پر سدِ سکندری ہے

برف آب سے لبالب ہر دم ہے تیرا ساغر
ساقیٔ بزم تیرا خورشیدِ خاوری ہے

حسن و جمال تیرا غنج و دلال تیرا
ہر خط و خال تیرا طغرائے دلبری ہے

ہے تیری دھن نرالی کیا دل لبھانے والی
جنگل میں کوئی جوگن محوِ نوا گری ہے

ناظرؔ کی ہیں نظر میں تیری ادائیں پیاری
کچھ مجھ سے ملتی جلتی ہے داستاں تمہاری

ہم دونو جادہ پیما صبح و مسا رہے ہیں
بے راہبر رہے ہیں بے رہنما رہے ہیں

آفاق گرد دونو صحرا نورد دونو
ٹیلوں میں جنگلوں میں چکر لگا رہے ہیں

اپنی الاپ پر ہیں ہم دونو مست و شیدا
سر دُھن رہے ہیں خود ہی اور خود ہی گا رہے ہیں

نے کوئی ہمزباں ہے نے کوئی رازداں ہے

پربت کی چوٹیوں کو دُکھڑے سنا رہے ہیں

بانگِ جرس ہیں خود ہی اور خود ہی کارواں ہیں
ہم کوچ کا نقارا ہر دم بجا رہے ہیں

یہ بیخودی و مستی دیتی ہے اور الستی
روزِ ازل کے کیفی سرخوش سدا رہے ہیں

ہم گل کے ہم نفس ہیں بادِ صبا کے ہمدم
مُرغانِ خوش نوا کے ہم ہم نوا رہے ہیں

اے اہلِ شہر تم سے دل کر ہوئے مکدر
صحرا نوردیوں میں ہم باصفا رہے ہیں

گردن کشوں سے دونو ہم کوسوں بھاگتے ہیں
جانب فروتنوں کی خود کھنچتے جا رہے ہیں

قدرت کے شاہدوں کے فوٹو اُتارتے ہیں
جو صورتیں ہیں دیکھی سب کو دکھا رہے ہیں

آئینہ وار بر دل نقش و نگار داریم
ہم شورہ بوم داریم ہم لالہ زار داریم

ہم کو بکو پھرے ہیں اور جا بجا رہے ہیں
تحت الثریٰ رہے ہیں فوق السما رہے ہیں

اُونچی تھی اپنی بستی لیکن یہ غولِ ہستی
سوئے حضیضِ پستی ہم کو گرا رہے ہیں

آفت کا سامنا ہے یاں سیدھی راہ چلنا
مُنہ آ کے پتھروں پر ہم منہ کی کھا رہے ہیں

ہیں گرم رہ نوردی — گو اس سے بے خبر ہیں
آئے تھے کس طرف سے — کس سمت جا رہے ہیں

دل جس جگہ لگانا — واں لوٹ کر نہ آنا
کیا داغ حسرتوں کے — ہم دل پہ کھا رہے ہیں

جو دلکشا نظارے — نظروں سے چھپ چلے ہیں
حسرت بھری نگاہیں — اُن پہ اٹھا رہے ہیں

ہے آب و تاب اپنی — اہلِ جہاں پہ ظاہر
پر زخمِ اندروں کو — سب سے چھپا رہے ہیں

وہ مانے یا نہ مانے — لیکن جبیں کو اپنی
ہم سنگِ در پہ اس کے — ہر دم گھسا رہے ہیں

اک بحرِ بیکراں میں — اپنا نشاں کریں گم
گرتے اُچھلتے پڑتے — اس دھن میں جا رہے ہیں

اے موجِ یم خدارا — تیور پہ بل نہ لانا
ہم سر کے بل تمہارے — قدموں میں آ رہے ہیں

ناظر ز منزلِ دوست — نام و نشاں ندانیم
در شوق راہ پیما — دنبالِ کاروانیم

وہی عاقل ہے جو نیکی کا نہ جادہ چھوڑے — مال مصرف سے کفن کے نہ زیادہ چھوڑے
نفسِ امّارۂ بدخو کا ارادہ چھوڑے — ورقِ دفترِ اعمال نہ سادہ چھوڑے
کھالے کچھ۔ گور کے پھر منہ کا نوالہ ہوگا
قبر میں فوج نہ ہوگی نہ رسالہ ہوگا

([illegible]) — ([illegible])

بارہ دری

(پٹیالہ)

چشم بد دور مناظرِ قدرت اور عجائباتِ عالم پر غائر نظر ڈالنے والے حقائقِ اشیا کی تحقیق میں بہت ترقی کر رہے ہیں۔ جنہوں نے معمولی سے معمولی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کو دیدۂ حقیقت بین سے غور کے ساتھ دیکھا بھالا اور جسکو مناسب سمجھا سلکِ تحریر میں منسلک کیا۔ چنانچہ "ندی" اور "شبنم" کے راگ گائے "کھٹمل" کی سرگذشت بیان کی "پرانی دیا" سے نامۂ شفق کا کام لیا "بلبل شیدا" سے ناز و نیاز کی باتیں کیں "روانیِ آب" پر بحرِ تراوشِ طبیعت کا زور دکھایا "خار" کو رشکِ گلزارِ بہار ثابت کر دکھایا۔ یہاں تک کہ "سوتا شہر" اور "بی کانگڑی" خانم بھی حضیضِ گمنامی سے نکل کر سطحِ علمی پر جلوہ افروز ہوئی۔

چونکہ خاکِ پٹیالہ میں بھی کئی گوہرِ آبدار پنہاں ہیں اس لئے راقم ہمیشہ اس بات کا متمنی اور آرزومند رہا کہ کوئی بلند قلم۔ عالی دماغ۔ اور کہنہ مشق ہاتھ اس نادر ریاست کے قابلِ ذکر مصنوعاتِ انسانی کا مرقع کھینچکر اربابِ نظر کے پیش کرے مگر افسوس میری یہ آرزو بر نہ آئی۔ آخر ان عجائبات پر توجہ نہ کرنا اپنی حق ناشناسی اور ناحق تلفی سمجھ کر اس اہم فرضِ خدمت کا بہتم بالشان حصہ اٹھانا مجھے اپنے ذمے لینا پڑا۔ بہر حال میں ریاست کے عجائبات کو معرضِ تحریر میں لانے کی داغ بیل ڈالتا ہوں۔ وکفیٰ بہٖ فخراً۔

مجھ سے بیدل کو کیا محوِ تماشائے چمن — دل سے لے پٹیالہ تری بارہ دری کا جوبن
حبذا شان زہے حسنِ فضائے گلشن — واہ یہ تازگی و رونق و نزہت یہ پھبن
بارک اللہ یہ منظر یہ مقامِ دلکش — چشم بد دور یہ گل بوٹے یہ سبزہ یہ چمن
خوشا اللہ یہ نقشہ یہ سوادِ میمون — واہ یہ پٹریاں صاف۔ اور یہ سڑکیں روشن
دیکھ پائے اگر اس باغِ بہار افزا کو — حسنِ پیرس ہو فدا اور فضائے لندن
روشیں صاف ہیں یا تختۂ بلور سمجھے — کیاریاں ہیں کہ بھرے رکھے ہیں پھولوں سے لگن

غیرتِ باغ ہے گملوں میں بہارِ تازہ | اور گل دانوں میں گلدستے ہیں رشکِ گلشن
واہ رے فیضِ ہوا نرگسِ اعمیٰ ہو بصیر | گر لگا لے وُہ کبھی خاک کا اس کی انجن
بن گیا ہے وُہ سویدائے دلِ لالہ۔ یہاں | آج تک کہتے رہے داغ جسے اہلِ سخن
بید مجنوں ہے اگر سر کو جھکائے بادب | سرو قد۔ سرو کھڑا ہے پئے تعظیمِ چمن
چشم بر راہ اگر رہتی ہے نرگس ہر دم | ہر گھڑی گوش بر آواز ہیں نسرین و سمن
بل بے خودداری کبھی سیب زمیں پر نہ گرے | کششِ ثقل یہاں گر تو دے ثابت نیوٹن
نرم شاخیں ہیں نسیمِ سحری سے ہلتی | نشے میں جھومتا ہے یاکہ کوئی نازک تن
چھونے سے گویا چھوئی موئی مری جاتی ہے | سر جھکا بیٹھتی ہے شرم سے جس طرح دلہن
لاکلام اس کا ہر اک نخل ہے سرو و شمشاد | اس کے ہر برگ پہ لاریب فدا سو سوسن
اس گلستاں کا ہر اک گل ہے بسانِ گلزار | اس چمن زار کا ہر برگ ہے مانندِ چمن
اس حدیقے کی ہر اک شاخ میں ہے سو خوبی | اس کے ہر غنچہ و گل میں ہر بھری لاکھ پھبن
کمپنی باغ تو کیا ہیچ ہے باغِ لارنس | شالامار اس کے مقابل میں نظر آتا ہے بن
مشرقی رنگ میں نیرنگیِ مغرب شامل | گر ہے یہ پارک تو پٹیالہ سراسر لندن
آسٹریا و اٹلی کے شجر اس میں نہال | گویا انگلینڈ کے پودوں کا یہ گلشن ہے وطن
اس میں یہ کوٹھی حضوری ہے کہ قصرِ ابیض | ہوس آف لارڈز بھی شرمائے نہیں اس میں سخن
روشیں سامنے اس کے جو بنی ہیں پُر لطف | ۱ ہائے تحریر میں آسکتی نہیں وُہ مِن و عَن
سادگی میں ہے تکلف پئے نظارہ غضب | ۲ لوٹ جاتی ہے نظر پڑتے ہی اس پر چتون
پٹڑیاں سرخ بنے دائرے جن میں ہیں سفید | ۳ جس طرح ساعدِ گل گوں میں بلوریں کنگن
سنگریزے ہیں سفید اور سیاہ دونو طرف | ۴ کوڑیالی کوئی لہرا رہی ہے یا ناگن
اک طرف کوہ بنایا ہے بلند و سرسبز | ۱ کرنے اس باغ کا یا آیا ہمالہ درشن
ماشاءاللہ عجب صنعتِ انسانی ہے | ۲ اصل اور نقل میں کچھ فرق نہیں ہر من و عن

گھاٹیاں وُہ ہی - وہی کھوہیں سِلیں بے ترتیب ۳ پتھروں سے وہیج پانی کا نکلنا چھن چھن

سخت ویسی ہی زمیں وُہ ہی درختوں کے ہیں جھنڈ ۴ کہیں ریتہ، بنفشہ - کہیں سنبل - سوسن

آبشاروں سے صدا آتی ہے نغموں کی کہیں ۵ ہے ہوا گویا درختوں میں بجاتی ارگن

اپنی دُھن میں کہیں قمری ہے جھنجھوٹی گاتی ۶ اور تدرو اپنا کسی سمت دکھاتا ہے چلن

قُلّۂ کوہ پہ یہ گنڈلی مارے ہے سانپ ۷ یا جٹا دھاری جی بیٹھے ہیں تجے تن من دھن

ہے تہِ کوہ رواں چشموں سے یہ نہر - کہ ہو ۸ موج زن نیچے ہمالہ کے یہ دریائے جمن

ہے کہیں شیر جُھکا پینے کو پانی اس میں ۹ گا تے چڑچگ کے کہیں بیٹھی ہے پتھر پہ گمن

منظرِ کوہ غرض یہ کہ عجب منظر ہے شاد ہوتا ہے یہاں آ کے گرفتارِ محن

کیوں نہ ہو - فیض سے کس کے یہ ہوا ہی سرسبز اس پہ ذی جُود رہا کون سا ہو سایہ فگن

آبیاریِ توجہ رہی کس کی اس پر لُطفِ شاہانہ سے کس کے یہ بنا ہو گلشن

کس کے ارشاد سے اس باغ کی اصلاح ہوئی کون فردوس مکان تھا ہے یہ جس کا مسکن

راجہ اندر وُہ مہاراجہ راجندر سنگھ جی - سی - ایس - آئی جگر گوشۂ عظمیٰ برٹن

وہ سپاہی منش و شاہ صفت بندہ نواز دُھوم پٹیالے سے تھی جس کی مچی تا لندن

جس گلستاں کو نصیب ایسا چمن آرا ہو کیوں نہ ہر طرح سے کہلاتے وُہ یکتائے زمن

اس کے اک قصر پہ سو قصرِ خورنق قرباں اس کے ہر پھول پہ ہوں لاکھ فدا باغِ عدن

سیّد علمدار حسین (نوڈی)

تلاشِ محبّت

(ایک بتی کے بچے کو دیکھ کر)

اس قدر بیچین کیوں پھرتی ہو اے ننھی سی جاں شور سے سر پہ اُٹھا رکھا ہے کیوں سارا مکاں

دُودھ پی لے بھوک نے تجھ کو ستایا ہے اگر
وُہ دھرا ہے دودھ چھوٹی سی پیالی میں اُدھر

دُودھ بھی پیتی نہیں تُو ؟ خیر لے تیرے لئے
گوشت تھوڑا سا منگا رکھا ہے یہ بازار سے

گوشت کو بھی تو نہیں چھوتی ؟ تو کوئی کیا کرے
ہاں ! ستایا ہے کہیں سردی کی شدت نے تجھے

آ رضائی میں تجھے اپنی بٹھا لیتا ہُوں میں
آ تجھے سردی کے حملے سے بچا لیتا ہوں میں

پر یہاں بھی بیٹھ کر تجھ کو کہاں آرام ہے ؟
تلملانے سے تڑپنے سے یہاں بھی کام ہے

بیٹھ کر گھٹنے پہ غُرغُر کرنے لگتی ہے کبھی
سر کو میرے پاؤں پر تو دھرنے لگتی ہے کبھی

پیار کرتا ہُوں تو اُس پر بھی نہیں تجھ کو قرار
ناشکیبائی ہے تیری حرکتوں سے آشکار

کس قدر اُلفت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری !
ہائے کیا حسرت ٹپکتی ہے نگاہوں سے تری !

ہائے اے نادان ! اب سمجھا میں تیرا مُدعا
تو تلاشِ مہر و اُلفت میں ہے آتش زیر پا

ڈھونڈھتی پھرتی ہے ہاں وُہ گوہرِ نایاب تو
جس کی ہر انساں کو ہم جنسوں میں ناحق جستجو

تجھ کو لَو جس چیز کی ہے ابنِ آدم میں نہیں
بلکہ سچ پُوچھے تو موجوداتِ عالم میں نہیں

آئے گا تیری سمجھ میں کس طرح یہ فلسفہ
ذوقِ راحت ہے تو پیدا کر دلِ بے مُدعا

ہے تمنائے محبت ایک نخلِ بے ثمر
آرزوئے مہر و اُلفت ایک شامِ بے سحر

بلبلِ شیدا ہوائے گُل میں صرفِ نالہ ہے
داغِ مہرِ گل سے دِل اُس کا برنگِ لالہ ہے

ہے دلِ بلبل میں گُل کی سرد مہری کی جلن
کیا خبر اُس کو کہ گُل کے دل میں ہے کس کی لگن

کس کی فرقت میں گُلِ تر اس قدر غمناک ہے
چشم پُرنم ہے جگر خُوں ہے گریباں چاک ہے

چاند پر ناحق فنا کرتا ہے جان اپنی چکور
چاند کب سُنتا ہے اس مہجور کے نالوں کا شور

مُسکراہٹ چاند کی ہے اس کے نالوں کا جواب
اُس طرف آنا سکوں اور اِس طرف یہ اضطراب !

آتشِ اُلفت ہی برقِ خرمنِ پروانہ ہے
یہ پتنگا بھی ادائے شمع کا دیوانہ ہے

گرد پھر پھر کر طوافِ کعبۂ اُلفت کرے !
جان دے اور آتشِ ذوقِ فنا میں جل مرے !

شمع کو لیکن نہیں اس کی محبت کی خبر
وُہ ذرا اس پر نہیں کرتی عنایت کی نظر

کونسی دُھن میں ہے خدا جانے وُہ آتش بجاں　　　کس لئے ہیں گرم آنسو اس کی آنکھوں سے رواں
جب محبت کا یہ عالم ہے تو کیا اس کی تلاش؟　　　کیا تمنا ہیں کہاں کی آرزو کس کی تلاش؟

عاشق از بے مہریِ یارِ جفا جو شکوہ سنج
یار در فکرِ ہوائے دیگرے پامالِ رنج

نیرنگ

مُرغ و صیّاد

اے نسیمِ صبح! اے گہوارہ جنبانِ چمن　　　ہو اگر تیرا گذر سوئے جوانانِ چمن
اُن سے کہنا میری جانب سے بصد اظہارِ شوق　　　ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں، جو یارانِ چمن
اک گرفتارِ قفس نے ہے کہا تم کو سلام　　　اور پوچھا ہے مزاجِ سرو و ریحانِ چمن
پھر یہ دینا میری جانب سے نویدِ جانفزا　　　سیرِ گلشن ہو مبارک تم کو مرغانِ چمن
خاک اُڑا کر پہلے چپ ہو جائیو بادِ صبا　　　حال پوچھیں کچھ جو میرا ہمصفیرانِ چمن
پھر یہ کہنا کھینچکر سینے سے آہِ جاں گداز　　　ہے قفس میں قید وُہ مرغِ خوش الحانِ چمن
اب نہ سیرِ لالہ و گل ہے نہ وُہ گلگشتِ باغ　　　حسرتِ پرواز ہے اب اور ارمانِ چمن
اب نہ وُہ پھولوں کا تختہ ہے نہ کُنجِ خوشگوار　　　وُہ نہالانِ چمن ہیں اب نہ میدانِ چمن
تنکے چنتا ہے پڑا کُنجِ قفس میں اب غریب　　　آشیاں کیسا! کہاں کی فکرِ سامانِ چمن

توڑتا ہے خانۂ صیاد میں دم ہائے ہائے
ہو رہا ہے بلبلِ تصویر ماتم ہائے ہائے

چھیڑتی ہے کیا قفس میں ہم کو اے موجِ نسیم　　　اس چمن میں ہم بھی تھے پروردۂ نازِ قدیم

تھی ہماری بھی کبھی سرسبز کشتِ آرزو
ہم پہ بھی اے ابرِ رحمت! تھا ترا لطفِ عمیم

لوٹتے تھے آہ دن کو سبزہ زاروں کے مزے
شب کو رہتے تھے تر و شاداب کنجوں میں مقیم

یا چہکتے پھرتے تھے باغوں میں ہم اے ہمصفیر
یا قفس میں چیختے ہیں آہ بے یار و ندیم

ہم کہاں کے خوشنوا تھے ہم کہاں کے بذلہ سنج
ہم پہ اے صیاد ٹوٹا جو ترا قہرِ عظیم

ہمصفیرانِ چمن سے کیا تغافل کا گلہ
جب قفس میں پھنس گئے کیسی رہ و رسمِ قدیم

ذبح اے صیاد کر بھی چک کر جھگڑا پاک ہو
ہم سے اب دیکھا نہیں جاتا ہے یہ حالِ سقیم

پھونکدے اے سوزِ غمہائے نہانی! پھونکدے
بجھنے او ظالم! بھڑک اٹھ! شعلۂ نارِ جحیم

ہم ہیں پابندِ قفس۔ کیسا چمن کیسی بہار
کس کو مژدہ دینے آئی ہے تو اے بادِ نسیم

دیدِ گل سے واسطہ کیا ہم اسیروں کے لئے
سیرِ گلشن ہو مبارک ہمصفیروں کے لئے

لالہ و گل کی تھی قسمت میں فضا دو چار دن
ہم نے کھالی سبزہ زاروں کی ہوا دو چار دن

پھر سنیگا ہائے کس کے زمزمے صیاد تو
ہم قفس میں اور ہیں نغمہ سرا دو چار دن

حسرتِ پرواز بھی جاتی رہیگی اے اجل!
ہم سے اڑلیں اور مرغانِ ہوا دو چار دن

پھر کہاں صیاد ہم۔ اور پھر کہاں کنجِ قفس
آب و دانہ ہے مقدر میں ترا دو چار دن

گھٹ کے اس زنداں میں جائیگا کبھی تو دم نکل
مانگتے ہیں اے اجل! تیری دعا دو چار دن

یاد اے صیاد! ہم کو بھی کرے گا تو کبھی
اور تڑپا لے قفس میں بیوفا دو چار دن

دیکھ کر خالی قفس کو جی بھر آئیگا ترا
پیٹ کر روئیگا سر۔ بعدِ فنا دو چار دن

کر رہے ہیں جس طرح ہم نالہائے دردناک
تو رہیگا یونہی مصروفِ بکا دو چار دن

یاد جب صیاد آئینگے ہمارے زمزمے
گھر میں تنہا ترا جی گھبرائیگا دو چار دن

دستِ حسرت مل کے اے صیاد! پچھتائیگا تو
ایسا لائیگا کہاں سے آہ مرغِ خوش گلو

جب بنائیگا ہمارا آہ! چھوٹا سا مزار
چُپکے چُپکے تو ہمارے غم میں ہوگا اشکبار

یاد رہ رہ کر جفائیں اپنی آئینگی تجھے
اور ہماری بیکسی پر روئے گا تو زار زار

لے کے خالی گھر کو جب گلشن سے اُڑیگا قفس
پیچھے پیچھے خاک اُڑاتی آئے گی بادِ بہار

سُنکے اَی صیّاد! تیرے نالہائے جانگداز
راستے میں لوگ پُوچھینگے کہ کیوں ہے سوگوار

تو کہیگا مرگئی وُہ بلبلِ رنگیں نوا
وصلِ گل کے واسطے تھی جو قفس میں بیقرار

گل کھلینگے سبزہ نورس اُگیگا قبر پر
ہم نہ ہونگے اور آئیگی گلستاں میں بہار

سڑتے ہونگے تیرے گہوارے میں اَے کُنجِ لحد
خوابِ راحت میں مخل ہوگی نہ گلبانگِ ہزار

اپنی مٹی ہیر کہاں کی کیا خبر۔ بادِ صبا!
ہو پریشاں دیکھئے کس کس جگہ مُشتِ غبار

وُہ بھی آزادی کے دن تھے ہائے کتنے جانفزا
تیرے بندھن سے تھے جب اَے قیدِ ہستی رستگار

لوٹتے تھے اپنے گلشن میں بہاروں کے مزے
سبزہ زاروں کی تھیں سیریں۔ جوئباروں کے مزے

ہم بھی تھے طائرانِ قدس تھے ہم بھی صبا!
قیدِ ہستی کی کشاکش میں نہ تھے یُوں مبتلا

بولتے تھے اپنی دُھن میں پیاری پیاری بولیاں
ہائے وُہ دن! شاخِ طُوبیٰ پر تھے جب نغمہ سرا

لوٹتے تھے ہم بہاریں گلشنِ فردوس کی
تھی عجب دلکش ہمارے سبزہ زاروں کی فضا

کِھل رہے تھے چارسو پُھولوں کے کُنج خوشگوار
تھیں رواں شیر و عسل کی اُن میں نہریں جابجا

اپنے پُھولوں پر تو اتراتی ہے کیا اَی عندلیب!
تُونے دیکھی ہی نہیں ہے شاہدِ گُل کی ادا

کرکے ہم کو تو اسیرِ حلقۂ دامِ فریب
کھینچکر کس وادیٔ پُرخار میں لائی قضا

ہم نہ پھنستے کس طرح صیّاد تیرے جال میں
آب و دانہ تھا مقدّر میں ترے گھر کا لکھا

ہم قفس میں کب تلک بے بال و پر تڑپا کریں
ٹوٹ بھی جا! اَے طلسمِ قیدِ ہستی ٹوٹ جا!

تیرے مُرغِ دست پرور ہم ہیں صیّادِ ازل!
خواہ ہم کو ذبح کر تو۔ خواہ ہم کو کر رہا

من آں مُرغم کہ نالم از جفائے تیغِ تو
ذبح کُن صیّاد ۔ قُربانِ ادائے تیغِ تو

(سرُور جہان آبادی)

مُرغانِ قفس

تضمین

جو تجھ پہ بیتے تو تُو جانے مُرغِ بُستانی ۔۔۔ قفس میں کیسے تڑپتے ہیں آہ زندانی
تپش فزا ہے قیامت کا دردِ پنہانی ۔۔۔ تُو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی

تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

اسیرِ دام نہ ہو کوئی مُرغِ بُستانی ۔۔۔ خُدا کسی کو نہ دے حسرتِ پرافشانی
سمجھتا ہے مرے نالوں کو زمزمہ خوانی ۔۔۔ تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی

تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

ہنسی نہ مجھ سے کرا دعویِ زمزمہ خوانی ۔۔۔ ہو کُنگرے پہ مُبارک تجھے خوش الحانی
خدا وہ دن نہ دکھائے کہ تو ہو زندانی ۔۔۔ تو اے کبوترِ بامِ حرم چہ میدانی

تپیدنِ دلِ مُرغانِ رشتہ برپارا

سرُور جہان آبادی

تازہ غزلیں

عید اور انتظارِ یار

کہتے ہیں عید ہے آج - اپنی بھی عید ہوتی
ہم کو اگر میسّر جاناں کی دید ہوتی

قیمت میں دیدِ رُخ کی ہم نقدِ جاں لگاتے
بازارِ ناز لگتا دل کی خرید ہوتی

کچھ اپنی بات کہتے کچھ میرا حال سُنتے
ناز و نیاز کی یُوں گفت و شنید ہوتی

جلوے دکھاتے جاتے وُہ طرزِ دلبری کے
اور دل میں یاں ہوائے نازِ مزید ہوتی

تیغِ نظر سے دل پہ وہ وار کرتے جاتے
اور لب پہ یاں صدائے ھَل مِن مزید ہوتی

ابرو سے اُن کے غمزہ تیرِ ادا لگاتا
یہ دل قتیل ہوتا یہ جاں شہید ہوتی

کچھ حوصلہ بڑھاتا اندازِ لُطفِ جاناں
کچھ دغدغہ سا ہوتا - کچھ کچھ امید ہوتی

لیکن یہاں تو حرماں ہے ثمرہ تمنّا
کیُوں قفل آرزو کی پیدا کلید ہوتی؟

آنکھیں ترس رہی ہوں جب اُسکی اک جھلک کو
نیرنگِ منتظر کی کیا خاک عید ہوتی!

(نیرنگ)

سختیاں کرتا ہُوں دل پہ غیر سے غافل ہُوں میں
ہائے کیا اچھی کہی ظالم ہُوں میں جاہل ہُوں میں

مَیں جبھی تک تھا کہ تیری جلوہ پیرائی نہ تھی
جو نمودِ حق سے مٹ جاتا ہے وہ باطل ہوں میں

اے تماشائی! مری ہستی کا نظارہ تو دیکھ
اسفلِ عالی نظر ہُوں ناقصِ کامل ہوں میں

علم کے دریا سے نکلے غوطہ زن گوہر بدست
وائے محرومی! صدف چینِ لبِ ساحل ہُوں میں

تم نے تاکا دل کو لیکن اُف رے شوقِ تیرِ عشق
دل سے کہتا ہے جگر، تو دل نہیں ہے دل ہوں میں

ہے سری ذلت ہی کچھ میری شرافت کی دلیل
جسکی غفلت کو ملک روتے ہیں وہ غافل ہوں میں

تجھ میں پوشیدہ ہو لیلےٰ اور ہی لیلے اگر کوئی
کہہ رہا ہے دل ترا لیلےٰ نہیں محمل ہوں میں

کشتِ آزادی کی بجلی تھی سری تقلید ہی
پھونک ڈالی اپنی کھیتی آہ ! کیا غافل ہوں میں

میں وہی ہوں کھو گیا تھا جس کا دل صبحِ الست
اب نہ پہچانو تو تم جانو وہی بسمل ہوں میں

ہے محبت اے برق تجھ کو میرے حاصل کی تلاش
مجھ پہ آکے گر کہ اپنا آپ ہی حاصل ہوں میں

بزمِ ہستی ! اپنی آرایش پہ تو نازاں نہ ہو
تو تو اک تصویر ہے محفل کی اور محفل ہوں میں

تخم ریزی جسکی ہنگامِ صدائے کن ہوئی
اس پرانی مزرعۂ زرخیز کا حاصل ہوں میں

جانتا ہوں جلوہ بے پردہ ہے کاشانہ سوز
سادگی دیکھو کہ پھر دیدار کا سائل ہوں میں

ڈھونڈتا پھرتا ہوں اے اقبال اپنے آپ کو
آپ ہی گویا مسافر آپ ہی منزل ہوں میں

(اقبال)

جہاں سے جاتے ہیں اب جی کے ہارنے والے
کدھر چلے مرے گیسو سنوارنے والے

پلٹ کے دیکھ تو لیتا دیا تھا گر نہ جواب
حیا سے گڑ گئے تجھ کو پکارنے والے

کچھ ایک سے نہیں عشاق ہر طرح کے ہیں
سمجھ کے تیکھی نگاہوں سے مارنے والے

ہوا نہ ضبط سے بھی کوئی کام وا اسفا
پڑے ہیں خاک بسر جی کو مارنے والے

نہ خم نہ جام نہ میخوار بزم ہے سنسان
غرض سدھار گئے سب بہارنے والے

کچھ ایک گل نہیں تری گلی میں اے فیاض
ابھی بہت سے ہیں دامن پسارنے والے

کچھ اس طرح سے ستائے گئے گلی میں تری
پلٹ کے آئے نہ پھر جی کو مارنے والے

سمجھ کے تیری گنہگار دیدۂ غیر کے ہیں
حیا بھی ہار گئے دل کے ہارنے والے

بس اب جو لب ہلیگا یہی رہی اُمید   پکارتے رہے تجھ کو پکارنے والے
ندامی جیسی بھی شیشے کے واسطے ہو پہاڑ   سنبھل کے طاق سے مینا اُتارنے والے

بس اب ہو خیر ہی خیر اُن کے حُسن کی اے شادؔ
بلائیں لے کے چلے جان وارنے والے

(شاد)

ستائے خنجرِ قاتل نہ آرزو رہ جائے   میرے لہو کی قسم ہے جو آج تو رہ جائے
چھپی ہوئی ہے گلِ تر میں رُوحِ بلبل کی   عجب نہیں ہے کہ مانندِ رنگ بُو ہو جائے
وُہ مستِ ناز جو آجائے میکدے کی طرف   خموش شیشے ہوں اور دم بخود سبُو رہ جائے
کدھر سے اُنکا گذر ہو خدا کو ہے معلوم   اُڑانا خاک ہماری کہ چار سُو رہ جائے
نہ ہوگی بعد مرے اُن کو قدرِ آرائش   کروں سلام جو آئینہ رُوبرو رہ جائے
ترے ہی دم سے ہے سب کائنات دُنیا کی   بلا سے ہم نہ رہیں اس جہاں میں تو رہ جائے
بساطِ عیش اُلٹنے کی تاک میں ہے فلک   کسے یقیں ہے یہ محفل رہے سبو رہ جائے
مجھے بھی آج وہ مقتل میں سرفراز کریں   خدا کرے کہ شہیدوں میں آبرو رہ جائے
اگر یہ جذبِ شہادت نہیں تو پھر کیا ہے   وُہ دھوئیں خوب سا دامن کو اور لہو رہ جائے
خدا نہ شامِ مصیبت کی صبح دکھلائے   اُٹھالے پردہ شب میں تو آبرو رہ جائے
وُہ اپنی تیغ زنی پر کمال نازاں ہیں   عجب مزا ہو جو ثابت رگِ گلو رہ جائے

سرشکِ غم سے تلاطم میں دل ہے اے سجادؔ
جو غرق ہو یہ سفینہ تو آبرو رہ جائے

سجاد (دہلوی عظیم آبادی)





مخزن

نیشن اور ہمزبانی

مندرجۂ ذیل مضمون ایک اہم معاملے کے متعلق ہے۔ جو سب ابنائے وطن کی کامل توجہ کا محتاج ہے اور ہمارے ایک قابل دوست شیخ حبیب احمد صاحب کے قلم سے نکلا ہے۔ جو ایک عرصے سے یورپ میں مقیم ہیں اور جو اثر انگلستان میں لوگوں کی ہمزبانی اور لباس میں یکرنگی سے پیدا ہوا ہے۔ اس سے بخوبی واقف ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے انہیں ہندوستان کی اخباری دنیا سے گہرا تعلق تھا۔ ایک زمانہ ہوا میرٹھ سے ایک اخبار پولیس نیوز نکلتا تھا جس نے محکمہ پولیس میں بہت اعتبار پیدا کیا تھا وہ شیخ صاحب موصوف ہی کا تھا اور اس کے بعد دہلی میں روزانہ اخبار انہی کے ہاتھ میں رہا۔ ایک عرصے سے شیخ صاحب کو اردو میں مضمون نگاری کا اتفاق نہیں ہوا کیونکہ وہ انگریزی میں ایک ایسے علم کے متعلق تصنیف کے کام میں مشغول ہیں۔ جس سے یورپ آج تک بیخبر ہے اور جس کا مشرقی دنیا میں بھی اب دھندلا سا سراغ ملتا ہے۔ مگر ہمارے اصرار سے انہوں نے مخزن کے لئے یہ مضمون لکھنے کی تکلیف گوارا فرمائی :-

علم اور تہذیب کی ترقی جب کسی ملک میں ایک خاص درجے تک پہنچ جاتی ہے وہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں اُن آرزوؤں کا پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے جو چند سال سے ہندوستان میں اپنے ظہور کا اعلان ہر طور اور ترکیب سے کر رہی ہیں اور جن کا پورا ہونا بلاشبہ اُس ملک کے لئے دلیل سعادت ہے۔ مگر ان کا حصول ایک یا دس یا سو آدمیوں کی قوت یا حکمت پر منحصر نہیں۔

خواہ وُہ کیسے ہی لائق اور قابل اور با اثر اور اُنکی کارروائیاں کیسی ہی باقاعدہ اور باترتیب ہوں - نہ ایک دو جماعتیں ہی کچھ کرسکتی ہیں اور نہ لاکھ دو لاکھ روپے سے کام نکل سکتا ہے - دُوسرے ملک والوں کی تائید سے بھی مطلب براری نہیں ہوتی - خواہ وُہ کیسے ہی با اقتدار ہوں - حتّٰی کہ قوم فرماں رواکے افراد -

ان مہتم بالشان مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اُس اتحادِ عام اور اتفاقِ کامل کی حاجت ہے جسکی تعریف کے لئے ایک عام فہم لفظ نیشن (قوم) کافی ہے - اوّل اس کے پیدا ہونے کی ضرورت ہے - اس امر کی تفصیل کی یہاں کوئی حاجت نہیں کہ ایک ملک کے رہنے والوں کا ایک بن جانا کن امُور میں متحد اور متفق ہونے پر مبنی ہے - ہر ایک شخص اِس سے کم و بیش واقف ہے - لیکن ان امُور میں اتفاق اور اتحاد پیدا نہیں ہوسکتا جب تک بعض لوگوں کے قلب میں ایسی حرارت اور حرکت پیدا نہ ہوجائے جیسی کسی عاشقِ صادق کے دِل میں ظاہر ہو کر اس کو سوائے اپنے معشوق کے ہر ایک شے سے مستغنیِ مطلق اور بے پروائے محض بنا دیتی ہے - صرف ایک ہی تصویر سامنے رہجاتی ہے - دوسری سب چیزیں اسی ایک ہستی میں غائب ہوجاتی ہیں - وُہ اسی ایک کی ذات میں محو و مستغرق ہوجاتا ہے - یہی برگزیدہ افراد ہیں - جن کو مبدء فیاض سے وُہ مادّہ کامل عطا ہوتا ہے اور جس کی ذات میں وُہ صفات ودیعت کی جاتی ہیں جو اُن کے دُوسرے ہمعصروں میں نہ پائی جائیں یا اُن سے کم ہوں - انہیں کو سردارانِ قوم کہتے ہیں اور یہی قوم کے سچّے عاشق کہلاتے ہیں - یہی گروہ نامدار ہے جسکی رائے کو تمام مُلک اپنا ہدایت نامہ بنا لیتا ہے اور ان کی پیروی جان و دل سے اختیار کرلیتا ہے - جب یہ کیفیت پیدا ہوجائے تو یقین کرلینا چاہئے کہ اس ملک کی تقدیر جاگنے کا زمانہ قریب آگیا ہے - اور اس کی پُوری ترقّی کے سامان مہیا ہو رہے ہیں - ہندوستان کی اسوقت ایسی ہی حالت ہے - علم و تہذیب میں روز افزوں ترقّی ہو رہی ہے اور ایک عرصے سے وُہ مبارک جماعتیں اور افراد جو واقعی قوم کے جان نثار ہوا کرتے ہیں پیدا ہوگئے ہیں اور شب و روز مُلک کی بہبُودی کی فکر ہر طرح سے اپنی اپنی بساط کے موافق کر رہے ہیں - مگر افسوس کی

بات ہے کہ ان میں باہم وُہ اتفاق و اتحاد ابھی تک پیدا نہیں ہُوا - جس کو قوم کی رُوح کہ سکیں تاہم اس میں اُن کی بھی چنداں خطا نہیں - کچھ ایسے واقعات سدِ راہ ہو رہے ہیں جن کا رفع کرنا بڑا مشکل کام ہے - وُہی امور جن میں اتحاد ہونا چاہیے تھا اختلاف پیدا کر رہے ہیں - یعنی اختلافِ مذہب و زبان - حالانکہ اغراض عموماً مشترک ہیں -

مذہب بڑی چیز ہے اور اس سے زیادہ کوئی شے اہلِ ہند کو عزیز نہیں ہو سکتی - اس کی نسبت تو گفتگو کرنا ہی محض فعلِ عبث اور تضیعِ اوقات ہو - اس کا فیصلہ تو اس سے بہتر اَور کوئی نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک دُوسرے کے عقائد کی عزّت کریں اور کسی طرح ایک دُوسرے کے مذہبی خیالات کو قولاً یا فعلاً ہرگز ہرگز کوئی صدمہ نہ پہنچائیں بلکہ ادائے رسومِ مذہبی میں ایک دُوسرے کو ہر طرح مدد دیا کریں اور جہاں تک ہو سکے کوئی دقتیں یا پیچیدگیاں پیدا نہ ہونے دیں - نہ کسی کی دِل آزاری ہو نہ دِل آزردگی - مگر دُوسری شَے - جو اتفاق و اتحاد کا جزوِ اعظم ہے وُہ زبان کا ایک ہونا ہے - اِس کے ذریعے سے ہم اپنے خیالات ایک دُوسرے پر اچھی طرح ظاہر کر سکتے ہیں - اسی سے ہمدردی پیدا ہو سکتی ہو جو کسی وقت قومی اغراض و مقاصد کی تکمیل میں جان و رُوح کا کام دیگی متفق ہو کر جو کام نکل سکتا ہو اس کی قدر سب کو معلوم ہے -

اِس وقت ہندوستان میں بہت سی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں - پنجابی کی بات مدراسی نہیں سمجھ سکتا - بنگالی گفتگو کرے تو گجراتی مُنہ تکتا ہے - میانِ دوآب کا رہنے والا مرہٹی کا ایک لفظ نہیں جانتا - پھر بتایئے کہ اِن کے خیالات ایک دُوسرے کو کیونکر متاثر کر سکتے ہیں - ایک کے دِل کی بات دُوسرا کیونکر جان سکتا ہے - ہم زبان نہ ہونے کی وجہ سے باہم وہ میل جول نہیں ہو سکتا جو عاقبتاً قوم کے متفرق اجزا کو جمع کر دیتا ہے - پس ہم کو سب سے پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ کل ملک کے لئے ایک قومی زبان اختیار کریں - ہندوستان کی کل مروجہ زبانوں میں سے ایک کو یہ عزّت دیں کہ جس پر کثرتِ رائے متفق ہو جائے - اسی کو قومی زبان مان لیں - اس سے یہ لازم نہ آئیگا کہ ہم اپنے گھروں میں بھی وُہی زبان بولا کریں - ممالک برطانیہ اعظم میں آئرلینڈ والے کی اندرونی زبان

سکاٹ لینڈ کے باشندوں سے بالکل مختلف۔ ویلز والوں کے الفاظ اور محاورات انگریزی آئرش اور سکاچ سب سے علیحدہ۔ مگر قومی زبان سب کی ایک ہی یعنے انگریزی۔ اسی میں لکھتے پڑھتے ہیں۔ اسی میں علوم حاصل کرتے ہیں۔ یہی دفاتر کے کام میں آتی ہے۔ سرکاری ہوں یا تجارتی اختلاف مذاہب ان ملکوں میں بھی ویسا ہی ہے جیسا کہ ہندوستان میں ہے مگر زبان کے معاملے میں نہ کوئی تکرار ہے نہ فساد۔ قومی معاملات میں مذہب کا مطلق امتیاز نہیں۔ وہ معاملہ ہی دوسرا ہے قومی فوائد اور برکتوں سے ہر ایک یکساں مستفید و متمتع ہوتا ہے کیا آئرش اور کیا انگریز۔ کیا سکاٹ لینڈ کا رہنے والا کیا ویلز کا باشندہ۔ ہندوستان کے لئے بھی اسی طرح ایک عام قومی زبان قرار دے لی جائے اور اسی کے لحاظ سے ایک رسم خط بھی مقرر کر دیا جائے۔ اس کے قبول کرنے سے کسی کو کوئی مذہبی نقصان نہیں پہنچتا اور ایک بڑا مرحلہ طے ہو جاتا ہے۔ ہم یہاں کسی خاص مروجہ زبان یا رسم خط کی خصوصیت کرنا نہیں چاہتے۔ اس کو کثرت رائے سے طے کرانا چاہئے۔ ہندوستان میں دو ہی بڑے مذہب ہیں باقی انہیں کی شاخیں ہیں۔ عیسائی یا دیگر مذاہب کے پیروؤں کی تعداد بلحاظ قوم ہونے کے بہت ہی کم ہے اور وہ ایسے ہیں کہ ان کے عقائد پر کسی خاص زبان یا لغات کا کوئی اثر نہیں۔ جو کچھ دو بڑے گروہ یعنے ہندو و مسلمان مل کر باہم طے کرلینگے اُن کو کوئی عذر نہ ہوگا۔ تاہم ان کی رائے کو بھی شریک کرلینا چاہئے۔ اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ انگریزوں میں باوجود اختلاف مذاہب کے (عیسائی اور اُن کے بیشمار فرقے۔ یہودی۔ لامذہب دہریئے۔ یونی ٹیرین یعنی موحدین وغیرہ) زبان کی نسبت کوئی جھگڑا نہیں کرتے۔ عبادت کے لئے عیسائی بالعموم انگریزی زبان سے کام لیتے ہیں مگر رومن کیتھلک فرقے میں اس غرض کے لئے لاطینی مروج ہے اور یہودیوں میں عبرانی۔ مگر ملکی اور قومی اغراض کے لئے صرف ایک زبان ہے یعنی انگریزی اور اس ملک کے رہنے والے اس پر بلا لحاظ ملت و مذہب فخر کرتے ہیں۔ کبھی ان کو خیال تک بھی نہیں آتا کہ جو زبان گرجے میں بولی جاتی ہے وہی شراب خانوں اور رذیل ترین مقامات میں استعمال ہوتی ہے۔ اسی میں قانون کی کتابیں اور کلام الٰہی کی تفسیرات لکھی جاتی ہیں۔ اسی میں

مخالفین مذاہب کی حقیقت کے خلاف بحث اور اُن کی تردید میں کتابیں اور رسالے شائع کردئیے

غرضکہ ہم کوئی وجہ نہیں دیکھتے کہ ہندوستان میں ایک قومی زبان کل ملک کے مقرر کرلینے میں کسی کو کیوں عذر ہونا چاہئیے۔ کوئی نئی زبان اختراع کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت جو زبانیں رائج ہیں اُن میں سے ایک پر ہم کو متفق ہونا چاہئیے۔ وہ اگر کسی قدر ناکافی سمجھی جائے تو اس میں دُوسری زبانوں سے مدد لے سکتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ناقص ہونے کا عیب بھی نکل جائیگا۔ مگر ہم کو اس کے لئے آج ہی سے کوشش شروع کردینی چاہئیے۔ تکمیل جب کبھی ہو۔ دُنیا میں یہی قاعدہ چلا آیا ہے۔

انگریزی جو ہمارے فرماں روائے قوم کی زبان ہو وہ کل ملک کی زبان تو دو سو برس میں بھی نہیں ہوسکتی مگر اس کے اثر سے بھی نہیں بچ سکتے اور نہ بچنے کی کوئی ضرورت ہو۔ اس کے الفاظ کی آمیزش ہماری زبان میں اب بھی ہوگئی ہے اور آئندہ بھی ہوتی رہیگی مگر بے ضرورت لفظوں کے لینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اس کی احتیاط کرنی چاہئیے۔ جن الفاظ کے بغیر ہم اپنا مطلب ادا نہ کرسکیں یا جو زیادہ معنی خیز ہوں انکو شوق سے قبول کرلیں۔

زبان کے ایک ہونے کی ضرورت کے تسلیم کرنے میں تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو مگر اس میں ضرور بحث ہوگی کہ کونسی زبان پر متفق ہونا چاہئیے۔ اس مسئلہ پر غور کرنے کے وقت شاید یہ باتیں خیال کے قابل ہوں (اوّل) کونسی زبان ایسی ہو جو آسانی سے ہندوستان کے سب حصوں میں پھیل سکتی ہو۔ کون سی زبان ہو جس میں ہر ایک حصہ ملک کا حصہ شامل کرلیا جائے تو اُس کی خوبی اور عام فہم ہونے میں فرق نہ آئے۔ ثقیل اور اجنبی بھی معلوم نہ ہو۔ جہاں تک ہوسکے سہل ہو اور اس کے لکھنے پڑھنے میں بھی ایسی ہی سہولت باقی رہے جیسی کہ اُس کے بولنے میں ہو۔ ابھی تک ہندوستان کی مروجہ زبانوں کا دائرہ بہت ہی تنگ ہو۔ جہاں ذرا سی آمیزش کسی دُوسرے حصہ ملک کی زبان کی ہوئی کہ اُسکو وہ لوگ جو اپنے زعم میں اہل زبان ہیں فوراً مخلوط اور خلافِ محاورہ بتانے لگتے ہیں۔ کہدیتے ہیں کہ یہ خالص نہیں۔ اس کے معنے گویا یہ

ہیں کہ ہم اپنی زبان کو محدود رکھیں - اس کو بڑھانا یا ترقی دینا گناہ ہی - مگر عاقبت اندیش اور ملک کی اصلاح اور فلاح چاہنے والے ان باتوں پر مطلق توجہ نہیں کیا کرتے - ہم کو اپنے محبوب کی آرائش و آسائش کے سامان جمع کرنے میں متفق ہونا چاہئے - یہی وہ محبت ہی جس میں رشک و رقابت کا پتہ نہیں - یہی وہ معشوق ہی جس کے حضور میں حریف شیر و شکر بن جاتے ہیں - جتنا کوئی اس کو پیار کرے اتنی ہی آپس میں محبت بڑھتی جاتی ہی بخلاف شخصی عشق و محبت کے جس میں حریف سے بڑھ کر دنیا میں کوئی دشمن ہی نہیں - غرض تو دونوں میں ہی مگر ایک کی غرض اپنی ذات تک محدود ہی - دوسرا قوم کے کل مجموعہ پر مفتون ہی - اور چاہتا ہے کہ ہر کوئی یکساں منتفع اور متمتع ہو - قومی فائدوں کے سامنے ذاتی منفعتیں معدوم ہو جاتی ہیں اور چھوٹے چھوٹے اختلافات اور ذاتی خواہشوں کو اس محبوب کے واسطے نثار کر دینا پڑتا ہے - زبان کے ایک بنانے اور اس کی اصلاحیں کرنے میں تو شاید بہت سی تکلیفیں برداشت کرنے کی نوبت بھی نہ آئے اور آئے بھی تو اُن بے انتہا فواید کے مقابلے میں جو ایک ملک کے رہنے والوں کو ایک قوم بن جانے سے حاصل ہوتے ہیں ان کی حقیقت ہی کیا ہی - ہمت شرط ہی - آنکھ کھول کر دیکھ لیجئے کہ ہمزبان ہونے کا اثر پچھلی قوموں پر کیا ہوا ہی اور آج کیا ہو رہا ہے - اس معاملے میں جہاں تک غور و فکر کیا جاتا ہے سوائے اس کے اور نتیجہ نہیں نکلتا کہ ہمزبانی ہمقوم ہونے کی ترکیب میں جزوِ اعظم ہے +

حبیب احمد (از لنڈن)

ڈالی

(سلسلے کے لئے دسمبر ۱۹۰۷ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

ڈالی کے نام اور نباس میں تبدیلی کی ایک دو اَور باعث بھی ہوئے۔ شروع میں طاقتِ مُلکی ایک بادشاہ کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ جس کو تحفہ تحائف دیئے جاتے تھے۔ لیکن طاقتِ مُلکی کے وسیع ہو جانے پر جب یہ ناممکن ہو گیا کہ ایک واحد شخص جملہ طاقت کا اِستعمال خود کرے۔ تو اس بات کی ضرورت محسُوس ہُوئی کہ ماتحتوں میں سے بعض سرکردہ اشخاص کو منتخب کر کے مختلف اختیارات و فرائضِ منصبی اُن کے تفویض کئے جائیں۔ اِس دستور نے ماتحت افسروں کے اختیارات کا دائرہ وسیع کر دیا اور چونکہ کسی پر مہربانی کرنا یا کسی کو کوئی خاص رعایت دیدینا اُن کے اختیار میں آگیا۔ اسواسطے لوگوں کو مثل بادشاہ کے حکامِ ماتحت کی دلجوئی اور خاطرداری مطلوب ہُوئی۔ تحفہ تحائف علاوہ حاکمِ اعلیٰ کے حکامِ ادنیٰ کو دیئے جانے جاری ہُوئے۔ خصوصاً جبکہ شروع میں حکامِ ادنیٰ کی تنخواہ کارکردگی سرکار سے مقرر نہ تھی۔ اور ڈالی کے تحفہ تحائف ہی وسیلۂ آمدنی تھے۔ جب طاقتِ مُلکی ماتحتوں پر منقسم ہُوئی۔ اسوقت بادشاہ کی طرف سے معاوضۂ خدمات ادا کرنے کی رسم نہ تھی۔ یہ ایک مابعد کا قصہ اور پیچھے کا خیال ہے۔ شروع میں بلکہ ماتحت سے بادشاہ کچھ بطور باج یا خراج کے لیتے تھے نہ بجائے اس کے کہ شاہی خزانے سے کچھ اسکو دیویں۔ گورنر یا صوبہ کے حاکموں۔ یا ضلع داروں کے لئے اختیارات تفویض شدہ کا قبول کرنا باعثِ اعزاز و فخر سمجھا جاتا تھا۔ اور اظہارِ اطاعت کے ساتھ ہی وسیلہ آمدنی ذاتی تنخواہ کا کوئی ذکر نہ ہوتا تھا۔ برعکس اس کے ماتحت اِستعمال اختیارات عطا شدہ سے خود جو آمدنی پیدا کرتا تھا۔ اس کے ایک جُزو یا ایک رقم یعنی بطور خراج اعلیٰ حاکم کو دی جانی مقرر ہوتی تھی۔ اِس سے زیادہ جب خراج یا باج ایک فرض اور ذمہ داری ہو گئی۔ تو بادشاہ کی خصوصیت سے رضاجوئی کے لئے علاوہ مقررہ خراج کے بیش قیمت تحفہ تحائفِ ہر قسم مثلاً ہاتھی۔ گھوڑے۔ سونے چاندی کے برتن

زیور وغیرہ بطور اظہار مطابعت بھی جاری ہو گئے۔ لیکن بادشاہ کی طرف سے اگرچہ بعض اوقات بطور اظہار خوشنودی کچھ عطیہ دیا جاتا تھا۔ مگر وُہ تنخواہ یا معاوضہ کارکردگی نہ ہوتا تھا۔ مغلیہ بادشاہان کے وقت صوبہ بنگال و دیگر سرداران کی آجکل کے گورنر و لفٹنٹ گورنروں کی طرح تنخواہ ماہانہ یا سالانہ مقرر نہ تھی۔ حکام مقررہ شدہ کو آزادی تھی کہ اختیارات تفویض شدہ برتیں اور جن کے حق میں وُہ اختیارات استعمال ہوں۔ اُن سے آزادی کے ساتھ معاوضہ لیویں۔ دُوسرے الفاظ میں لُوٹ کھسوٹ کے ذریعے سے خواہ کچھ پیدا کریں۔ بادشاہ کو حصّہ آمدنی یعنی مقررہ خراج اور اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً خاص تحائف دیدیویں۔ اطاعت و وفاداری کا اظہار اس طریق سے کریں گو اندرونی معاملات میں پُورے طَور پر خود مختار ہیں۔

تمدن جب ترقی کرجاتا ہے تو یہ حالت تبدیل ہوجاتی ہے اور وُہ صُورت پیدا ہوجاتی ہے۔ جو یورپ و دیگر ترقی شدہ مہذب ممالک میں دیکھی جاتی ہے۔ اور جس کا پھل ہم کو بھی بوجہ برکات سلطنتِ انگریزی حاصل ہورہا ہے۔ یعنی جو حکام سرکاری طور پر ضرورتِ انتظامِ ملکی کی وجہ سے مقرر ہیں۔ ان کو سرکار خزانے سے معاوضہ اُن خدمات کا دیتی ہے۔ اور رعیّت سے صرف مقررہ ٹیکس وغیرہ لے لیتی ہے۔ حاکموں اور افسروں کے لئے نج کے طَور پر کوئی معاوضہ فرائضِ منصبی کے انجام دہی کا لینا۔ یا کچھ معاوضہ کسی قسم کا لیکر فرائضِ منصبی کی سرانجامی میں کسی کے ساتھ رعایت کرنا۔ رشوت کے نام سے موسوم ہوکر جُرم قرار دیا جاتا ہے۔ اور جو شخص اس قسم کا معاوضہ دیوے اسکو بھی شریکِ جُرم سمجھا جاتا ہے اس کے بعد اگر ڈالی رشوت کے طَور پر قائم رہے اور لوگ منفعتِ ذاتی کے اغراض سے خفیہ طَور پر نقدی یا مال حکّام کو دیں۔ یا افسر ذاتی لالچ اور بے ایمانی سے ناجائز معاوضہ خدماتِ منصبی کا لیں تو بادشاہ کا قصور نہیں بلکہ رعایا کا یعنے رعایا کے ایک حصّے کا جو رشوت دیتا ہے اور اس کے دوسرے حصّے کا جو رشوت دیتا ہے۔ رشوت کی حالت چُونکہ سلسلے میں تنخواہ سے پہلے۔ اور تنخواہ کے مقرر ہونے کے بعد بھی موجُود ہوتی ہے۔ اِس لئے بعض لوگ جو اِس ارتقا پر پُورا غور نہیں کرتے۔ وُہ تنخواہ کی حالت کے بعد رشوت کو موجود دیکھ کر۔ اور پیشتر کی حالت سے ناواقف ہونے کی وجہ سے۔ رشوت کو اعلیٰ حالت سے تنزل

کی حالت بیان کرنے لگ جاتے ہیں۔ حالانکہ امر واقع یہ ہے کہ یہ تمدن کی ایک ادنیٰ حالت کا خاصہ ہے جو اعلیٰ حالت میں بھی موجود ہی۔ یہ تنزل کی علامت نہیں ہی۔ بلکہ اس کا وجود اس بات کا ثبوت ہی کہ ترقی کی حالت میں پرانی ناقص حالت کے نشانات ابھی کلی طور پر معدوم نہیں ہوئے۔

آخر میں جب رشوت کا صریح طور پر لیا جانا۔ یا دیا جانا داخل جرائم ہو جاتا ہی۔ تو ڈالی کی شکل میں بڑی بھاری تبدیلی واقع ہوتی ہی۔ اس میں علاوہ اپنے ذاتی خلت کے جس سے محض حصول خوشنودی مطلوب ہوتا ہی۔ فرضی یا نمائشی طور پر افعال محبت کا خاصہ بھی مختلف ہوجاتا ہی۔ موجودہ ضرورت کا خیال تو چنداں نہیں ہوتا۔ ہاں آیندہ ضروریات کا خیال کر کے اور یہ دیکھ کر کہ فلاں شخص کے اختیار میں میری نسبت کچھ احکام صادر کرنا ہی۔ بطور اظہار دوستی اطاعت امید کے کچھ تحفہ دیا جاتا ہی مدعا ڈالی کے صاف طور پر دو ہوتے ہیں۔ ایک تو لینے والے کی طبیعت خوش کی جاتی ہی۔ اور اس میں ایک دوستانہ خیال جو آیندہ مفید پڑتا ہی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہی۔ دوسرا چونکہ اس فعل سے مقصود رضا جوئی ہوتا ہی اور ساتھ ہی اظہار مطابعت۔ دوسرے کی طبیعت میں ایک قسم کی شفقت آمیز حکومت کا سرور پیدا کیا جاتا ہی۔ ڈالی لینے کے بعد نگاہوں کا عتاب یا رعب شفقت اور لطف سے متبدل ہو جاتا ہی جس سے ڈالی دینے والے کو آیندہ فوائد کی امید بندھ جاتی ہی۔ چونکہ ڈالی سے تعلقات دوستانہ کا اظہار مقصود ہوتا ہی۔ اور یہ کسی خاص غرض پر محمول نہیں ہوتی۔ اس لئے دوستانہ طور پر اسے قبول کیا جاتا ہی۔ اور قانونی گرفت کا بھی کوئی خیال نہیں ہوتا۔ موجودہ شکل میں یہ رسم پوری آزادی کے ساتھ قائم ہے۔ تاہم گورنمنٹ نے مصلحتاً دو طریق سے اسکو محدود کرنا مناسب سمجھا ہی۔ اول ماتحتوں سے ڈالی لینے کی ممانعت کر دی ہی۔ دوم خاص قیمت سے زیادہ کی ڈالی روک دی ہی۔ لیکن ڈالی اس محدود شکل میں پورے طور پر مروج ہی۔ اور اسکو معیوب نہیں سمجھا جاتا۔ خوف ہی تو صرف یہ کہ کہیں جس طرح سے پہلے طریق حصول خوشنودی عام ہو کر غیر لازمی سے لازمی ہو گئے۔ اور رواج یا قانون بن گئے۔ یہ بھی ایک تمدنی قانون نہ بن جائے۔ اور جو شخص کسی افسر کو سلام کرتے وقت ڈالی پیش نہ کرے وُہ موردِ عتاب نہ سمجھا جاوے۔

اس بیان سے ا - یہ پایا گیا کہ ڈالی نے وقتاً فوقتاً خاص خاص اسباب کے اثر سے خاص خاص صورتیں اختیار کی ہیں" - یعنی شخص غالب کے خوف سے اور مصلحتاً اسکو خوش کرنے کی نیت سے خود بخود تحفہ تحائف کا دیا جانا شروع ہوا - بعدازاں بادشاہ کے لئے تحفہ تحائف لازمی ہوگئے اور ٹیکس اور مالگذاری وغیرہ کی شکل میں بادشاہ کی مستقل آمدنی کا ذریعہ بنگئے - اس کے بعد خصوصیت سے بادشاہ کو راضی رکھنے کی غرض سے بوقت ملاقات نذرانہ نذرانہ پیش کرنے کی رسم پیدا ہوئی - جس سے اصل مطلب ڈالی کا فوت ہوگیا - پھر خاص امداد شاہی کے حصول کی غرض سے خاص فیس - بعدازاں مقررہ فیس یعنی رسوم عدالت وغیرہ کا دیا جانا شروع ہوا - ادنیٰ حکام کی صورت میں بھی نذرنذرانہ کی رسم جاری ہوگئی - جب ایک شخص مطلق العنان کے اختیارات دیگر افراد پر منقسم کئے گئے - اور چونکہ شروع میں تنخواہ ملازمان سرکاری ذمہ سرکار نہ ہوتی تھی - رشوت کا رواج تقویت پکڑ گیا - تنخواہ مقرر ہونے پر بھی ادنیٰ حالت کی رسم رشوت قائم رہی - اس کے بعد چونکہ بظاہر خود غرضانہ نیت سے تحفہ دینا جرم ہوگیا - اس لئے دوستانہ طور پر ڈالی دیا جانا مروج ہوا -

ب - یہ بھی ثابت ہوا کہ حقوق شاہی مستقل طور پر قائم ہو جانے کے بعد بھی شروع میں کوئی قانون یا خاص حکم نہ تھا جس کی تعمیل میں بادشاہ کی مطابقت دکھلائی جاوے - صرف بادشاہ کے خوش کرنے میں اور خود بخود تحفہ دینے میں یعنی بیرونی علامت اطاعت متصور تھی - بادشاہ کی مطلق العنان غیر معین خواہش ہوتی تھی جس کو پورا کرنا ہی داخل فرمانبرداری تھا - بعدازاں ترقی شدہ حالت میں قوانین بن گئے - ہر ایک کی ذات و جائداد محفوظ کی گئی - اور بادشاہ کی حکومت کے برخلاف کوئی فعل کرنا - یا کسی دوسرے شخص ماتحت کو ضرر یا نقصان پہنچانا جرم ہوگیا - بادشاہ کا حق صرف جزو جائداد رعایا پر قائم کیا گیا - اور اس طریق مطابقت کے علاوہ اگرچہ کوئی فرض یا ذمہ واری نہیں تھی کہ بادشاہ کو خوش کیا جاوے - تاہم آغاز رسومات کا ہوگیا - جن سے بیرونی علامت کے طور پر اظہار اطاعت مطلوب تھا - قانون نے اس قدر ترقی کی کہ خود بادشاہ تابع قانون ہوا - یہ سب سے اعلیٰ و آخری حالت ہے کہ سکریٹری آف سٹیٹ پر نالش ہو سکے - یا زور حکومت کو ترک کرکے ایک ماتحت سائل کی طرح

اصولِ انصاف وقانون کے مطابق اپنی عدالتوں سے سرکار خود استدعائے حق کرے۔ سکول ایبٹ آباد
کے متعلق سرکار کا خود مدعی بنکر رعایا پر دعویٰ کرنا۔ اور فیصلہ خلافِ سرکار ہونا۔ اور اس قسم کے بہت
سے نظائر نہایت حیرت انگیز ہونگے۔ اُن اشخاص کے لئے جو اس خیال سے واقف نہ ہوگئے ہوں۔
لیکن گو اس ترقی شدہ حالت میں قانون کی پابندی۔ احکامِ شاہی کی تعمیل ہی اصل مطابقت سمجھی
گئی اور مستقل طریقِ عمل قائم ہوگیا جس سے بادشاہ کی خوشنودی حاصل ہوسکے۔ تاہم سابقہ ادنیٰ
حالت کی رسومات اور اُس زمانہ کے خیالات (کہ ڈالی اور تحفہ تحائف ہی سے حاکم کی خوشنودی
ہوسکتی ہے) کو بھی ساتھ ہی چسپاں رکھا گیا۔ اگرچہ ضروری اور غیرضروری مطابقت میں امتیاز ضرور
کیا گیا۔ بعض اشخاص صرف ضروری مطابقت یعنی پابندی قانون کو ہی مدنظر رکھتے ہیں۔ زیادہ تر تہنگے
غیرضروری مطابقت یعنی فالتو رسومات ڈالی وغیرہ کو بھی ویسا ہی مقدم جانکر جاری رکھتے ہیں۔

یہاں تک تو ہم نے ڈالی کی مختلف صورتوں یعنی ارتقاء پر بحث کی تھی اب ہم یہ دکھانا چاہتے
ہیں کہ روحانی یا ملکی حالت کی طرح مذہبی حالت میں بھی یہی اصُول ارتقاء عمل کرتا رہا ہے جس کی
وجہ سے بعض ابتدائی خیال تبدیل ہوتے ہوتے عقاید مذہبی بن گئے ہیں۔

آغاز تمدن میں عام عقیدہ تھا کہ ہر ایک انسان میں ایک دوسرا مثنیٰ ہے جو بحالتِ زندگی
موجود ہوتا ہے۔ اور بحالتِ موت نکل جاتا ہے یا علیحدہ ہوجاتا ہے۔ خواب کی لوگ اس طرح تعبیر کیا کرتے
تھے کہ جب بیرونی جسم بے حس و حرکت ہوکر رات کو ایک جگہ پڑا رہتا ہے مثنیٰ جسم سے نکل کر ہر ایک
جگہ کی سیر کرتا پھرتا ہے اور مختلف نظارے دیکھ کر صبح اپنے مقام یعنی جسمِ کثیف میں آ موجود
ہوتا ہے۔

اس مثنیٰ میں ہر قسم کی خواہش نفسانی کا وجود تسلیم کیا جاتا تھا۔ انسان قدیم کے نزدیک
ان دونوں میں فرق صرف یہی تھا کہ انسان کا ظاہری بدن کثیف ہے۔ اور مثنیٰ کا بدن غیرمرئی
ہے۔ جس طرح ہوا کی موجودگی ہوا کے چلنے اور طبعی دنیا میں اثر ڈالنے سے ثابت ہوتی ہے۔ اسی
طرح سے زندہ اشخاص پر بیماری۔ تکلیف۔ خوشی وغیرہ مختلف آثار کے نمایاں ہونے سے علامت

اس غیر مرئی شئے کو قرار دیا جاتا تھا۔ خدا کا خیال یا دیوی یا دیوتا کا خیال انکی طاقت دماغی سے باہر تھا۔ وُہ ہر ایک رنج و راحت کو مردہ کے شئے سے متعلق کرتے تھے۔ یہ عقیدہ آجکل بھی بہت سی وحشی اقوام میں پایا جاتا ہے۔

اس مردے کے شئے کی نسبت یقین تھا کہ نقصان و فواید زندہ انسانوں کو پہنچا سکتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں انسانی جذبات اور خواہشیں موجود مانی جاتی تھیں۔ اس لئے یہ عقیدہ تھا کہ مردے کے شئے کو بھوک۔ پیاس لگتی ہے۔ سردی گرمی محسوس کرتا ہے اور خوش اور ناراض مثل انسان کے ہو سکتا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے مردے کے شئے کی رضاجوئی شروع ہوئی۔ جس طرح کہ ملکی حالت میں شخص غالب کی رضاجوئی تحفہ تحائف سے شروع ہوئی تھی۔ اور اس کی علت غائی وہی مصلحت تھی کہ پیشتر اس کے کہ یہ ناراض ہو کر نقصان مال یا نقصان جان پہنچاوے۔ خود بخود جزو جائداد یا کچھ جاندار شئے دیکر اس کو راضی کر لیا جائے۔ سوسائٹی کی ادنیٰ حالت یعنی اس مصلحت آمیز خیال سے وُہ رسومات مرگ قائم ہوئیں۔ جن میں غذا اور لباس۔ شخص مردہ کے لئے مہیا کئے جاتے تھے۔ آجکل بعض وحشی اقوام افریقہ اور ہندوستان کے بھیلوں۔ سنتھالوں میں یہ رسومات ہیں۔ اور انکی وجہ صاف طور پر مذکورہ بالا خیال معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ جن اقوام میں اب بھی یہ دستور باقی ہے۔ وُہ ساتھ ہی مُردہ کو غذا و لباس دیتے وقت اس طرح سے مخاطب ہوتی ہیں۔ کہ "اے مہربان بزرگ یہ غذا کھالو۔ پوشاک پہن لو۔ اور ہم پر نظرِ عنایت رکھو۔ جیسا کہ حالتِ زندگی میں رکھتے تھے"۔ ہمارے ہندوؤں میں اسی قسم کے خیالات کے اشخاص ہیں یہ عقیدہ موجود ہے۔ رسوم مذہبی مثلاً سرادھ۔ پنڈ۔ کریا۔ دھرم شانت وغیرہ کا آغاز اس ابتدائی خیال سے ہوا۔ گو بعد میں ترقی شدہ حالت کے وقت۔ جب یہ خیال ابتدائی جاتا رہا۔ تو یہ رسوم بطور اظہار محبت قائم رہیں۔ مستورات سے اکثر سننے میں آتا ہے کہ "ہے وڈ وڈیریو۔ ساڈی بُھل چُک معاف کرو۔ (اے بزرگو! ہمارا کہا سنا معاف کرو) جس سے صاف طور پر پایا جاتا ہے کہ بزرگوں کے مردے کے شئے کی بابت اُن کا عقیدہ ہے کہ زندہ انسانوں کے ساتھ تعلق باقی رکھتا ہے۔ اور کہ ان میں ناراض اور راضی ہونے کا مادہ موجود ہے۔

(باقی آئندہ)

موسیقی

موسیقی اور حُسن دو ایسی دلپذیر چیزیں ہیں کہ اگر جادو کا فعل (فی الواقع) صرف اپنے معمول کو مسحور کر لینا ہی ہوتا ہے۔ تو یہ دونو بلاشک جادو اور چلتا ہُوا جادو ہیں۔

انسان جس طرح بالطبع حُسن پسند واقع ہوا ہے۔ موسیقی پسند بھی واقع ہوا ہے۔ اور ان دونوں کا طبیعتِ انسانی پر کم و بیش یکساں اثر ہوتا ہے۔ دونوں متحد الکیفیت ہیں۔ دونو دلگداز۔ دونوں رُوح پرور ہیں۔ دونوں جاں نواز۔ دونوں کی واہ میں شائبہ آہ موجود ہے۔ اور (قطع نظر بعض مستثنیات) دونوں دردانجام ہیں۔

بحسب ظاہر موسیقی اور حُسن میں کچھ مماثلت و تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی ایک کو مطلق سامعہ سے واسطہ ہے۔ دوسرے کو مطلق باصرہ سے۔ ایک غیر مرئی شے ہے۔ دُوسری مرئی ہے اور مرئی بھی کیسی؟ یہ نہ بتایا جائیگا !! لیکن اگر بغور دیکھا جائے۔ تو دونوں میں باہمدگر معنوی توافق و تناسب موجود ہے۔ حُسن۔ خاموش موسیقی (رنگینی) لئے ہُوئے ہے۔ اور موسیقی۔ حُسنِ مستور جسکو آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں۔ مگر کانوں کی راہ قلب پر وہی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جو آنکھوں سے کسی حسین کو دیکھ کر۔

دونوں میں دل گدازی کی وہ علی صفت مضمر ہے۔ جو آدمی کو انسان اور انسان کو فوق الانسان بناتی ہے۔ دِل۔ گداز ہو کر ہی لذّتِ درد کا مزہ چکھ سکتا ہے جس سے قلبِ انسان میں۔ صوفی صافی منش۔ اہل اللہ۔ اور خلیفۃ اللہ وغیرہ کا پورا مصداق بننے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ لذّتِ درد کیا شے ہے؟ اُس کی کیفیت کوئی کسی اہلِ دل سے پُوچھے۔

بس موسیقی اور حُسن وہ نسخۂ اکسیر ہیں۔ جو بے واسطہ دل کو گداز کر کے اُس میں درد پیدا کرتا ہے۔ اور دِل گداختہ ہی ہے۔ جو انسان کو مرتبۂ انسانیت سے بڑھا کر۔ ملکوتی صفات بنا سکتا ہے۔

جس طرح اطبا نے امزجۂ نباتات تشخیص کر کے اُن کے اثرات بالکیفیت والخاصیت علیحدہ علیحدہ بیان کئے ہیں۔ اِسی طرح ماہرانِ موسیقی نے ہر راگ اور راگنی کی جداگانہ طبیعتیں بیان کی ہیں۔ اور ان کا مزاجِ انسانی پر ایک حدتک طبعی اثر پڑتا ہے۔ فوری خوشی۔ فوری جوش۔ فوری جُرأت۔ فوری اُمنگ۔ فوری ولولہ (اور بعض خاص صورتوں میں) فوری درد پیدا ہونا۔ بلاشبہ طبعی پہلو لئے ہُوئے ہے۔ جس طرح بعض ادویات اگر انہیں ترکیب اور مقدار معیّنہ سے باقاعدہ طور پر بے کم و کاست استعمال کیا جائے۔ معدہ مریض میں پہنچتے ہی اپنا فوری اثر ظاہر کرتی ہیں اِسی طرح اگر کوئی باخبر اور بااصول گویا کوئی راگ یا راگنی اُس کے ہر ایک سُر پر نظر کر کے باقاعدہ اور صحیح طور سے گائے۔ تو ضرور اور فوراً اس کا اثر سامعین پر پڑیگا۔ اسی بنا پر میگھ کی چیزوں سے خودبخود ایسا محسوس ہوا کرتا ہے۔ کہ ان کو برسات سے کچھ مناسبت سی ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ رات کے نو یا دس بجے کوئی رام کلی یا پرج گانے لگا۔ الاپ کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوا کہ گویا سپیدۂ سحری نمودار ہے اور مُرغانِ خوش الحان مصروف نواسنجی و زمزمہ پرائی۔ درباری کا دن میں کبھی وُہ لطف نہ آیا۔ جو رات کے وقت۔ وَقِسْ علےٰ ھٰذا۔ اِسی کا نام ہے خاصیتِ مزاجی۔ اِس سے میری مراد یہ نہیں کہ رات کی چیزیں دِن میں اور دِن کی رات کو کام نہیں دیسکتیں۔ نہیں لطف دیجاتی ہیں۔ مگر کیسا ؟ جیسا بے فصل کا میوہ!!

بعضوں کا خیال ہے کہ جو لوگ فنِ موسیقی میں علمِ تامہ رکھتے ہیں۔ انہی کو صبح کی راگنی سے رات کو صبح کا سماں۔ اور میگھ کی چیزوں کو برسات سے مناسبت اور تعلق سا محسوس ہو سکتا ہے۔ ناواقفوں کو نہیں۔ اگر ناواقفوں سے اُنکی مراد حیوانِ ناطق ہے۔ یعنی جنہیں اچھّی بُری چیز کا احساس و تمیز نہیں تو بیشک انکا خیال صحیح ہو سکتا ہے۔ ورنہ معلومات کو تاثرات میں کچھ دخل نہیں۔ ہم عطر کا بکس ایک بھرے مجمع میں کھولتے ہیں۔ عطر کی خوشبو سے ہر شخص کا دماغ طبلۂ عطار بن جاتا ہے۔ جو لوگ حنا۔ جوہی۔ کیوڑے۔ گلاب وغیرہ میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لُطفِ خوشبو اُنکو بھی اسی قدر حاصل ہوتا ہے۔ جتنا دوسروں کو۔ فرق صرف اِس قدر کہ وُہ اس پہیلی کو بوجھ لیتے ہیں۔ اور یہ محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر جس طرح گونگا گُڑ کھا کر شیریں کام ہوتا ہے۔ مگر بیان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح یہ اُن کیفیات کو تو بتا سکتے ہیں۔ مگر راگنی کا نام نہیں بتا سکتے

ایسا ہی عطرِ خس جاڑے میں اور حنا برسات میں بے موسمی سے معلوم ہوا کرتے ہیں۔ مگر انکی طبیعت اور مزاج میں کچھ فرق نہیں آتا۔ بعض حضرات موسیقی کو علیٰحدہ ذاتہٖ موثر نہیں مانتے اور فرماتے ہیں کہ جس چیز سے دل متاثر ہوتا ہے۔ اسکا نام نازک آوازی اور خوش گلوئی ہے۔" بے شک نازک آوازی بھی قابلِ قدر چیز ہے۔ مگر بلا موسیقیت ۔ جسد بے روح۔ نری آ آ سے خاک اثر نہیں ہو سکتا۔ مثالاً موسیقی کے لئے نازک آوازی کو سونے پر سہاگہ کہہ سکتے ہیں۔ مگر نازک آوازی محتاجِ موسیقی ہے اور موسیقی محتاجِ نازک آوازی نہیں۔

انسان تو بھلا اشرف المخلوقات ٹھہرا۔ ہر اچھے بُرے کو بخوبی سوچ سمجھ سکتا ہے۔ موسیقی کے بذاتہ موثر ہونیکا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ حیوانات تک کو مسخر کر لیتی ہے۔ ذرا اونٹ کے نے ڈھنگے پن اور تن و توش پر نظر ڈالئے۔ اور ذرا سے بوجھ سے بلبلا اُٹھنے پر۔ عرب کے حدی خوان۔ معمول سے منوں زیادہ بوجھ لادکر۔ حدی خوانی شروع کرتے ہیں۔ اور ماشاءاللہ آپ (اونٹ) عالمِ محویت میں بے تکان۔ چپ چپاتے منزلیں کی منزلیں طے کر جاتے ہیں۔ آہوئے مشکی کو رام کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اُس پر بانسری کے ذریعے سے اثر موسیقی ڈال کر از خود رفتہ اور محو کر کے گرفتار کرتے ہیں۔ سانپ جیسا موذی جانور کہ انسان کے سائے سے بھاگے اور قابو پائے تو فنا کر ڈالے۔ ابھی بانبی میں کُنڈلی مارے دُنیا و مافیہا سے بے خبر گوشہ تنہائی کے مزے لُوٹ رہا تھا۔ جوں ہی سپیرے نے آکر بین بجائی۔ حضرت لہراتے ہوئے رونق افروزِ سطحِ زمین ہوئے۔ کون کھینچ لایا؟ حسنِ موسیقی۔ بچے کو دیکھئے بے چارہ پنگھوڑے یا کھٹولے پر پڑا۔ کیسا بلک بلک کر رو رہا تھا۔ ابھی ماں نے ذرا تھپک کر اپنی لَے میں لوری دینا شروع کی کہ سو گیا۔ غرض یہ کہ موسیقی بذاتہ موثر اور بجائے خود عملِ تسخیر ہے۔

موسیقی کو محض کھیل تماشا اور صرف وجہِ تفریح قرار دے لینا سخت ناحق شناسی اور ناقدردانی ہے۔ ہمیں اس سے بہت سے علمی و قوائی فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ غور کی عادت۔ تفتیش کی قابلیت تحصیل میں رسائی۔ حافظے میں تیزی۔ دماغ میں مشقِ نکتہ رسی ممیزہ و مدرکہ میں قوتِ تمیز و ادراک پیدا

ہوتی اور بڑھتی ہو اور انسان بال کی کھال نکالنے لگتا ہو۔ روح تازہ ہوتی ہو۔ طبیعت کی ماندگی اور کسل دور ہوتی ہو۔ قلب میں فرحت اور مزاج میں شگفتگی آتی جاتی ہو۔ یکسوئی حاصل کرنے کا بہت اچھا آلہ ہے۔ جن مذاہب میں گانا داخلِ طریقِ عبادت ہو۔ اس کی فلاسفی کیا ہو؟ یہی۔ علم مسمریزم میں جو اسکو داخلِ اصول کیا گیا ہو۔ کیوں؟ اس لئے کہ اس سے یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہو۔ بہرحال موسیقی ایک بکارآمد اور مفید شئے ہو۔ جس علمِ ریاضی کا ایک شعبہ کہہ سکتے ہیں۔ جس چیز میں اتنی خوبیاں ہوں بلاشبہ قابلِ قدر ہو۔ مگر دیکھنا یہ ہو۔ کہ اس کی کہاں تک قدر ہوئی۔ ہمیں زمانہ گذشتہ کی (اسلامی یا غیراسلامی دُنیا) سے استدلال کرنے کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ کیونکہ اگر اس وقت بھی اس کی یہی گت ہوتی۔ جیسا کہ اب حالت کس مپرسی میں ہو۔ تو آج ہمیں لفظِ "موسیقی" کتابوں میں بھی بڑی تلاش سے ملتا۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ فن بڑا لطیف اور بہت شریف فن تھا۔ حکما کے گھر میں پیدا ہوا۔ انہی کی گود میں پرورش پائی۔ بڑھا۔ صلحا بھی محبت کی نظر سے دیکھنے لگے (اگرچہ زیادہ منہہ نہ لگایا) علما میں بھی بے وقعت نہ رہا۔ ترقی کی۔ اور دربارِ امرا و خلفا تک رسائی ہوئی۔ سوءِ اتفاق سے ایک ایسی نااہل قوم کے پلے بندھا۔ جو ملک میں بلحاظ تمدن و معاشرت ادنیٰ ترین و ذلیل سمجھی جاتی تھی۔ اُن کمینوں نے اسے اپنا وجہ معاش قرار دیکر اور صرف اپنی جاگیر سمجھ کر خاص اپنی قوم میں محدود کر لیا۔ اور اس کی اشاعت میں اس قدر بخل روا رکھا کہ شاید کاشی جی کے پنڈتوں نے تعلیم علم سنسکرت میں بھی اسقدر کنجوسی نہ برتی ہوگی۔ گویا طوطی را با زاغ در قفس کردند۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا۔ ووں ووں یہ اعلیٰ سوسائٹی سے دُور ہوتا گیا۔ شرفا رنجیدہ۔ بہ نظرِ حقارت دیکھنے لگے۔ اور کمینوں سے اس کی خصوصیت و اتحاد بڑھتا گیا۔ "صحبتِ صالح ترا صالح کند" کی ذیل میں آگیا۔ ان کمینوں کی نسبت سے لوگ اسے بھی کمینہ سمجھنے لگے۔ اور ان نالائقوں نے اُسے ایسی بدذوقی اور بے احتیاطی سے استعمال کیا۔ کہ لحن داؤدی کی سی نایاب شے بھی ممنوعات شرعی میں داخل ہوگئی۔ ایسی حالت میں یہ فن کیوں نہ نیچا دیکھتا۔ نیچا دیکھا اور ایسا۔ کہ آج اس قوم میں بھی فی صدی ایک آدھ شخص ہی ایسا مل سکتا ہو۔ جو اس کے اصول و قواعد سے کماحقہ باخبر ہو!!!

(باقی آئندہ)

خوشی کی بات ہو کہ آج کل اعلیٰ طبقے کے لوگوں اور مہذّب جلسوں میں باجوں گاجوں کے توسّل اور معرفت سے اسکی آؤ بھگت ہونے لگی ہو۔ اگر اب بھی اس کی حفاظت نہ ہُوئی اور اس پر توجّہ نہ کی گئی تو وُہ زمانہ دُور نہیں کہ بعض قوموں کی طرح روئے زمین پر اس کا بھی نشان نہ ملیگا +

سیّد علمدار حسین

اِس دفعہ جو دو تصویریں ہدیۂ ناظرین کی جاتی ہیں وُہ دو ایسے مشاہیر کی ہیں جو اپنے اپنے طبقے میں نہایت ممتاز ہیں :—

خانبہادر مولانا سیّد علی محمّد صاحب رئیسِ عظیم آباد مدّ ظلہ العالی کی زیارت کے ناظرین بیتابی کے ساتھ منتظر ہونگے۔ آج ہم اس تصویر کو شائع کر کے اُن کے دیدۂ مشتاق کو نورانی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آیئے دیکھیے یہ ہیں وُہ بزرگ جن کے کلام کو پڑھ پڑھ کر آپ سر دُھنتے رہے ہیں جن کے مضامین کی پاکیزگی خیالات کی نفاست زبان کی سلاست بیان کی متانت بندشوں کے بیساختہ پن اور اُستادانہ قادرالکلامی کے آپ قائل ہو چکے ہیں۔ آیئے اور اُنکی زیارت کیجیے۔ ع صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے +

منشی محبوب عالم صاحب ایڈیٹر و مالک پیسہ اخبار لاہور کے مضامین سے مخزن کے صفحات ایک آدھ دفعہ زینت حاصل کر چکے ہیں اُردو اخبار نویسی کی جو خدمات ان کے قلم اور دماغ نے کی ہیں اُن کو اب ابنائے زمانہ نے تسلیم کر لیا ہے۔ اُردو اخبارات کے دیکھنے والوں کے معلومات کو وسیع کرنے اور مفید اور دلچسپ خبریں اور مضامین بہم پہنچانے میں پیسہ اخبار لاہور خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اُن کے فہمِ رسا اور تجربے کا نتیجہ ہے +

قومیّت

از صراط المستقیم قوم پا بیروں منہ
چوں گسست از رشتہ سوزن خود را گم کند

دُنیا کی قوموں میں خواہ کتنا ہی بُعد اور ما بہ الامتیاز ہو اور خواہ کتنے ہی اختلافات اور تضاد پائے جائیں۔ یہ کہنا ہی پڑیگا کہ اُن سب کا شروع یا منبع ایک ہی ہے یا کسی وقت میں ایک ہی تھا گو بعض محققین نے قوموں کی تحقیقات کرتے یہ بحث بھی کی ہے کہ بعض قومیں بعض قوموں سے کوئی بھی قریبی نسبت نہیں رکھتی ہیں۔ مگر اخیر پر ایسے محققین کی آرا کا میلان بھی ادھر ہی ہؤا ہے کہ ان سب کا مخرج یا ابتدا ایک ہی ہونا[1] چاہئیے۔

جو قومیں دوسری قوموں سے بعید فاصلے پر نظر آتی ہیں اُن میں بھی باوجود اس بعد اختلاف یا تباین عظیم کے چند ایسی نسبتیں پائی جاتی ہیں جو اس بات کا استقرائی ثبوت ہیں کہ ان سب کا ابتدائی سلسلہ ایک ہی تھا۔

یہ ایک دلچسپ بحث ہے کہ اس قدر اختلاف قوموں میں کیوں ہو گیا اور اُن میں ایسا بُعد عظیم اور تباین کیوں پایا جاتا ہے جب یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ شروع ان سب کا ایک ہی شعبہ اور مرکز سے ہوا ہے تو پھر ان ما بہ الامتیازات کی اصل وجہ کیا ہے۔ گو ہم یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ ان اختلافات اور اس تباین کی وجوہ کیا ہیں۔ لیکن یہ کہنے کے بغیر نہیں رہ سکتے کہ موجودہ تباین کا بہت سا

[1] انسان کا شروع چاہے حضرت آدم علیہ السلام سے مانا جاوے اور چاہے برہما سے۔ چاہے پہلی تحقیقات کے مطابق ڈاروِن کی تھیوری ہی مسلّم اور مقدم رکھی جاوے۔ ضرور ہے کہ اس سلسلے کا شروع ایک ہی ہو ۱۲

حصہ فروعات میں ہے۔ اصول[55] میں کوئی اختلاف نہیں ہے اور یہ فروعی اختلاف بوجہ اختلافِ آب وہوا اور مساکن یا طرزِ معاشرت کے ہوا ہے۔ اختلافِ آب وہوا کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ فروعی امور میں ایسے اختلافات ناشی ہوں۔ اختلافِ آب وہوا سے صرف اجسام ہی متاثر نہیں ہوتے۔ اس کا بہت سا اثر اخلاقی اور سوشیل اعتبارات سے طبائع اور دماغ پر بھی پڑتا ہے۔ جب ہم ایک گندی یا غلیظ ہوا سے ایک عمدہ اور صاف ہوا میں جاتے ہیں تو طبیعت کی امنگ اور جوش کسی اور ہی پیمانہ پر ہوتا ہے۔ دماغ میں ایک قسم کی بشاشت اور طبیعت میں سرور پایا جاتا ہے۔ دل میں ایک فرحت اور ایک تازگی پیدا ہوتی جاتی ہے۔ رنگت اور ظاہری حالت میں ہی نمایاں فرق نہیں ہوتا بلکہ خیالات اور قیاس میں بھی ایک جودت اور فراست محسوس ہونے لگتی ہے[56]۔

گرم ملکوں کے رہنے والے کچھ اور ہی طبیعت رکھتے ہیں اُن کی دماغی طاقتوں اور ذہنی فراستوں کا مقیاس کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ خلاف اس کے جو قومیں سرد ملکوں یا سرد آب وہوا میں بود و باش رکھتی ہیں اُن کی طبیعت اور اُن کے دماغ کی کچھ اور ہی کیفیت ہوگی جس طرح آب وہوا اور زمین کے اختلاف سے نباتات[57] میں باعتبار رنگت۔ ذائقہ۔ خاصیت کے ایک

---

[55] اصولی خصوصیتوں سے وہ خصوصیتیں مراد ہیں جو سب قوموں اور سب قبائل کو شامل ہیں اور جن کے بغیر کوئی قوم موجود نہیں ہے اور نہ ہی موجود رہ سکتی ہے اگر کسی قوم کو اُن سے فرضاً بھی معرا تسلیم کر لیا جاوے تو گویا اُسے دائرہ انسانیت سے گرا دینا ہے ۱۲

[56] بعض حکیموں کا یہ خیال ہے کہ آب وہوا کی عمدگی ہی اچھے خیالات کی موجد یا باعث ہے۔ عمدہ آب وہوا سے ہی دماغ تر و تازہ ہو کر اُن علمی مراتب تک پہنچتے ہیں جو انسانی ترقی کے اقصار خیال کیے جا سکتے ہیں ۱۲

[57] علمِ نباتات کے محققین نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ایک ہی جنس کی نباتات میں باعتبار آب وہوا کے بین تباین ہوتا ہے۔ حالانکہ اُن کا شروع ایک ہی وقت سے متعلق ہے صرف آب وہوا کے اختلاف سے موجودہ فرق پڑ گیا ہے۔ چا۔ اور آلو اپنی اپنی جنس میں ایک ہی ہیں۔ لیکن امریکہ کے آلو۔ اور ہندوستان کے آلو میں فرق ہے ۱۲

نمایاں اور قابلِ لحاظ فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح انسانی طبائع میں بھی مقابلتاً تباین موجود ہے۔ حتیٰ کہ دماغ اور جن کی طبیعتیں زیادہ تر صحیح الحالت ہیں اُن کے خیالات اور قیاسات نسبت اُن لوگوں کے زیادہ تر مجلّی اور صاف ہوتے ہیں جو کثیف الکیفیت ہیں۔

آب و ہوا کے علاوہ ضروریات نے بھی قوتوں میں تعزلزل کی ہے۔ ضروریات کی وسعت اور اختلاف کا بہت سا حصہ بھی آب و ہوا پر موقوف ہے۔ جو قومیں یا جو قبائل سرد آب و ہوا میں رہتی ہیں اُن کی ضرورتیں ان قوموں سے مغائر ہیں جو گرم ملکوں میں بود و باش رکھتی ہیں۔ جو قومیں میدانی خطوں میں رہتی ہیں۔ ان کی ضرورتیں پہاڑی قوموں سے مختلف فیہ ہیں[1]۔

---

[1] بعض محققین نے یہاں تک درست مانا ہے کہ ان کے نزدیک زبانوں کا اختلاف بھی آب و ہوا ہی کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اسی طرح ان کے خیال میں لباسوں کا مختلف ہونا بھی آب و ہوا اور ضروریات کے باعث کا ہی نتیجہ ہے۔ لباس کے اختراع میں بے شک ہر قوم کے مذاق کو بھی دخل ہے لیکن ضرورت نے بھی اس میں بہت کچھ حصہ لیا اور دخل پایا ہے۔ جس طرح قوموں میں ایک نسبت ابتدائی پائی جاتی ہے اسی طرح لباس میں بھی ایک ابتدائی نسبت موجود ہے۔ انسان کا پہلا لباس برہنگی ہے۔ اس کے اتر کر ستر کا سوال پیدا ہوا۔ ستر کے خیال سے انسان نے پہلے پہل ہاتھوں سے کام لیا پھر پتوں سے۔ پھر رفتہ رفتہ لباس کی تراش خراش کی گئی۔ اگر دنیا کی سب قوموں کے لباس جمع کر کے دیکھے جاویں تو بادنیٰ غور نتیجہ نکل سکتا ہے کہ قوموں کے شروع کی طرح لباس کی بنیاد بھی ایک ہی سلسلے سے پڑی ہے۔ ہر قوم کا موجودہ لباس یہ پتہ اور یہ شہادت دیتا ہے کہ کسی نہ کسی قدیم لباس سے نکلا ہوا ہے۔ برہنگی اور معمولی ستر کے مقابلے میں شاید سب سے اول لنگوٹی کو شرفِ لباس ملا۔ رفتہ رفتہ لنگوٹی اصلاح پاتی پاتی چھوٹے اور بڑے تہبند کی صورت میں آ گئی۔ پھر چادر کا حسن چلا اور چادر سے دھوتی لنگی اور دھوتی سے پاجامہ وجود میں آیا اور پاجامہ کھسکتے کھسکتے پتلون بن گئی۔ اسی طرح ٹوپی اور پگڑی یا عمامہ کی ہستی ظہور میں آئی۔ اور اسی طرح واسکٹ یا صدری کرتوں اور قمیصوں کی نوبت آئی اور دن بدن ان میں بھی طرح طرح کی اختراعیں ہو پیدا ہوتی گئیں۔ انسان پہلے ننگے پاؤں پھرتے تھے۔ ضرورت نے سمجھایا کہ پاؤں کے نیچے بھی کچھ رکھنا چاہیے غالباً پہل پہل چپلی کی صورت میں کوئی جوتا اختراع کیا گیا ہوگا۔ اس کے بعد سمجھ نے مختلف اقسام کے جوتے اور بوٹ بنتے گئے۔ لباس کا شروع شروع میں ایک شکل یا ایک ہیئت اور وضع سے ترقی پاتے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ ان سب قوموں کا شروع بھی ایک ہی تھا۔ اگر ایک شروع نہ مانا جاوے تو ساری دنیا کے لباس میں یگانگت اور اتحادی نسبت کا موجود ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اتحادی نسبت صریحاً اس امر کا ثبوت ہے کہ ان سب کا شروع ایک تھا+

جیسے جیسے قومیں ضرورت کی وجہ سے نقل مکان کر کے اِدھر اُدھر پھرتی رہیں - ایسے ہی وقتاً فوقتاً اُن کے فروعی اجتہاد میں بھی تبدیلی آتی رہی - یہاں تک کہ ان تبدیلیوں سے ایک قوم بمقابلہ دوسری قوم کے چند خصوصیات کی وجہ سے تمیز کی گئی - پہلے پہل شخصیت کی بنیاد رکھی گئی - ازاں بعد خاندان بنتے گئے اور خاندانوں سے قومیں بننی شروع ہو گئیں اور قوموں کی تفریق سے مستقل طور پر مقام و تمیز قائم ہو گئی -

جب یہاں تک تفریق ہو گئی تو اُن کے تفاوت یا تحدید کے وسیلے بمصداق وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اُن کے درمیان باعتبار عادات و شعائر کے ایک حدِ فاصل قائم ہو گئی - یہ وہی حدِ فاصل ہے جو ایک قوم کو دوسری قوم سے خصوصیت اور تمیز دیتی ہے اور جس سے ہر فرد کے دل میں یہ خیال متمکن ہو کہ میں فلاں قوم میں سے ہوں اور فلاں فلاں قوم میں سے مجھے فلاں قوم میں شامل ہونے کا حق جدی حاصل ہے اور فلاں کو فلاں میں اُن قومی خصوصیتوں میں یہاں تک استحکام ہوتا گیا کہ اُن کے خلاف چلنا اس قوم میں سے نکلنے کے برابر ہو گیا انہیں لوگوں یا انہیں افراد کو اس قوم میں سے ہونے کا شرف بخشا گیا جن میں وہ خصوصیتیں پائی جاتی رہیں جو اُن سے معرا تھے وہ دوسری قوم میں شمار ہونے لگے - اور انہیں شعائر اور خصوصیتوں کو ان قوموں کا شعائر سمجھا گیا -

جس طرح ایک علم یا ایک فن دوسرے علم یا دوسرے فن کی بنیاد ہے اور ایک شاخ دوسری شاخ کی ابجد - اسی طرح ایک قوم دوسری قوم کی شعبہ یا شاخ ہے جس طرح باوجود اس ترتب اور اس نسبت کے علوم اور فنون کے آثار اور مختصات جداگانہ ہیں اور اسی حالت میں ایک علم یا ایک فن اپنی حد میں قائم اور محدود رہ سکتا ہے کہ اُس کے مختصات اور آثار سے اُسے تمیز دی جاوے اسی طرح کوئی قوم اُس وقت تک قوم کہلانے کا حق نہیں رکھتی جب تک اُس میں اُس شاخ کی خصوصیتیں اور قومیت نہ پائی جاتے - گو منطق اور فلسفے میں گو نسبت ہے لیکن جب تک منطق باعتبار اصول نطق تمیز نہ دیا جاوے منطق نہیں ہے جو اصول موضوعہ

منطق اور فلسفے کے مابین عملی تفریق کرتے ہیں۔ اُن کا وجود بہرحال ضروری اور لابدی ہے۔

اِس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ۔

الف۔ اس وقت تک کوئی قوم قوم کہلانے کا استحقاق نہیں رکھتی ہے۔ جب تک اُس میں قومیت کی خصوصیتیں نہ پائی جاویں۔

(ب) جس قوم میں قومی خصوصیتیں نہ پائی جاویں وُہ قوم نہیں ہے۔ بلکہ ایک مجموعہ افراد ہے جس طرح دُنیا میں اَور افراد پائے جاتے ہیں۔

(ج) ایک قوم سے چند افرادِ انسانی کا مجموعہ مراد ہے۔ جب اُس مجموعے میں قومیت کی خصوصیتیں پائی جاویں جس سے اُنکو تمیز دیا جا سکے تو کہا جا دیگا کہ اُن افراد میں قومیت[۵۵] موجود ہے۔

قوم ایک ڈھانچ یا ایک جسم ہے اور قومیت ایک رُوح یا جان کوئی ڈھانچ یا کوئی جسم رُوح اور جان کے بغیر زندہ نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح کوئی قوم بغیر جوش قومیت کے زندہ قوم نہیں کہی جا سکتی۔

جو خصوصیتیں ایک قوم سے دُوسری قوم کو تمیز دیتی ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں ہیں۔

(۱) یا تو وُہ ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں محض بلحاظ عوارض تمیز دی جاتی ہے۔

(۲) یا ایسی خصوصیتیں ہیں جن سے ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں باعتبار ملزمات تمیز دی گئی ہے۔

عارضی خصوصیتوں کے اندر ضرورتاً تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ اور ایسی عارضی تبدیلی سے ملیت یا حقیقت الامر میں کوئی فرق یا کوئی انقلاب نہیں آتا ہے لیکن ملزومات کی تبدیلی سے اس خاصے

[۵۵] ہر انسان عرفاً انسان ہے لیکن ہر انسان شجیع اور فصیح نہیں ہو سکتا۔ شجاعت اور فصاحت دو جداگانہ خاصے ہیں یہ خاصے کچھ تو طبعی ہوتے ہیں اور کچھ نہیں ترقی بھی دی جاتی ہے۔ اسی طرح ہر شخص ایک قوم میں داخل ہے لیکن جب تک اس میں جوشش قومیت نہ ہوگا تب تک اس کی نسبت یہ نہیں کہا جاویگا کہ اس میں مادہ قومیت یا جوشش قومیت بھی موجود ہے اور اُسے اُس سے کبھی کوئی نسبت نہیں ہے ۱۲

ضعف یا تبدیلی کرنے کا اندیشہ ہو۔ جسے دُوسرے الفاظ میں۔ قومیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
جب یہ کہا جاتا ہو کہ فلاں قوم پر ادبار پڑ گیا یا فلاں قوم بگڑ گئی۔ تو اُس کا ہمیشہ یہ مفہوم نہیں ہوتا کہ وُہ قوم دنیا کے طبقے سے ہی اُٹھ گئی ہو۔ یا اُس کا کوئی فرد بھی باقی نہیں رہا ہے بلکہ یہ مطلب ہوتا ہے کہ بد قسمتی سے اُس قوم کے اندر مادہ قومیت کا نہیں رہا ہے۔ یعنی وُہ جوش قومیت نہیں رہا ہے جس سے قومیت کی بنیاد پڑتی ہو اور جس سے ایک قوم بمقابلہ دُوسری قوم کے تمیز دی جاتی ہو۔ قومیں کب بگڑتی ہیں اور اُن کے عروج میں کب فرق آتا ہو جب اُن میں مادہ یا جوش قومیت نہیں رہتا ہو یا اُس میں ضعف آجاتا ہے۔

یہ کہنا کہ جو قوم بگڑتی ہو وُہ پھر کبھی نہیں بنتی۔ تاریخ کے خلاف چلنا ہو اور نیز قدرتی قوانین سے انحراف کرنا۔ تاریخیں شاہد ہیں اور قانون قدرت گواہ۔ قومیں بنتی بھی ہیں۔ اور بگڑتی بھی ہیں اور بگڑنے کے بعد بن بھی جاتی ہیں۔

تنزل اقوام کے بواعث مختلف ہوتے ہیں۔ محققوں نے قوموں کے اسباب تنزل پر دلچسپ بحثیں کی ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہو کہ جو قوم قومیت چھوڑ دیتی ہو یا اس سے وُہ جاتی رہتی ہے وُہ مُردہ ہو جاتی ہو اُس میں سے وُہ جوش نکل جاتا ہو جسے دُوسرے الفاظ میں قومی غیرت کہا جاتا ہے۔ غیرت سے وُہ طریقہ یا وُہ طریق عمل مراد ہو جس سے ایک خصوصیت[۱] کے قائم رکھنے کی کوشش کی جاتی ہو جو ایک طاقت یا ایک شاخ کو دُوسری طاقت یا شاخ سے تمیز دیتی ہو۔ جو قوم

---

۱ بعض قوموں نے بجائے جوش قومیت کے قوم کو ذات کے مفہوم میں منتقل کر کے قومی تفریق سے اَور بھی نقصان اُٹھایا ہو قومی تمیز باعتبار قومیت کے مقابلتاً لازمی ہو لیکن قومی تمیز ذات کے معنوں میں سخت نقصان رساں ہو۔ بیشک ایک فرد قوم یا ایک خاندان اور ایک قبیلہ قوم باعتبار شرفِ ذاتی یا علو عمل کے ممتاز سمجھا جا سکتا ہو۔ لیکن اُسے ایک اصُول نہیں قرار دیا جا سکتا من حیث الافراد یہ کہنا کہ شرف و فضیلت اینجا است بعض حالات میں درست ہو۔ بمعنی عام درست نہیں ہو۔ من حیث المجموع قومیت کا ترک کر دینا اور جوش قومیت سے انحراف کرنا اپنے ہاتھوں اپنی قوم اور اپنے اعزاز قومی کو برباد دینا ہو۔ فخر ذاتی اَور شے ہو اور افتخار قومیت شے دیگر ۱۲

متنزل ہو اُس پر لازم ہو کہ دُوسری ترقی یافتہ قوم کے نقشِ قدم پر چلکر ضروریاتِ زمانہ کے مطابق ترقی کرے اور وُہ وسائل اور ذرائع فراخ دلی سے اختیار کئے جاویں جو موجباتِ ترقی ہیں۔ لیکن اُس کے ساتھ قومیت یا جوشِ قومیت اور خصائلِ قومیت سے بہت بردار ہوتے جانا ایک ایسے گڑھے میں اپنے تئیں گرانا ہو جو اپنے عمق میں پہلے ہی صدہا قوموں کو ڈبو چکا ہے۔

جب کبھی زمانہ اصلاح کا جوش پیدا کرتا ہو تو ہر کہ و مہ کی طبیعت میں ریفارمیشن کی اُمنگیں پیدا ہوتی ہیں اور ہر شخص اپنی بساط کے موافق اس میں حصہ لیتا ہو تعلیم یافتوں اور سمجھ داروں میں ہی یہ اُمنگ یا یہ جوش نہیں ہوتا - جاہلوں اور نا تعلیم یافتوں میں بھی اس کا اثر پایا جاتا ہو۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ نئے لوگ نئی تجویزات کے مطابق کام کرتے ہیں اور پُرانے دیرینہ اصولوں پر جو لوگ دیرینہ اصولوں کے عادی یا دلدادہ ہیں دراصل وُہ بھی اپنی رائے کے مطابق ایک اصلاح کرتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں وُہی غلطی اور وُہی لغزش زیادہ تر گرفت کے قابل ہو جسے قومیت کی غلطی یا اس کا بُرا استعمال کہا جاتا ہے۔

طبیعتیں کبھی کبھی اصلاح کے جوش میں اُن راہوں سے نکل جاتی ہیں۔ جن میں قومیت یا جوشِ قومیت کے آثار قریباً معدوم دکھائی دیتے ہیں۔ گو ایسی طبیعتیں اور ایسے لوگ بعض ترقیات کے مالک ہو جاتے ہوں لیکن چونکہ ان میں قومی جوش یا قومی خصوصیت مفقود ہوتی ہے اور محض ایک نمایشی سامان ہوتا ہو۔ اس لئے اُن کا وُہ جزوی عروج یا ترقی بجائے سودمند ہونے کے مضر پڑتا ہو۔ کوئی قوم دُوسری ترقی یافتہ قوم میں مل جانے سے یا اُن کے آثار اور خصوصیتوں کے قبول کرنے سے قوم نہیں بن سکتی۔ یا اپنی قومیت عزت کے ساتھ قایم نہیں رکھ سکتی۔ جب تک کہ اس میں اپنی قومیت کی خصوصیتیں اور آثار نہ پائے جائیں[1]۔

یورپ کی قومیں اس زمانہ میں بیشک عالیشان ترقی پر ہیں لیکن انتہائی قومیں اُن کی

[1] ہم ان خصوصیتوں اور آثار کا کسی دوسرے موقعہ پر ذکر کرینگے۔ جنہیں کسی ایک قوم کے مقابلے میں قومی آثار یا قومی خصوصیتیں کہا جا سکتا ہے۔

قومیت اور خصوصیات قومیت میں محو اور ممتزج ہو کر ایک قوم نہیں کہلا سکتی ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں کے خیالات اور فضائل کا کتسب ہونا اچھی عادت اور اچھا طریقہ ہے۔ لیکن اپنی قومیت یا جوشِ قومیت سے معرا اور خالی ہو جانا اپنی قوم کا خون[1] کر دینا ہے۔ پہلی قومیت صرف دو جہت سے ٹوٹ جاتی ہے۔

(الف) بذریعہ انتقال خون۔

(ب) بذریعہ تبدیلِ مذہب۔

دوسری قوم میں جاکر یا شامل ہو کر شادی نکاح رشتہ داری پیدا کر کے اُن میں ہمیشہ کے واسطے مل جانا کسی نہ کسی وقت پہلی قومیت کو توڑ دیتا ہے۔ گر یہ حالت بھی افراد سے خاص ہے نہ کہ مجموعہ افراد سے اور اس حالت میں بھی مدتوں تک پہلا داغ نہیں مٹتا جب کبھی تحقیق ہوتی ہے پہلی قومیت جھلک دے ہی جاتی ہے۔

تبدیلِ مذہب سے بھی پہلی قومیت ٹوٹ جاتی ہے۔ مذہب بھی ایک ایسی طاقت ہے جو خاصۂ قومیت پر بالخصوص غالب آتی ہے اور اُس کے کل اجزا میں حلول کر کے اُسے اپنے رنگ پر لے آتی ہے۔ قومیں قوموں سے صدیوں لڑتی بھڑتی رہیں لیکن جب ایک قوم یا دوسری قوم کا مذہب قبول کر لیا تو اُن میں سے ایک قوم کی قومیت زائل[2] ہوگی۔ یا نسبتاً ایک نئی قوم بن گئی۔

[1] جو لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ دوسری قومیت میں مل کر اپنی قوم یا اپنی شاخ کو ترقی دیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر ترقی یافتہ قوم تنزل افراد کے لئے اپنی قومیت سے دو نہیں ہو سکتی۔ اُس میں طاقت تو ہے کہ ایسے چند افراد کو اپنے آپ میں شامل کر لے لیکن یہ ہونا مشکل ہے کہ ان افراد کی خاطر وہ دوسری قوم کی قومیت ہو جاوے ۱۲

[2] باوجود اس کے کہ مذہبی طاقت بسا اوقات قومیت یا جوشِ قومیت پر غالب آتی ہے پھر بھی تاریخی واقعات شاہد ہیں کہ قومیت کا رنگ بعض اوقات معدوم ہونے میں نہیں آیا۔ ساری یورپین قومیں ایک ہی مذہب رکھتی ہیں مگر پھر بھی ان میں قومیت کے جوہر جداگانہ چمک دمک مارتے ہیں یورپین مذہب کا اعتبار سے اور جیسی دین کی جہت سے جیسے ہندو کے معتقد اور نام لیوا ہیں اور دیگر یورپین عیسائیوں کے ہم نوا لیکن پھر تو ان میں بھی تفریق قومیت کا جلوہ یا سماں کسی نہ کسی رنگ میں موجود ہی ہے پھر کس طرح لکھا جا سکتا ہے کہ دوسری غیر مذہب قوم میں ان اقوام کی قومیت کی وراثت بن جاویگی۔ یہ نظیریں اس امر کا بدیہی ثبوت ہیں کہ قومیت بہت مشکل سے دور ہوتی ہے ہاں جب فضائل قومی کو ترک کیا جاوے تو فرق ضرور آ جاتا ہے ۱۲

جن قوموں نے تنزل میں ہو کر ترقّی پائی اور عروج حاصل کیا ہو اور جنہیں ریفارمیشن کی ضرورت پیش آئی ہو اُن کا ہمیشہ یہ اصُول رہا ہو کہ باوجود سب قسم کی فتوحات اور اکتساب کے اپنی قومی خصوصیتوں اور قومیت کو نہ چھوڑا جاوے۔ یہی اصول اور یہی معاہدہ تھا جو ان قوموں کی مستقل حرمت اور عزت کا باعث ہوا ہے۔ ہر طاقت یا ہر وجود میں ایک ایسی خواہش موجود ہو جسے آن کہا جاتا ہے اُس آن سے ہی اُس طاقت یا وجود کی وقعت اور حرمت ہوتی ہے۔ قومی خصوصیتوں اور قومیت کو قائم رکھنا درحقیقت اس آن کو قائم کرنا ہے جو ریفارمر یا جو مصلح یا مجدد احتیاجاتِ قومیت سے گریز کرتا اور اس سے متعرض ہو وہ اپنے تئیں کیا دیگر افراد کو بھی ایک تہلکہ میں ڈالتا ہے۔

اگر یہ خواہش اور یہ آرزو ہو کہ ایک قوم کو دُوسری قوم کے مُقابلہ میں عزت دی جاوے تو قومیت سے انحراف یا اعراض ایک گناہ کبیرہ[۵۱] سمجھا جاوے۔

اس بات کا فیصلہ کہ کسی قوم کی قومی خصوصیتیں کیا ہیں اور قومیت کیا یا کیا ہونی چاہئیں مخفی اور مستتر نہیں۔ جن خصائل اور جن خصوصیتوں اور شعائر کی وجہ سے ترقی کے گذشتہ زمانوں میں کوئی قوم شناخت کی جاتی اور عزت دیجاتی رہی ہو۔ وُہی شعائر اب بھی اس کی خصوصیات میں داخل ہیں اور قومیت کے اجزائے لازمیہ۔ یہی ایک اصُول ہو جو جوشِ قومیت کے قائم رکھنے کے لئے سدِ سکندری کا کام دیتا ہو۔ کوئی قوم اُس وقت تک حقیقی صلاح اور فلاح کی مالک نہیں ہوسکتی جب تک اس میں جوشِ قومیت نہ ہو جوشِ قومیت اُس وقت تک نہیں پیدا ہوسکتا جب تک قومی خصوصیتیں زندہ اور موجود نہ ہوں۔ خصوصیات قومی کیا ہیں۔ ایک قومی جھنڈا یا قومی نشان۔ جس کا کوئی نشان

[۵۱] دُنیا میں ہر شے کی طاقت اور حرمت ایک نسبت رکھتی ہو۔ نسبت کا توڑنا اور اس سے اعراض خود اپنی شَے ذلیل کرنا اور توڑنا ہے۔ جب تک ایسی نسبت قائم نہ رہے نہیں کہا جا سکتا کہ ایسی قوم بہ حیثیت قومیت کے ایک قوم ہو۔ جن قوموں میں قومیت ایک فرضِ عین سمجھی جاتی ہو اور جو اپنی قومیت کے دلدادہ یا فدائی ہیں ان کی نگاہوں میں بھی ایسے قوم فروش یا قومیت شکن لوگ عزت اور وقعت کی نگاہوں سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ گو کہ وُہ زبانِ حال سے اس کی نسبت ایسے لوگوں سے کچھ قیل و قال نہ کریں ۱۲

جو کوئی تمیزی خصوصیت نہیں ہے وہ قوم مردہ ہے۔ ہر مقام ہر زمانے میں اپنے ہی نشان سے شناخت کی اور عزت دیجاتی ہے اور شناخت کی جانی چاہئے۔ چاہے کوئی کتنی ہی ترقی کرلے اور کیسے ہی عروج پر پہنچ جاوے جب تک وہ اپنے نشان کے نیچے نہیں آئیگا اُسے اُس قوم میں سے نہیں کہا جائیگا صرف تعلیم یافتہ۔ مہذب امیر بادشاہ خود مختار ہوجانا خوشی کا موجب نہیں۔ خوشی کا موجب اور عزت کا باعث کیا ہے۔

قومیت کا حامی ہونا قومیت کو قائم رکھنا قومیت کو نباہنا۔

جس قوم یا جس قوم کے افراد میں یہ خصوصیات نہیں ہیں وہ ایک قوم کے بڑے نام افراد ہیں۔ اُن میں قومیت اور قومیت کا جوش نہیں ہے۔ لوگ شخصیت کے قائم اور باقی رکھنے یا نباہنے میں کوشاں رہتے ہیں لیکن جب قومیت کے مرحلے پر پہنچتے ہیں تو انہیں یہ قاعدہ یاد نہیں رہتا جس طرح شخصیت بغیر خصوصیات شخصیت کے قائم نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح قومیت کا بھی بغیر خصوصیات قومیت کے باقی یا قائم رہنا مشکل ہے۔ ؎

منہ بہ بہار اے غافل ز حدِ خود قدم بیروں
کہ ریزد خونِ خود صیدے کہ آید از حرم بیروں

میرزا سُلطان احمد

خوش ہے وہ شخص جس نے دانائی حاصل کی ہو۔ دانائی کی تجارت چاندی سے بہتر ہے اور اس کا منافع خالص سونے سے اچھا۔ اسکی قیمت لعلوں کے ڈھیر سے بڑھکر ہے۔ لعل کیا کوئی چیز بھی اس کے مقابل نہیں ہو سکتی۔ اس کے دائیں ہاتھ میں دانائی عمر ہے اور بائیں میں دولت اور عزت۔ اس کے انداز خوش آیند انداز ہیں اور اسکی راہوں میں امن ہی امن ہے۔

(ترجمہ) (میر نذیر حسین)

"نقاب اور گھونگٹ"

ملبوسات پر کچھ لکھنا شیخ محمد اکرام صاحب کا حصہ ہے جو اس کے قبل کلاہ و دستار اور دوپٹے پر پُر لطف مضامین لکھ چکے ہیں۔ اور باقی جن کپڑوں کی نسبت اُن کا وعدہ ہے اُن میں انصافاً نقاب اور گھونگٹ کو بھی شامل کرنا چاہئے مگر میں چاہتا ہوں کہ شیخ صاحب سے پہلے ان دونوں پر بطریق اجمال اپنے خیالات ظاہر کروں۔ اُمید ہے کہ مجھ کو پیش قدمی کی اجازت دیدی جائیگی۔

نقاب اور گھونگٹ دونوں ایشیا کی پیدائش ہیں۔ یورپ کے فیشن میں جہاں کہیں نقاب کو استعمال کیا جاتا ہے وہ اس کے اصلی مقصد سے کوسوں دُور ہے۔ وہاں باریک ریشم کی نقابیں ڈالی جاتی ہیں جن سے چہرہ چھپانے کی غرض نہیں اظہارِ حُسن اور زیبائش کی افزونی مدِنظر ہوتی ہے۔ یہ نقابیں عمدہ سیاہ ہوتی ہیں جنمیں سرخ سفید چہرے کا جھلکنا بہت بھلا معلوم ہوتا ہے گویا چاند پہ ہلکے سے ابر کا ایک ٹکڑا ہے۔ جس میں سے چاندنی چھن رہی ہے۔ نقاب میموں کی چھجہ دار ٹوپی میں لگی ہوئی ہوتی ہے اور نیچے کا حصہ ٹھوڑی میں پھنسا دیا جاتا ہے۔ اس لئے نقاب کا کپڑا آنکھوں سے کئی انگشت دُور رہتا ہے۔ اور پلکیں ہلنے جُلنے میں آزاد رہتی ہیں۔ تاہم یورپین ڈاکٹروں کی شکایت ہے کہ اس نقاب کے فیشن سے آنکھوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

ایشیائی نقاب کی نسبت خبر نہیں کہ اس کا رواج کب اور کہاں سے شروع ہوا اس کی مختلف صورتیں اور مختلف نام ہیں۔ مگر مقصود صرف ایک ہے کہ رُخ غیر نظروں سے بچایا جائے۔ ترکوں۔ عربوں۔ ایرانیوں میں نقاب کے الگ الگ طریقے ہیں۔ کہیں ایک لمبی چادر سر سے پیر تک لپیٹ لی جاتی ہے۔ اس طرح کہ ماتھا۔ ٹھوڑی۔ ناک تو ڈھک جائے اور آنکھیں کھلی رہیں۔ کہیں بُرقع ہوتا ہے جس میں ماتھے کے قریب ایک چھوٹا سا کپڑا ٹانک دیتے ہیں جو چہرہ کو بخوبی ڈھک سکے۔ اس کپڑے میں چند سوراخ ہوتے ہیں۔ جنکے سبب آنکھیں اپنا کام کرسکتی ہیں۔

مگر کسی ملک میں نقاب کے افسانے فارس کی طرح عوام کے زبان زد نہ ہونگے۔ وہاں کے شعرا نے اس فضا سے ٹکڑے پر بڑی بڑی طبع آزمایاں کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں ایران کے اُمَرد لڑکے بھی نقاب ڈالتے تھے۔

عرب کی شریف زادیاں منہہ پر نقاب ڈال کر بازاروں میں چلتی پھرتی اور خرید فروخت کرلیتی ہیں اسی کے قریب ایران اور ترکستان کی نسبت مشہور ہے۔

نقاب پوشی ایشیائی شرم وحیا۔ عفت وعصمت کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ جس کے باعث عورتیں آزاد رہکر بدنگاہوں سے محفوظ رہتی ہیں۔

ہندوستان جس کی نسبت مشہور ہے کہ مسلمانوں کی صحبت سے یہاں پردہ کا رواج ہوا۔ ہزاروں برس سے گھونگٹ نکالنے کا عادی ہے۔ ممکن ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں اس کی عادت نہ ہو مگر اکثر مقامات پر اس کے وجود کا پتہ لگتا ہے۔

لکھا ہے کہ مہاتما بدھ کے ظہور سے پہلے ہند میں گھونگٹ کی رسم موجود تھی۔ چنانچہ جب انکی رانی گوپا نے اس رسم کو ترک کردیا تو تمام ملک میں ایک عام چرچا اور غل پڑ گیا تھا۔ ہندوستان کے نامی گرامی شعرا کے کلام میں گھونگٹ کا بڑے لطیف اور پُر درد لفظوں میں ذکر پایا جاتا ہے۔ یہاں آجتک گھونگٹ کا طریقہ جُوں کا تُوں موجود ہے۔

ہندوؤں میں ادنیٰ اور متوسط درجے کی عورتیں باہر چل پھر سکتی ہیں جن میں گھونگٹ عرب و ایران کی نقاب کا کام دیتا ہے۔ مگر گھونگٹ میں کئی خرابیاں ہیں جو نقاب میں نہیں۔ گھونگٹ اوڑھنی یا چادر کے اس سرے کا نام ہے جو سر پر سے کھسکا کر چہرہ پر جھکا لیا جاتا ہے۔ جو کبھی آدھے چہرے اور کبھی تمام چہرے کو ڈھک لیتا ہے۔ چونکہ اس میں آنکھوں کے لئے کوئی روزن نہیں ہوتا بیچاری عورتیں ایک ہاتھ سے گھونگٹ اٹھا کر راستہ چلتی ہیں۔ اور انہیں بڑی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔

دستور ہے کہ بیاہی ہوئی لڑکیاں اپنے میکے کے آدمیوں یہانتک کہ میکے کی آبادی کے تمام مردوں سے منہہ نہیں چھپاتیں۔ مگر سسرال میں جاکر ان کو سب کے سامنے گھونگٹ

نکالا پڑتا ہے۔ اور بیچاریاں اس پر تمام عمر کاربند رہتی ہیں۔ نقاب اور گھونگٹ کے ان ظاہری معنوں کے بعد ذرا باطنی معانی پر بھی نظر ڈالنی چاہئے۔ یہ تمام موجوداتِ عالم جس کو جسم کی آنکھیں محسوس کرتی ہیں ایک پردہ نشین کی نقاب اور ایک حیادار کا گھونگٹ ہے۔

خود ہمارا جسم نقاب ہے۔ ہماری ظاہری زندگی گھونگٹ ہے۔ جو نظرباز ہیں پردۂ نقاب اور حجابِ گھونگٹ اُٹھنے کے متمنی رہتے ہیں۔ اور اُن کی یہ آرزو عوام میں عرفان کہلاتی ہے۔

مہاتما بُدھ کا جنہوں نے اسرارِ باطن کے بہت سے پردے اُٹھائے تھے اُن کی آنی پر ذرا سا پرتو پڑا تھا جو انہوں نے اس ظاہری گھونگٹ کو اُٹھا ڈالا۔ اگر کوئی کامل نظر پڑ جاتی تو گویا کا بھی بیڑا پار تھا +

حسن نظامی (دہلوی)

دُنیا

چمن جنسِ خار ہے دُنیا — خونِ صد نو بہار ہے دُنیا
زندگی نام رکھ دیا کس نے — موت کا انتظار ہے دُنیا
ہے نسیمِ جہاں خزاں پرور — دیکھنے کو بہار ہے دنیا
ہے تمنا فزا ہوائے جہاں — کیا شکستِ خمار ہے دنیا
خون روتا ہے شوقِ منزل کا — رہزنِ رہ گزار ہے دُنیا
جان لیتی ہے جستجو اس کی — دولتِ زیر مار ہے دنیا
یاس و امید کا بلاوا ہے — کوئی جاتی بہار ہے دنیا
خندہ زن ہے فلک زدوں پہ جہاں — چرخ کی رازدار ہے دنیا

ہیں جہاں کو غموں کے خار پسند
اس چمن کو نہیں بہار پسند

(سید نذیر حسین) — ([illegible] بیگ)

موت

حوادثِ زندگی میں موت بھی نہایت دلچسپ واقعہ ہے۔ عام حادثۂ زندگی ہونے کی جہت سے اُس کے حقائق پر بہت کم غور و تامل کیا جاتا ہے۔ روز دس پانچ آدمیوں کو مرتے دیکھنے اور سُننے سے ہمارے کان اور آنکھ اس کے ایسی عادی ہو گئے ہیں کہ دم بھر کے لئے بھی ہم اپنے ذہن کو اُس کی ماہیت دریافت کرنے کے لئے رجوع نہیں کر سکتے۔ جب ہم کو بھی اوروں کی طرح ایک دن مرنا ہے تو خیالِ موت قبل از موت واویلا ہے۔ حقیقت میں اس کا نام تک لینا بسا اوقات ناگوار ہوتا ہے۔

موت کی علامات اور تکالیفِ نزع اور دم نکلنے کا وقت مرنے والے کے بُشرہ کے مکروہ آثار اور جسم کی غیر ارادی حرکات دیکھ کر بیساختہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مرنے میں بہت سختی اور ایذا ہوتی ہے جس کے مقابلے میں دُنیا کی اور تکلیفیں ادنیٰ اور حقیر ہیں۔ جس قدر خوف ہم کو موت سے ہے وہ زیادہ تر بلحاظِ مشاہدہ احوال کے ہے جو مرنے کے وقت یا قریب مازموت کے ہم مریضوں کا دیکھتے ہیں۔ محبوب صورتوں اور چیزوں کی جدائی ایک لمحہ کے لئے شاق ہوتی ہے تو پھر بھلا اس رنج کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے جو مرنے والے کو مرنے کے وقت ہوتا ہے۔ جب وہ نگاہِ حسرت سے اپنی عمر بھر کی کمائی کی طرف اور آشنا چہروں کی جانب دیکھے اور یہ خیال کرے کہ کوئی دم میں ہمیشہ کے لئے اُن سے بچھڑ جاؤں گا۔ خواہ یہ تکلیفِ نزع ہمارے اعمالِ سابقہ کے نتیجے ہوں یا رنجِ مفارقت احباب کا باعث ہو۔ لیکن موت ایک عظیم واقعہ ہے اور اس کی عظمت نہ اس وجہ سے ہے کہ اس کے عارض ہونے سے ہمارا شمار مُردوں میں ہونے لگتا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ یہ بعض لوگوں کا مُدعا اور مقصودِ خاص ہے۔ ہزاروں مفلس روز طلبگارِ موت رہتے ہیں اور افلاس و تنگدستی کے سامنے موت کو ہیچ جانتے ہیں۔ سینکڑوں مریض صعوباتِ مرض سے تنگ آکر آمادۂ موت ہو جاتے ہیں

اور بہت سے ذی آبرو و اہلِ حمیت ننگ و عار سے بچنے کے لئے اسکو اختیار کر لیتے ہیں۔ بہت سے مجاہد اشاعتِ دین کے لئے لڑکر مر گئے۔ بہت سے عاشقوں نے اپنے معشوقوں کے کہنے پر اپنی جانیں دے ڈالیں۔ ہزاروں جنرل شہرت حاصل کرنے کے لئے مر گئے۔ ان سب کا مقصود طلبِ موت یا سعی الی الموت سے یہ تھا کہ جس حالت میں وہ تھے اُس سے مرجانے کو بہت زیادہ آسان جانتے تھے۔ ان لوگوں کے نزدیک موت میں زیادہ لذت تھی بمقابلہ اس حالت کے جس کا ذائقہ اُن کے مذاق کے مخالف تھا اور جس چیز کو مر کر حاصل کیا وہ اُن کو جانوں سے زیادہ عزیز تھی۔ پس موت میں ایک ایسا اسرار ہے جو کسی طرح ظاہر نہیں ہوتا کبھی لوگ اس سے خائف بھی پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی اس کی آرزو میں دست بدعا۔ یہ ایک عجیب امر ہے خوف و رجا اس سے دونوں وابستہ ہیں۔

اگر موت میں تکلیف ہے تو نامرد و بہادر دونوں کے لئے یکساں ہے اور اگر کوئی تکلیف نہیں ہوتی تو خوف بیفائدہ ہے علاماتِ موت بعنوان و اشکالِ مختلف ظاہر ہوتی ہیں۔ ہر چند کبھی دو مرنے والوں کی حالت علامات کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتی۔ مگر بعض علاماتِ عامہ ایسی ہیں جو اکثر موت کے وقت ظاہر ہوتی ہیں۔ مثلاً ناک کا خمیدہ ہوجانا۔ پاؤں کا سرد ہونا اور سردی کا اوپر کی طرف چڑھنا مریض کا کپڑوں کو نوچنا۔ آواز میں گرانی آجاتی ہے۔ کلام بتکلف کیا جاتا ہے۔ سانس لینے میں دقت ہوتی ہے۔ بصارت کم ہوجاتی ہے۔ آخرالامر دل کا فعل ہمیشہ کے لئے بند ہوجاتا ہے اور اسی سے مرادِ ہلاکت ہے۔

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ موت لامحالہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر کوئی وجہ ہمارے پاس نہیں کہ ہم خیال کریں کہ مرنے میں پیدا ہونے سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ یہ خیال زیادہ تر اس وجہ سے ناشی ہوتا ہے کہ مرتے وقت چند حرکات غیر اختیاری اور نیز چہرہ کا بگاڑ واقع ہوتا ہے لیکن یہ بات نہایت صحت کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان حرکات و تشنج اور بشرہ کے مکروہ آثار سے ہم کو مطلق تکلیف نہیں ہوتی بلکہ اکثر تو اس طرح واقع ہوتے ہیں کہ ہم کو اُن کا علم بھی نہیں ہوتا۔

ہمیں قیصر جولیس کا قول یاد رکھنا چاہیے کہ نامرد ہر روز مرا کرتا ہے لیکن بہادر صرف ایک مرتبہ موت کا مزہ چکھتا ہے۔ جو اس دنیا میں آیا ہے وہ ضرور ایک دن موت کا شکار ہوگا۔ ؎

ہر آں کہ زاد بناچار بایدش نوشید ز جام دہر مَے کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ

سوائے ذاتِ خداوندی کے اور کسی کو بقا نہیں ؎ نہ گل ہیگی نہ گل میں ہیگی بو باقی۔ خدا باقی ہے یا ہیگی تو ہوگا تو باقی

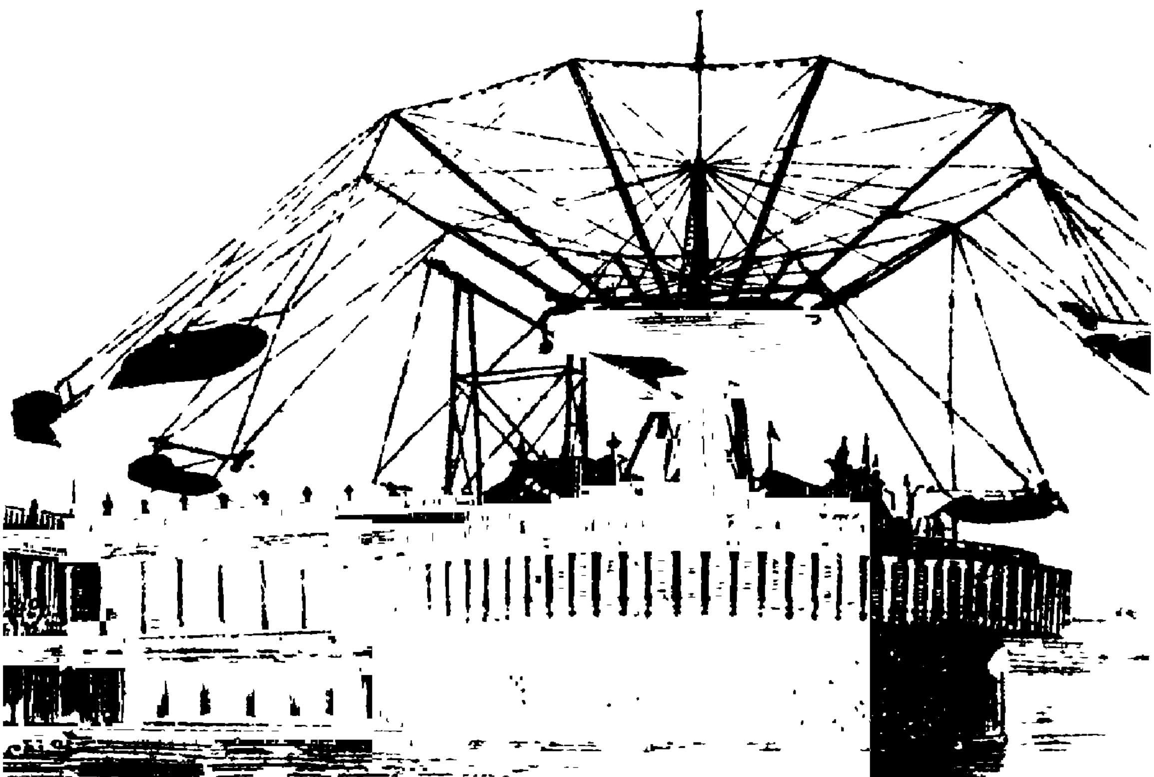
محمد شفیع الدین خان مرادآبادی

اطالین نمائش

جن ذرائع سے مغربی دُنیا میں علوم و فنون کی ترقی کی کل کو چلایا گیا ہو۔ اُن میں ایک مقبول اور دلپسند ذریعہ نمائشیں ہیں۔ نمائشیں کئی طرح کی ہوتی ہیں۔ سب سے اعلیٰ تو وُہ ہیں جو مختلف مُلکوں کی متفقہ کوشش کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اور تمام شائستہ دنیا پر کم و بیش اثر ڈالتی ہیں۔ زمانہ حال میں اس قسم کی نمائشوں میں چکاگو کی مشہور نمائش۔ پیرس کی عالمگیر اگزبشن اور سب سے نئی سنٹ لوئس کی نمائش قابلِ ذکر ہیں۔ یہ نمائشیں تو تاریخی یادگاریں ہیں اور جب اقوامِ مغرب کی ترقی کی تاریخ لکھی جائیگی تو اُس میں ان نمائشوں کے سال سنگِ نشان کا کام دینگے۔ ان کے لئے روپیہ اس قدر درکار ہے۔ کہ اکثر مغربی قومیں باوجود اپنے تمول کے ان کے مصارف سے عاجز آتی جاتی ہیں اور یہی وجہ ہو کہ سنٹ لوئس میں خاطر خواہ مالی کامیابی نہیں ہوئی۔ اس لئے ان نمائشوں کا مفصل تذکرہ ہم غریبوں کے لیے جو ایک نادار مُلک میں پیدا ہوئے ہیں۔ مفید نہیں۔ ہم ابھی اُس مقام سے جس کا تقاضا ایسی نمائشوں کا اہتمام ہوتا ہو منزلوں دُور ہیں۔ ان کے سوا یورپ اور امریکہ میں کئی نمائشیں بعض فنون کے لئے مخصوص ہوتی ہیں۔ مثلاً زراعت کی نمائش جُدا۔ جس میں مختلف قسم کے بیج۔ کھاد۔ آلات کشاورزی اور دیگر اسبابِ زراعت دکھائے جاتے ہیں۔ دُودھ اور مکھن کی نمائش الگ۔ جس میں مختلف کارخانوں کو باہمی مقابلہ کا علیحدہ موقعہ دیا جاتا ہو۔ پنساری اور عطار اپنی نمائش علیحدہ رکھتے ہیں۔ فوجی نمائش جداگانہ ہو۔ تصویروں کی نمائش ایک مستقل چیز ہے۔ جس میں صاحبانِ فن اپنا کمال دکھاتے ہیں۔ غرض ہر پیشے اور ہر ہُنر کے لوگ اپنی اپنی ترقی کی تدابیر کرتے رہتے ہیں۔ مگر ان دونوں قسموں کے علاوہ ایک اَور قسم نمائش کی ہو۔ جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں کو چھوٹے سے پیمانے پر واقفیتِ عامہ بڑھانے کا موقعہ مل جائے اور ساتھ ہی تفریح کا مقصد بھی حاصل ہو۔ یہ نمائشیں ہمارے ہاں کے میلوں کا جواب ہیں۔ اور انہیں مہذب میلوں کا لقب

دیا جاسکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ کہ میلا ایک دو دن کی دل لگی۔ چند گھنٹوں کی گھبراہٹ۔ جانے کی دھوم دھام۔ واپس آنے کی مارامار۔ دھکے کھانے کے لُطف اور بدپرہیزی کرنے کی اجازت کا نام ہوتا ہے اور اس کا مقصد صرف تفریح ہوتا ہے۔ جو بچپن اور آغازِ شباب تک تو اس سے حاصل ہوتی رہتی ہو۔ لیکن اس کے بعد دن بدن زائل ہونے لگتی ہو اور آخر جاتی رہتی ہو۔ مگر یہ مہذب میلے ہفتوں بلکہ مہینوں رہتے ہیں۔ لوگ اطمینان سے اُن میں جاتے ہیں بےفکری سے اُن میں چلتے پھرتے ہیں۔ ہر طرح کے تماشے اور دلچسپی کے سامان ایک احاطے کے اندر جمع ہیں جن سے ہر شخص حسبِ مذاق و توفیق فائدہ اُٹھا سکتا ہی اور اُن میں جانا اور اُنہیں دیکھنا سیر کی سیر اور تعلیم کی تعلیم ہوتی ہے۔ لندن کے اس قسم کے میلوں میں سے ایک میلا چند ہفتے ہوئے ختم ہوا ہے۔ جب میں مئی کے مہینے یہاں آیا تو شروع تھا اور اکتوبر کے اخیر تک رہا۔ اس میلے کی ترکیب یہ ہو کہ ایک وسیع احاطہ اس کے منتظموں نے گھیر رکھا ہے۔ جس کا نام ارلز کورٹ ہے۔ اس میں ہر سال نئی نمائش ہوتی ہو۔ جو کئی مہینے تک رہتی ہے۔ چند سال ہوئے یہاں پیرس کی زندگی کا نقشہ دکھایا گیا تھا۔ اس کے بعد ایک برس یہاں "نمائش آتش" تھی جس میں مکانات کا جلنا۔ آگ بجھانے والی فوج کا مستعدی سے اُن کے بچانے کو دوڑنا۔ اور جانفشانی سے لوگوں کے جان و مال کو بچا لینا دکھایا گیا تھا۔ اس مرتبہ ملکِ اطالیہ کی باری تھی۔ اور نمائش میں جانا یہ معنے رکھتا تھا کہ آپ اچانک آنکھ بند کر کے اطالیہ کے مشہور مقامات میں سے کسی کی سیر کر رہے ہیں۔ داخل ہوتے ہی دربان اطالیہ کے لباس میں ملبوس نظر آتے تھے۔ دوکانیں وہیں کی سنگتراشی، معموری۔ اور دیگر صنعتوں کے نمونوں سے پُر ہیں۔ جہاں کہیں لوگوں کے واسطے کھانے پینے کا سامان مہیا کیا گیا تھا۔ وہاں خادم اور خادمہ خاص وردیاں پہنے تھے۔ جن کی کاٹ تراش اطالیہ کی وضع کی نقل تھی۔ احاطہ کی دیواریں رنگا رنگ کی پردوں کی بنی تھیں۔ جن پر اطالیہ کے، قدرتی مناظر کے نقشے آنکھ کو دھوکا دیتے تھے۔ کہ گویا سچ مچ جنوب یورپ کے مناظر دیکھ رہی ہے۔ احاطہ کئی حصوں میں منقسم تھا۔ جن میں سے بعض حصے مسقف

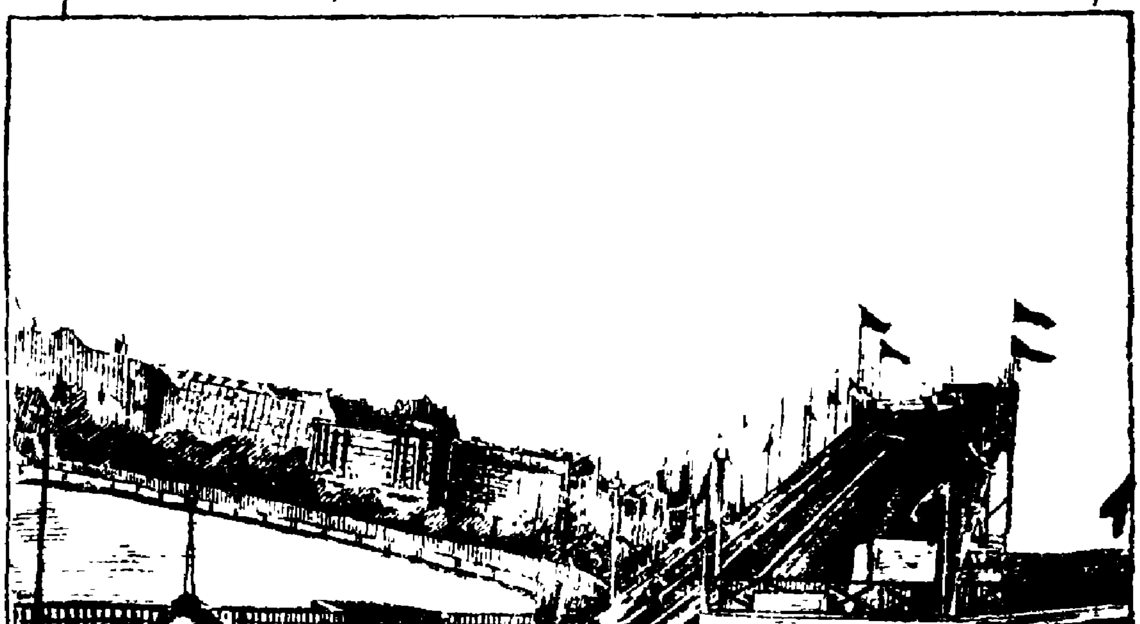
تھے اور بعض کھلے۔ مسقف حصوں میں صناعی کی نمائش اور دوکانیں تھیں اور کھلے حصوں
میں سیر تفریح کی باتیں۔ ایک صحن پھولوں کی کیاریوں سے رشکِ گلشن بنا ہوا تھا اور اس کے
وسط میں بینڈ کے لئے جگہ تھی۔ جہاں مقررہ اوقات پر ہر روز باجا بجتا تھا اور موسیقی کے
دلدادہ اس کے گرد کرسیوں پر بیٹھے باجا سنتے رہتے تھے۔ مگر جو حصہ اس نمائش کا مجھے
سب سے دلچسپ معلوم ہوتا تھا وہ ایک اور صحن تھا۔ جو دو بلند عمارتوں کے درمیان واقع تھا
اور جس میں ایک خوبصورت حوض صاف پانی سے لبالب بھرا رہتا تھا۔ اِس حوض کے
دونوں طرف ایک نہر سی بنی ہوئی تھی اور اس کے وسط میں ایک کل تھی۔ جسے اُڑنے کی
کل کہتے تھے۔ اِس کی صورت کا کچھ اندازہ مندرجہ ذیل نقشے سے ہو سکیگا۔ کشتیاں سی جو



نظر آتی ہیں۔ ان میں لوگ بیٹھ جاتے تھے۔ یہ کشتیاں نہایت مضبوط رسّوں سے آویزاں تھیں اور
اُن تمام رسّوں کے سرے ایک بڑے ستون کے سرے سے لوہے کے حلقوں کے

ذریعے بندھے تھے۔ یہ ستون دُخانی کل کے ذریعہ سے گھومتا تھا تو ساری کشتیوں کو حرکت ہوتی تھی۔
یہاں تک کہ چکر کھاتے کھاتے ایسا درجہ آ جاتا تھا کہ کشتیاں ہوا میں اُڑتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس
کل کا اصول بالکل وہی تھا۔ جو اُن چکروں کا ہوتا ہے جو ہمارے ملک میں عام میلوں پر موجود
ہوتے ہیں اور جن کے ذریعہ سے کاٹھ کے گھوڑے جن پر شوقین لوگ سوار ہوتے ہیں۔
گھومنے لگتے ہیں۔ مگر اسی خیال کی ترقی سے ایسی نفاست پیدا ہوئی تھی کہ اس مشین کو دور
سے چلتے دیکھنا نہایت ہی مزا دیتا تھا اور اس میں سوار ہونا اُس سے زیادہ دلچسپ تھا۔
اور اسی لئے نہ صرف تماشائیوں کا ایک گروہ کثیر اس کے گرد جمع رہتا تھا۔ بلکہ سوار ہونے
والوں کا بھی ہجوم ہوتا تھا اور میرا خیال ہے کہ سارے تماشوں میں یہی سب سے مقبول
تھا اور اس کے مالک کو سب سے زیادہ نفع ہوا۔ حوض کے وسط میں اس کا نصب ہونا
اس کے لطف کو دوبالا کرتا تھا اور رات کے وقت جب حوض پر چاروں طرف سبز و سرخ شیشوں
میں چراغ جلتے تھے اور سارے صحن میں روشنی ہوتی تھی تو اس مشین کی سیر عجب بہار دیتی
تھی۔ اس پر بیٹھ کر گھومنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ رنگین روشنی کی مسلسل قطاریں چکر لگا رہی ہیں۔
ایک عجیب بات اس کے متعلق یہ تھی کہ اس میں میمیں بکثرت سوار ہوتی تھیں۔ گو میں نے کئی
مردوں کو اس سواری سے گھبراتے دیکھا اور یہ کہتے سنا کہ خواہ کتنی ہی احتیاطیں کی گئی ہیں
پھر بھی خطرناک ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان میں عورتیں عموماً بزدلی کی کمزوری
سے خالی ہیں اور بہت سے مردانہ کھیل شوق سے کھیلتی ہیں۔ سمندر میں غوطے لگانا۔ پہاڑوں
کی چوٹیوں پر چڑھنا ان کے لئے ایسا ہی آسان اور اُنکو اتنا ہی مرغوب ہے جتنا مردوں کو۔ مگر
طرفہ یہ ہے کہ ان کشتیوں میں سوار ہوتے وقت یا اور کسی ہنسی خوشی کے موقعے پر اظہار
نزاکت سے بھی دریغ نہیں کرتیں اور کشتیوں کے چلتے ہی وہ چیخیں مارتی ہیں۔ کہ اگر چیخوں کے
بعد فوراً قہقہے کی آواز تسلی نہ دیدے تو سننے والے ڈر جائیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا۔
اس حوض کے پانی سے دو اور کام لئے گئے تھے۔ اس کے دونوں طرف نہریں

سی نکلتی تھیں - اُن میں سے ایک کے اختتام پر ایک ڈھلوان آہنی سڑک بنی تھی - جس کے نیچے مضبوط لکڑی کی شہتیریوں سے ڈھلوان فرش بنایا گیا تھا - اس سڑک پر ایک پیون والی کشتی بجلی کے دم سے چلتی تھی اور ڈھلوان سے زور شور کے ساتھ اُترتی ہوئی دھم سے پانی میں گرتی تھی اور گر کر جھاگ اُچھالتی ہوئی اُچھلتی تھی اور پھر نہر میں تیرتی ہوئی کنارے جا لگتی تھی - اس کا بھی ایک دھندلا سا نقشہ ہدیۂ ناظرین ہے - اس کھیل کو بھی قبولِ عام کا فخر حاصل تھا اور رونق

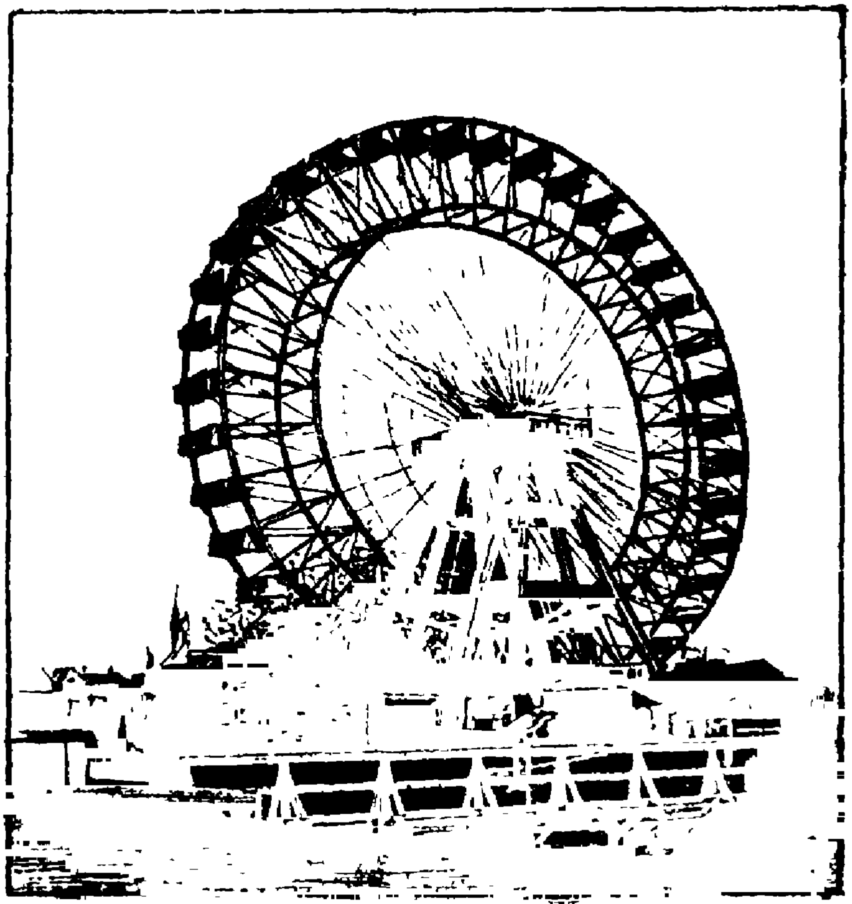


کے دِن تو ہزاروں آدمی دن بھر میں اس میں سوار ہوتے تھے - اور کشتی اُوپر سے ایسی ترکیب سے گرائی جاتی تھی کہ کسی کو بھی دھماکے سے نقصان نہیں ہوا حالانکہ بظاہر اس کا ڈھلوان سی لڑھکتا ہوا آنا اور اُمپائی میں گرنا سخت خوفناک معلوم ہوتا تھا - اسی نہر کے دُوسرے حصّے سے یہ کام لیا گیا تھا کہ وُہ ایک مصنوعی غار میں سے ہو کر گذرتا تھا - جو اطالیہ کی قدرتی غاروں کی نقل تھی - اور جس کے اندر لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر ہوا آتے تھے - ان غاروں کو گروٹو کہتے ہیں اور ان کی

ساخت اس قسم کی ہوتی ہے۔ کہ کہیں کہیں روشنی کی شعاع اندر آ گھستی ہے اور طرح طرح کے رنگ نظر آتے ہیں۔ اور کہیں بالکل تاریکی ہوتی ہے۔ سیاح اِن غاروں میں بڑی خوشی سے گھستے ہیں۔ اِس شوق کو ایک چھوٹے پیمانے پر پُورا کرنے کا سامان یہیں کر دیا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں تھوڑی دُور ایک اور جگہ تھی جسے دیکھ کر یہ گمان ہوتا تھا کہ ملکِ اطالیہ کا کوئی ٹکڑا کاٹ کر کسی جادو کے ذریعے سے لندن میں لا کر سجا دیا ہے۔ یعنی وہاں کے مشہور تاریخی شہر وینس کی نقل پیش کی گئی تھی۔ اس مصنوعی وینس کے دروازے کے اندر جاتے ہی کیا نظر آتا تھا؟ جنوبی یورپ کا صاف نیلگون آسمان۔ اُس پر بیشمار تارے۔ گلی کوچوں کی بجائے پانی کی نہریں رواں تھیں۔ جن میں کشتیاں چل رہی تھیں اور لوگ اُن میں بیٹھ کر دوستوں کو ملنے ایک گھر سے دُوسرے گھر جاتے تھے اور دوکانوں سے سودا سلف خریدتے تھے۔ کشتی والے اپنی دُھن میں کچھ الاپتے جاتے تھے اور کشتی کو کھیتے جاتے تھے۔ مکانوں کا نقشہ ہُو بہُو وینس کا تھا اور وسطِ شہر میں ایک چوک تھا جہاں خاص اطالیہ کے گویّوں کی ایک جماعت وہیں کی زبان میں پیارے پیارے گیت گا رہی تھی۔ یہ ایسے گیت تھے جو ہمارے ایشیائی راگوں سے بہت ملتے۔ اور انگریزی طرزوں سے بالکل جُدا تھے۔

اُڑنے کی مشین اور پانی میں گرنے والی کشتی کچھ اس نمائش کی خصوصیات میں نہ تھیں کرسٹل پیلیس میں بھی موجود ہیں۔ مگر یہاں زیادہ اچھی بنائی گئی تھیں۔ لیکن گرد دُنیا کی سیر اور وینس کا نقشہ یہ اسی کا خاص حصّہ تھیں اور کہیں اور نظر نہ آسکتی تھیں۔ ان کے سوا ایک بڑی خصوصیت اس نمائش کی ایک بہت ہی بڑا پہیہ ہے۔ جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ پیرس کے ایفل ٹاور کا جواب ہے۔ اس کی بلندی کا یہ حال ہے کہ اگر اُن گاڑیوں میں جو اس میں لگی ہیں بیٹھ جاؤ اور یہ گھمایا جاوے۔ تو جس وقت آپ انتہائے بلندی پر پہنچ جاویں تو لندن باوجود اپنی وسعت کے آپ کی آنکھ کی پتلی میں سما جائے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ سیر بہت مقبول نہیں ہوئی اور اس کثیر خرچ کے اعتبار سے جو اس کے بنانے میں ہوا ہوگا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ بنانے والے کو بہت فائدہ ہوا ہو۔ تاہم یہ پہیہ بھی چلتا

ہی رہتا تھا۔ اور کچھ نہ کچھ لوگ اس پر بھی سوار ہو ہی لیتے تھے۔ ایک دفعہ عجب تماشا ہوا۔ لوگ اس پر سوار تھے اور بیشتر اوپر کی طرف حرکت کر چکے تھے کہ پہیے کی کل بگڑ گئی اور حرکت بند ہو گئی۔ جو اوپر تھے وہ اوپر رہ گئے۔ اور چونکہ رات کو کل کی مرمت نہیں ہو سکی۔ اس لئے انہیں صبح تک آسمان اور زمین کے درمیان بے خواب و خور معلق رہنا پڑا۔ نقصان تو سخت نہ ہوا۔ کیونکہ خدا کے فضل سے جانیں بچ گئیں۔



اور کمپنی والوں نے سب صاحبان کو پانچ پانچ پونڈ بطور ہرجانے کے نذر کئے۔ بعض لوگ تو ان میں ایسے تھے کہ انکی تکلیف کا یہ کافی معاوضہ نہ تھا۔ لیکن بہت سے ایسے تھے جن کے وسائل محدود تھے اور انہیں ایک رات کی تکلیف کے عوض میں ستر اسی روپیے مل جانا غنیمت معلوم ہوا۔ شہر بھر میں اس واقعہ کا کئی دن چرچا رہا۔ اور لطیفہ یہ ہوا کہ اس واقعے کے بعد بجائے پہیے کی طرف

رجوع کم ہونے کے چند دن تک ایک کثیر تعداد لوگوں کی اس میں سوار ہونے کو آتی رہی - اس خیال سے کہ اگر پھر کوئی ویسی ہی دقّت پیش آئے تو پانچ پانچ پونڈ ملیں - مگر نہ ایسی اُفتاد روز ہوتی ہے اور نہ ایسی رقم بے محنت آئے دن ہاتھ لگتی ہے -

اس قسم کی بہت سی کھیل تماشے کی چیزیں تھیں - جن کے ذریعے سے ہزارہا پونڈ روز نمائش گاہ میں آتے تھے - مگر کچھ کھیل تماشے کی چیزوں پر ہی تماشا ختم نہ تھا - اِسی نمائش میں اطالیہ کی بندوقوں اور توپوں کے نمونے تھے - جن سے ملک کے اسلحہ اور اُس کی جنگی حالت کا پتہ چلے اسی میں وہاں کی تصاویر تھیں - جن سے فنِ نقاشی کی ترقی کا حال کھلے - اسی میں سنگ مرمر اور دُوسرے پتھروں کے خوبصورت اور سڈول بُت تھے - جو سنگ تراشی کے اعلیٰ نمونے کہلا سکتے تھے - اِسی میں لکڑی کا اچھا اچھا کام تھا - اور اسی میں طالیہ کی دوسری صنعتوں کے نمونے دکھلائے گئے تھے - کہیں سوتیاں تیار ہو رہی تھیں - کہیں شیشے اور بلّور کا کام دیکھنے والوں کے سامنے بنایا جاتا تھا - کہیں چکنی مٹی کے چھوٹے چھوٹے بُت ایک شخص اس خوبی سے منٹوں میں بنا کر رکھتا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی تھی - غرض سارا میلا ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا - اور اس کی بہت سی باتیں ایسی تھیں - جو قابلِ تقلید معلوم ہوتی تھیں - تاکہ ہم لوگ اگر میلوں کے بغیر گزارہ نہ کر سکیں اور فطرتِ انسانی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاید نہ کر سکینگے تو اتنا تو ہو کہ جو کچھ کیا جائے سلیقے سے کیا جائے اور اس میں کچھ فائدہ مدِّنظر رکھ لیا جائے +

عبد القادر (از لندن)



چاند کا منظر

اس مضمون میں میں چاند کے خوفناک سین پر جو قوی دُوربین لگا کر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے اور انسان کے دل پر عجب حیرت انگیز اور پُرہول اثر ڈالتا ہے ایک مختصر نظر ڈالتا ہوں۔ دُوربین لگا کر چند ساعت نظر جمائے رہنے کے بعد چاند کا ہوش رُبا منظر جس کی خوفناک خاموشی دیکھ کر انسان اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے نظر آنا شروع ہوتا ہے۔ شادابی و سرسبزی کا کیا ذکر مُردار پہاڑوں کی بھوت کی سی ہولناک صورت دکھائی دیتی ہے۔ ان پہاڑوں کا سلسلہ جن میں حیوانات و نباتات کی سکونت و پرورش کا کچھ پتہ نہیں چلتا دُور دُور تک سانپ کے بل کی طرح بل کھاتا ہوا پھیلتا چلا گیا ہے۔ اور ان کے بیچ بیچ آتش فشاں پہاڑ جن میں سیاہ کونین اور غار محسوس ہوتے ہیں اور جنکو دیکھ کر گیلی لیو نے طاؤس کی آنکھوں سے تشبیہہ دی تھی۔ حلقہ حلقہ نظر آتے ہیں۔ غرض چاند میں پہاڑوں کا ایک گورکھ دھندا نظر آتا ہے۔ یہاں پر انسان کی حیرت زدہ نظر ٹھہر جاتی ہے اور وہ انکے باطنی حال دریافت کرنے کی بیکار کوشش کرتا ہے۔ پھر بیچارہ انسان مایوس ہو کر ظاہری سماں پر نظر دوڑاتا ہے اور قیاس و فکر سے کام لے لیکر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے۔ کوئی مینار سیدھا مینار کی طرح کھڑا اور کوئی مخروطی شکل کا سربریدہ پیالے کی طرح مُنہ کھولے ہوئے نظر آتا ہے۔ ان پہاڑوں میں ایسے ایسے مہیب تاریک کنڈ اور پُرہول اندھیرے غار محسوس ہوتے ہیں کہ اگر فاصلے کے ساتھ اطمینانِ قلب نہ ہوتا تو دیکھ کر انسان کا دم نکل جاتا۔ اِس خوفناک منظر کو دیکھتے بھالتے جب نگاہ پہاڑوں کی جڑ کی طرف جا پڑتی ہے تو عجیب و غریب وادیاں نظر آتی ہیں۔ جنمیں تمام حجر نشفہ یعنی لاوا کے سنگریزے اور کُل معدنیات کے منجملہ پرت محسوس ہوتے ہیں اور یہ ایّام ماضیہ بعید کی خبر دیتے ہیں۔ جس وقت چاند زمین کی طرح آباد سیارہ تھا اور اُس میں حرارت غریزی باقی تھی۔ جس کی وجہ سے چاند کے آتش فشاں پہاڑ جن کا بے جان ڈھیر آج ہم دم بخود خاموش پاتے ہیں ہیجان اور جوش میں آتے تھے۔ چاند میں زلزلہ آتا تھا۔ اور آتش فشاں پہاڑوں سے خاکستر۔ خاک۔ انگارے غٹ کے غٹ بخارات۔ پگھلے ہوئے معدنیات۔ جلتا ہوا مائع مارے گرمی کے بھبکتا ہوا

بطن قمر سے جوش کھا کر اُبلتا تھا اور سینکڑوں کوس اک آگ کا دریا بہتا ہوا چلا جاتا تھا جس کو آج ہم منجمد حالت میں مرا ہوا زبان نکالے پاتے ہیں۔ اور زیادہ غور و تامل سے یہ بات معلوم ہوتی ہو کہ جُوں جُوں چاند کی حرارت زائل ہوتی گئی اس کے ساتھ ساتھ آتش فشاں پہاڑوں کا جوش بھی کم ہوتا گیا اِس لیے کہ جو آخر وقت میں مائع اُبل کر پہاڑوں کی ڈھلان سے نیچے کو بہا ہے وُہ تھوڑی ہی دُور جاتے جاتے تھم گیا ہے۔

غرض اس حیرت انگیز سین کو دیکھ کر ہمارے دماغ میں خیالات کا ایک طُوفان اُٹھتا ہو اور چاند کے گذرے ہُوئے حالات کو جو زمانہ ماضیہ کی گھنگھور تاریکی سے آلودہ ہو جاننے کے لئے ہمارا جی تڑپ جاتا ہو اور بیساختہ ہماری زبان سے یہ مصرع نکلتا ہے۔

دَوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایّام تو (اقبال)

پھر جب قوتِ متخیلہ تھک جاتی ہے اور ہمارا ذہن ان خیالات کی طرف منتقل ہوتا ہو تو مایوس حیرت زدہ نگاہ دُوسری طرف جا لگتی ہے اور چاند کے مشرقی بازو پر ایک بہت بڑا کھانچا نظر آتا ہو جس پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں اس کی گہرائی پچاسوں ہزار فیٹ تھی مگر اب وُہ پہاڑوں کی بڑی بڑی چٹانوں کے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے سے بھرتا جاتا ہے۔ اس کھانچے کے اندر جس کا پیٹ اندر سے اُبھرا ہُوا ہے سیاہی مائل سبزی نظر آتی ہو اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بھیگے ہوئے پتھروں پر سبز کائی جمی ہو۔ یہ دلفریب رنگ جس کو دیکھ کر ایک ٹکٹکی سی بندھ جاتی ہو ہم کو کسی کسی قسم کے نباتات کے وجُود کا گمان دلاتا ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ خیال گذرتا ہو کہ پانی اور ہوا بغیر جس کے وجود کا چاند میں کوئی نشان نہیں ملتا نباتات کا پرورش پانا اور اسکا زندہ رہنا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ کیا خُوب کسی نے اس اعتراض کو دفع کرنے کے لئے اس بلا کے نکتے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ممکن ہو کہ چاند میں کاربونک ایسڈ گاس جو آتش فشاں پہاڑوں سے ہیجان اور جوش و خروش کے وقت بخارات کے ساتھ کثرت سے خارج ہوتا ہو اور جو نباتات کو پرورش کرنے میں شیر مادر کا کام کرتا ہے اب تک موجُود ہو۔

یہ سو نجمی سا نکچی جب نظر دوسری جانب کو مڑتی ہے تو کوپرنیکس جو چاند کا ایک شاندار عظیم آتش فشاں پہاڑ ہے ہماری نگاہوں کو اپنی جنبشِ تکل کا تماشائی بنا لیتا ہے۔ اصل پہاڑ کے دو طرفہ چوٹیاں جن کی بلندی بارہ ہزار فیٹ کے قریب حساب کی گئی ہے۔ سیدھی مینار کی طرح سر بفلک کشیدہ نظر آتی ہیں اور اُن کے چاروں طرف ننھی ننھی آتش فشاں پہاڑیاں جن کے تنگ مخروطی کو دیکھ کر بھڑ کے چھتے کا گمان ہوتا ہے کثرت سے نظر آتی ہیں - کوپرنیکس کے عجیب غریب کھیے کی دیواریں جس کے بیچ کی گنگھور خوفناک تاریکی دیکھ کر انسان کا دل بیٹھا جاتا ہے نیچے کی طرف بالکل سلامی دار نظر آتی ہیں۔ اس کے ہر طرف وادیوں کو دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ کوپرنیکس سے کئی صدیوں تک سوختہ و گداختہ جلتا ہوا سیال مادہ اس کثرت سے اُبال کھاتا رہا ہے کہ سینکڑوں کوس تک لاوا کی دھاریں بہتی چلی گئی ہیں اور تمام وادیوں کو ڈھانک دیا ہے۔ ان دھاروں کی لہریں جو اس وقت منجمد ہو کر سنگلاخ دیواریں بن گئی ہیں ایسا اوپر تلے پیچ و تاب کھاتی ہوئی دُور تک پھیلتی چلی گئی ہیں کہ دیکھتے دیکھتے انسان کی نگاہ تھک جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں جابجا معدنیات کے اُن گڑھ میناروں کا جھرمٹ نظر آتا ہے جن کی مخروطی چوٹیاں قطار کی قطار چاند کی آٹھویں تاریخ کے بعد سورج کی کرن سے ایسا چمک اٹھتی ہیں کہ اُن کے دلفریب سلسلے پر موتیوں کی لڑی کا گمان ہوتا ہے۔۔

جس وقت چاند بدر بنجاتا ہے تو علاوہ اس سین کے جس کو میں اوپر لکھ آیا ہوں ایک اور نرالا اور انوکھا منظر دکھائی دیتا ہے۔ جس کی حقیقت دریافت کرنے میں ہماری عقل حیران رہجاتی ہے ذرا سا غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ گویا چاند کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے تک سینکڑوں شعاع نُور کی ندیاں بہتی چلی گئی ہیں اور اُن سب کا مرکز خروج کسی نہ کسی آتش فشاں پہاڑ میں نظر آتا ہے۔ چنانچہ ٹائیکو نامی چاند کا ایک آتش فشاں پہاڑ ہے جس سے ایسی ایسی نُور کی ندیاں بہت سی پیدا ہوئی ہیں اور ہر سمت میں دُور دُور تک بہتی چلی گئی ہیں۔ ان میں سے ایک تو اتنی لانبی ہے کہ بلا مبالغہ اُس کی چمکتی ہوئی لہر کا نشان سترہ سو میل تک حساب کیا گیا ہے۔

سب سے زیادہ حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ ان خیالی ندیوں کا بہاؤ عجب بلا کا بہاؤ ہے کہ پہاڑ بھی اسکے روکے بھی کہیں نہیں رُکا ہے۔ مُڑنے کا کیا ذکر جدھر رُخ کیا ہے بس اُسی طرف بڑے بڑے پہاڑ چٹان ناہموار وادیاں ٹیڑا غار کنڈ غرض جو کچھ سامنے راہ میں پڑا ہے سب کو صاف قطع کرتا ہوا نکل گیا ہے۔ دُوسری بات قابل نوٹ کرنے کے یہ ہے کہ جن پہاڑوں سے یہ شعاع نُور کی ندیاں نکلی ہیں وُہ پہاڑ بھی اِسی رنگ رُوپ کے ہیں اور ان میں بھی ایسی ہی چمک دمک نظر آتی ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہو کہ ان پہاڑوں کی ترکیب میں بھی وُہی اجزا غالب ہیں۔ جن سے صانع قدرت نے اِن چمکتی ہُوئی لہروں کو پیدا کیا ہے۔

اب یہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ نُور کی ندیاں جن کو چاند میں ہم اس طرح لہراتے دیکھ رہے ہیں۔ آخر ہیں کیا چیز؟ اس گُتھی کے سُلجھانے میں بڑی بڑی دماغی قوتوں نے کوشش کی ہے مگر آجتک ایسی نہیں سُلجھی جسے سُلجھنا کہتے ہیں۔ بعض نے یہ قیاس کیا ہے کہ یہ شعاعی لہریں سیال لاوا کی دھاریں ہیں جو بہتی بہاتی دُور تک چلی گئی ہیں اور اب منجمد ہو کر سُورج کی کرن سے چم چم چمکتی نظر آتی ہیں۔ کیونکہ اس طرح کا منظر ہم زمین پر موجود پاتے ہیں۔ اٹمنا سے جس قدر جلتا ہوا سیال مائع اُبال کھا کر نکلتا ہے وُہ آخر ندیوں کی صُورت ہر طرف بہتا ہوا چلا جاتا ہے۔ چاند کا منجم اگر اپنی دُوربین لگا کر زمین کی سیر کرے تو اُس کو بھی یہ لاوا کی دھاریں جو اٹمنا سے بہکر نکلی ہیں۔ چاند کی شعاع نُور کی ندیوں کی طرح چمکتی ہُوئی نظر آئینگی بیشک لیکن پھر تھوڑی ہی دُور کے بعد یہ ندیاں نظروں سے غایب ہو جائینگی۔ اور چاند کا منجم حیران ہو جائیگا اس لئے کہ اٹمنا سے جو لاوا کی دھاریں نکلی ہیں وُہ کوس دو کوس جاتے جاتے گھاس پات جنگل جھاڑیوں میں چھپ گئی ہیں اور جہاں کہیں پہاڑ اُن کے سدراہ ہو گیا ہو تو آگے بڑھنا کیسا وہیں پھیل کر ندی سے جھیل بن گیا ہے۔

اِس تقریر کا حاصل یہ ہو کہ چاند میں جو شعاع نُور کی لہریں نظر آتی ہیں وُہ سیال لاوا کی دھاریں کسی طرح نہیں ہو سکتیں اِس لئے کہ اگر ایسا ہوتا تو وُہ پہاڑوں کے حائل ہونے سے چھوٹی بڑی

کی طرح وہیں کی وہیں رہجاتیں - پہاڑوں کو کاٹتے ہوئے ناک کی سیدھ میں اُن کا اسی شان سے بہتے چلے جانا ہرگز ممکن نہ ہوتا - دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان لہروں کا اُگنا محض سطحی نہیں معلوم ہوتا ہے بلکہ پہاڑوں کی طرح جرم قمر کو پھاڑ کر وہ اندر سے نکلے ہیں - کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر آتش فشاں پہاڑوں کے تاریک کنڈ میں بھی اُن کا نشان چمکتا دمکتا نظر آتا ہے -

ناسمتھ نے اس دلفریب منظر کی یُوں تاویل کی ہے کہ جس طرح پولی مٹی کا گولہ دفعتاً گرم ہونے یا سرد ہونے میں چٹخ کر تمام سے شق ہو جاتا ہے - اسی طرح چاند کا کرہ جس وقت تازہ تازہ صانع عالم کے قدرتی کارخانے سے ڈھل کر نکلا تھا اور جلتا ہوا اک سُرخ انگارہ تھا اُس وقت اپنے جرم کے چھوٹے ہونے کی وجہ سے جلدی جلدی ٹھنڈا ہونے میں تمام سے شق ہو گیا اور دراڑوں کی راہ سے اندر کا جلتا ہوا سیال مادہ باہر اُبل آیا - لیکن چونکہ اُوپر کی جمی ہوئی پرت ابھی بالکل ٹھنڈی نہیں ہوئی تھی اس وجہ سے یہ سیال مادہ باہر نکلتے ہی فوراً جم نہ سکا بلکہ عرصے تک اُسی طرح رقیق حالت میں رہا اور تمام پھیل پڑا - یہ قیاس کچھ ایسے ٹھکانے کا معلوم ہوتا ہے کہ شعاع نور کی لہروں میں جن کو میں اُوپر بیان کر آیا ہوں - ارتفاع کا نہ ہونا جس کی وجہ سے ان کا سایہ نہیں پڑتا اور پھر ان لہروں کے جا بجا زیادہ پھیلے ہوئے نظر آنے کا سبب پُورا پُورا فوراً ہی سمجھ میں آجاتا ہے - اور یہ بات بھی کسی حد تک ممکن معلوم ہوتی ہے کہ چاند میں پہاڑوں کی خلقت شعاع نور کی لہروں کے پیدا ہونے کے ہزاروں ہزار لاکھوں لاکھ برس پیچھے ہوئی ہے +

سید راحت حسین

(از بھاگلپور)

ناظرینِ مخزن

یہ سنکر بہت خوش ہونگے کہ سرجن لفٹنٹ کرنیل جارج رینکنگ صاحب ایم۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔ سکرٹری بورڈ آف اگزامینرز کلکتہ ان دنوں ایک اعلیٰ قسم کی انگلش ہندوستانی ڈکشنری کی تصنیف میں مشغول ہیں جسکی واقعی ملک میں سخت ضرورت تھی۔ جس قدر لغت کی کتابیں پہلے موجود ہیں وہ ایسی جامع نہیں جیسی یہ ثابت ہوگی۔ کرنیل صاحب ممدوح کا نام ایسا نہیں جو ہندوستان کے علمی دائرے میں غیر مانوس ہو۔ السنہ مشرقی کے ایک ایسے ماہر شخص کے قلم سے نکلنا ہی اس کتاب کی خوبی و عمدگی کی کافی دلیل ہے۔ کیا انگریزوں اور کیا ہندوستانیوں۔ کیا مبتدیوں اور کیا امتحانات کے امیدواروں کیا یورپین سیاحوں اور کیا ہندوستانی تاجروں غرض سب کے لئے یہ یکساں طور پر مفید و کارآمد ثابت ہوگی۔ دراصل کرنیل صاحب نے ایسی ڈکشنری تصنیف فرما کر ہمارے ملک پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ اس ڈکشنری میں انگریزی لفظ کے معنے پہلے اردو حروف میں دیئے ہیں۔ پھر رومن میں۔ اگر کسی لفظ کے مختلف معنی ہیں تو انگریزی میں اس کے مختلف معنوں کو الگ الگ لکھ کر ان کے جداگانہ اردو معنی بیان کئے ہیں۔ ہر ایک لفظ کی تذکیر یا تانیث بھی لکھ دی ہے اور مشکل ترکیبوں کو مثالیں دیکر واضح کر دیا ہے۔ یہ ڈکشنری عنقریب تیار ہو جائیگی قیمت باوجود ان تمام خوبیوں کے عـــہ ہے۔ درخواست بنام مسرس تھیکر سپنک اینڈ کو کلکتہ ہونی چاہیئے

ریویو

الکاشف

:- اس نام کا ایک ماہواری رسالہ ہمارے دوست قاضی حمید الدین صاحب پروفیسر اوف آرٹس بنے یالکوٹ نے نکالا ہے اس رسالہ کا مقصد علوم و فنون کو ترقی دینا ہے اسمیں علمی دلچسپیاں ہیں۔ رسالہ علاوہ سائنس اور صنعت و حرفت پر بھی مفید آرٹیکل لکھے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب نے ملک کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کرنیکا بیڑہ اٹھایا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ انہیں اپنے ارادوں میں ہر طرح کی کامیابی ہو اور یہ رسالہ ملک کے لئے بہت مفید ثابت ہو قیمت سالانہ ۱۲/ لکھائی چھپائی عمدہ۔ درخواست بنام ایڈیٹر صاحب ہو

علمی جنتری سنہ ۱۹۰۵ء

اس مفید اور کارآمد جنتری کو سید محمد عبد اللہ صاحب عالم نے بڑی محنت اور جانفشانی سے ترتیب دیکر شایع کیا ہے۔ اس جنتری میں علاوہ اور مفید باتوں کے تاریخی معلومات اور مشاہیر عہد کے حالات خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ قیمت اسکی غالباً ۲/ ہے۔ اور درخواست کرنے پر سید محمد عبد اللہ صاحب عالم سوداگر چرم کا پور سے مل سکتی ہے

سپاس جناب امیر رضؓ

ذیل کی نظم درج کرکے آج ہم اُن احباب کے تقاضوں سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ جو پروفیسر اقبال صاحب کے فارسی کلام کے لئے اکثر دفعہ بیحد اشتیاق ظاہر کیا کرتے ہیں۔ فارسی نظمیں عموماً مخزن میں درج نہیں ہوتیں تاہم احباب کے اصرار سے ہم اسے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ یہی نظم باظہار عقیدت شیخ صاحب صبح کے وقت پڑھا کرتے ہیں۔

اے محوِ ثنائے تو زبانہا — اے یوسفِ کاروانِ جانہا
اے بابِ مدینۂ محبت — اے نوحِ سفینۂ محبت
اے ماحیِ نقشِ باطلِ من — اے فاتحِ خیبرِ دلِ من
اے سرِ خطِ وجوب و امکاں — تفسیرِ تو سورہائے قرآں
اے مذہبِ عشق را نمازے — اے سینۂ تو امینِ رازے
اے سرِ نبوتِ محمد — اے وصفِ تو مدحتِ محمد
گردوں کہ برفعت ایستادست — اے بامِ بلندِ تو فتادست
ہر فتنہ درگہت چو منصور — در جوشِ ترانۂ انا الطور
بے تو نتواں باو رسیدن — بے او نتواں بتو رسیدن
فردوس ز تو چمن در آغوش — از شانِ تو حیرت آئینہ پوش
جانم بغلامیِ تو خوشتر — سر بر زدہ ام ز جیبِ قنبر
ہشیارم و مستِ بادۂ تو — چوں سایہ ز پا فتادۂ تو
از ہوش شدم مگر بہوشم — گوئی کہ نصیریِ خموشم
دانم کہ ادب بہ ضبطِ راز است — در پردۂ خامشی نیاز است
اما چہ کنم مے تولا — تند است برون فتد زمینا

زاندیشۂ عاقبت رہیدم
جنسِ غمِ آلِ تو خریدم

فکرم چو بجستجو قدم زد — در دیر شد و در حرم زد
در دشتِ طلب بسے دویدم — دامن چو گردباد چیدم
در آبلہ خارہا خلیدہ — صد لالہ تہِ قدم دمیدہ
افتادہ گرہ بروئے کارم — شرمندۂ دامنِ غبارم
پویاں بے خضر سوئے منزل — بر دوش خیال بستہ محمل
جویائے مے و شکستہ جامے — چوں صبح بباد چیدہ دامے
پیچیدہ بخود چو موجِ دریا — آوارہ چو گردبادِ صحرا
واماندہ ز دردِ نارسیدن — در آبلہ شکستہ دامن
عشقِ تو دلم ربود ناگاہ — از کار گرہ کشود ناگاہ
آگاہ ز ہستی و عدم ساخت — بتخانۂ عقل را حرم ساخت
چوں برق بجز منم گذر کرد — از لذتِ سوختن خبر کرد
بر باد متاعِ ہستیم داد — جامے ز مے حقیقتم داد
سرمست شدم ز پا فتادم — چوں عکس ز خود جدا فتادم
پیراہنِ ماومن دریدم — چوں اشک ز چشمِ خود چکیدم
خاکم بفراز عرش بردی — زاں راز کہ با دلم سپردی
واصل بکنار گشتیم شد — طوفانِ جمال کشتیم شد
جز عشق حکایتے ندارم — پروائے ملامتے ندارم

از جلوۂ علم بے نیازم
سوزم گریم تپم گدازم

اقبال

شعرائے قوم کو خطاب

یہ مختصر نظم ہمارے مکرم جناب آنریبل میاں محمد شاہ دین صاحب بیرسٹرایٹ لا متخلص ہمایوں کی فکر رسا کا ایک تازہ نتیجہ ہے۔ چونکہ اس نظم کا مضمون نہایت غور طلب اور نتیجہ خیز ہے اور شعرا کی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اس لئے ہم خاص شکریے کے ساتھ اس قابلِ قدر نظم کو درج کرتے ہیں

نالوں سے کوئی چرخ کو چکر میں لائے کیوں
سینے میں دل کو رکھ کے کرے ہائے ہائے کیوں

اے بوالہوس فسانۂ عشق اب تو کر تمام
الفاظ خشک پر کوئی آنسو بہائے کیوں

زندہ دلی تمہاری مبارک رہے تمہیں
آتا نہیں یہ دل جو ہنسوں پہ تو آئے کیوں

کرتی نہیں ہے جن پہ اثر داستانِ حسن
پھر یہ سبق انہیں کوئی ازبر پڑھائے کیوں

ہر سمت جبکہ آگ لگی ہو تو میرِ بزم
پروانے اور شمع کا قصہ سنائے کیوں

جذباتِ دل کو کیوں ہو تصنع سے کچھ بھی لاگ
بت کو خدا بنا کے کوئی سر جھکائے کیوں

مر کر بنا کرے کوئی کب تک غبارِ راہ
اس اپنی مشتِ خاک کا خاکا اڑائے کیوں

مثلِ پرند کون ہوا میں اڑا کرے
دامِ خیال میں کوئی گردن پھنسائے کیوں

قمری کی طرح کیوں کوئی کوکو کیا کرے
آزاد دل کو سرو کا بندہ بنائے کیوں

اے ہم نوا چمن کی ہوا ہی بدل گئی
مدت سے طرزِ نغمہ سرائی بدل گئی

یہ چہچہے خزاں میں کوئی کیوں سنا کرے
گل ہی نہ ہو تو بلبلِ شیدا کو کیا کرے

بجلی نے جبکہ اپنا نشیمن جلا دیا
رنگِ چمن پہ کون دل و جاں فدا کرے

چمپا نہیں گلاب نہیں موتیا نہیں
گلچیں سوکھی شاخوں سے پتے جدا کرے

پروانہ وار کیوں ہو نثارِ چراغِ حسن
موہوم غم کی آگ میں دل کیوں جلا کرے

چھٹتا نہیں ہے اب تو یہ رنگ اختلاط کا   کب تک گلے نسیم کے نکہت ملا کرے
خوں پانی ہو کے خشک خزاں میں ہوا تو کیوں   دعویٰ شہید ہونے کا برگِ حنا کرے
آہٹ خزاں کی جس نے چمن میں سنی نہیں   ہاں بیٹھ کر وہ نغمۂ بلبل سنا کرے
اے ہم صفیر حالتِ گل اب یہ ہے کہ تو   شاخِ شجر سے نوحۂ ماتم بپا کرے
برباد ہوتا دیکھے چمن کو جو باغباں   پھر تیرے دلفریب ترانوں کو کیا کرے

وہ گیت گا کہ باغ میں بس جان ڈال دیں
اور صحنِ بوستاں سے خزاں کو نکال دیں

اے شاعرانِ قوم زمانہ بدل گیا   پر مثلِ زلفِ یار تمہارا نہ بل گیا
بیٹھو گے کب تلک سرِ رہ تم لکیر کو   بجلی کی طرح سانپ تڑپ کر نکل گیا
دیوانہ وار بیٹھے ہو سینوں پہ رکھ کے ہاتھ   یہ کس کا ہاتھ سب کے دلوں کو مسل گیا
آخر ہر ایک اس کو ہے الفت سے کچھ تو لاگ   کیا اک تمہیں پہ عشق کا جادو چل گیا
یہ کیا غضب کہ ڈوب گئے سات آسماں   آنسو تمہاری آنکھ سے گر اک نکل گیا
روشن ہوئے ہیں نورِ بصیرت سے دو جہاں   سوتے میں کوئی آنکھوں پہ گر پاؤں مل گیا
اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی   دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
اک تم کہ جم گئے ہو جمادات کی طرح   اک وہ کہ گویا تیر کماں سے نکل گیا
ہاں ہاں سنبھالو قوم کو شاید سنبھل ہی جائے   گر گر کے ملکِ ہند کچھ آخر سنبھل گیا

دن گذرا پر تمہاری وہی ایک بات ہے
سر پر کھڑی وہ دیکھو قیامت کی رات ہے

اے نوجوانو! آؤ کہ کچھ کر دکھائیں ہم   طرزِ قدیم شعر و سخن کو مٹائیں ہم
دل کے بتوں کو توڑ کے فطرت پرست ہوں   نامِ خدا پہ کعبے میں ایمان لائیں ہم
لفظوں کا جادو چھوڑ کے ہوں معنی آفریں   فکرِ رسا کے خوب کرشمے دکھائیں ہم

اک طرح دلفریب کی بنیاد ڈال دیں
اور دل سے محو کر دیں وہ اگلی ادائیں ہم

آئینِ نو کو سیکھیں اس عہدِ جدید میں
بوسیدہ ہو گیا ہے جو دفتر جلائیں ہم

رنگِ چمن کچھ اور ہے، کی بو کچھ اور
گل کو نئی بہار کے نغمے سنائیں ہم

ہندوستان میں ایک نئی روح پھونک دیں
جو قوم مر چکی ہے اُسے پھر جلائیں ہم

ایسے برس پڑیں کہ ہو شاداب ملکِ ہند
حُبِّ وطن کی کالی گھٹائیں اُٹھائیں ہم

کیا خوب ہیں خیال ہمایوں صد آفریں
لیکن خفا نہ ہو تو تمہیں سچ بتائیں ہم

جو کچھ لکھا ہے اس میں اثر کا مزا نہیں
ناصح جو بے عمل ہو کسی کام کا نہیں

محمد شاہ دین

سپوت بیٹا

آتا ہے ہند سے تو اے نوجواں سپاہی
مجھ کو بھی کچھ بتا جا ۔ رکھے تجھے اِلٰہی

اُنیسویں کی پلٹن ہے اک وہاں بہادر
جس کا ہر اک سپاہی مشہور ہے دلاور

کچھ اُن کا حال کہہ اور مجھ کو یہ بتا نا
کیا ہیں وہ سب سلامت اور خرم و توانا

بیٹا مرا ہے اُن میں ۔ میرا عزیز لڑکا
جس کی ہے سب سے بڑھ کر دنیا میں مجھ کو پروا

احساں کرے گا ماں پر اُس کی خبر بتا کر
لے رانڈ کی دعائیں اُس کی خبر سنا کر"

آتا ہوں ہند سے میں ۔ موجود جنگ میں تھا
حصہ مرا بھی اُس ہنگامے و خدنگ میں تھا

اُنیسویں جو پلٹن ہے خوب جانتا ہوں — اُس کے سپاہیوں کی جرأت کو مانتا ہوں
افسر ہوں یا سپاہی سب سے ہوں میں شناسا — ہمراہیوں سے اپنے ہر اک ہے دوست میرا

لایا پیام ہُوں اک تیرے لئے بڑی ماں
رابرٹ کا ترے پیغام۔ خوش خوش سنو بڑی ماں“

”رابرٹ کو میرے تم کیا پہچانتے ہو بیٹا؟ — سچ سچ بتانا جو کچھ تم جانتے ہو بیٹا
اے نیک خو سپاہی اُس کا پیام کیا تھا — کہنا اُسی کے الفاظ۔ اُس کا کلام کیا تھا
ہائے۔ وہ لفظ کہنا جو اس کے منہ سے نکلے — لختِ جگر کے میرے جو اپنے مُنہ سے نکلے
تجھ کو خبر نہیں وُہ۔ کیسا مجھے ہے پیارا — اپنی ضعیف ماں کی ہے۔ آنکھ کا وُہ تارا

فُرقت میں اُس کی ماں کا کیا حال ہو رہا ہے
یہ دل مرا غموں سے۔ پامال ہو رہا ہے“

”ہیولاک کی لڑائیاں اُس نے لڑی ہیں ساری — دُشمن پہ وار سارے اُس کے ہوئے ہیں کاری
دوبار لکھنؤ پر وُہ چڑھ کے خُوب اُڑا ہے — تلوار سے لڑا ہے اور توپ سے لڑا ہے

کر شکر اُس خُدا کا جس نے اُسے بچایا
ہر معرکے میں اُس پر حق کا رہا ہے سایا“

”صد شکر یا الٰہی۔ طاقت نہیں بیاں کی — تُو نے سُنی دُعائیں اُس کی غریب ماں کی
اے دو جہاں کے مالک اے کردگار میرے — اس رانڈ ناتواں کی سُن لی۔ نثار تیرے
گولے کی زد سے روکا تلوار سے بچایا — اپنے کرم کا نقشہ دل پر مرے جمایا

پر ہاں مجھے بتا دے پیغام اُس کا کیا تھا
اپنی ضعیف ماں کو کہنے کو کیا کہا تھا،،

”اے ماں بہادری سے تیرا لڑا ہے لڑکا — اور ہر زباں پہ اُس کا پھیلا ہوا ہے چرچا
کرنل کی جاں کو اُس نے رن میں بچا لیا تھا — سرکار میں یہ قصّہ سارا لکھا گیا تھا

اِس کے صلے میں اس کو تمغہ عطا ہوا ہے زایدہ برآں وظیفہ اس کو دیا گیا ہے

ہے خوش نصیب لڑکا تیرا بہت بڑی ماں
خوش قسمتی کا اسکی تارا رہے درخشاں

"اے نیکدل سپاہی تیری زباں پہ رحمت جس خانداں سے ہے تُو اُس خانداں پہ رحمت
اے پیارے[1] مرنے والے تو کاش آج ہوتا اس میرے جھونپڑے میں کیا رنگ راج ہوتا
دکھ درد جو سہے تھے سب محو ہو گئے ہیں سالوں کے رنج و غم کو یہ لفظ دھو گئے ہیں
پر ہاں ابھی تو باقی کچھ پوچھنا تھا تم سے حالت تھی اس کی کیسی اور کیا کہا تھا تم سے
رابرٹ کا حال کیا تھا اور رنگ روپ کیا تھا
بیٹھ مجھے بتا دو ہے جو کچھ کہا تھا"

"سُرخی سے اس کی رنگت تانبا سی ہو رہی ہے داڑھی نکل کے خوبی عارض کی کھو رہی ہے
ایسا بدل گیا ہے وہ نازنیں شمائل پہچان اس کی اماں تم کو بھی ہو گی مشکل
مرد جوان کیا ہے ہم نے تمہارا بچہ دل اس کا پر وہی ہے ہرگز نہیں ہے بدلا
رکھتا ہے یاد تجھ کو۔ کرتا ہے تیری باتیں اور جانتا نہیں ہے وہ ایسی ویسی باتیں
لیکن جہاز اُس کا سمجھو لگا کنارے
جلدی ہی خود ملیگا وہ آکے تم کو بارے"

"میں سچ مچ آ رہا ہے سچ مچ ملے گا مجھ کو؟ کب میرا پیارا ننھا دیدار دے گا مجھ کو
تم نے کہا تھا جلدی آیا وہ چاہتا ہے" جھوٹا نہیں میں اماں سچ مچ وہ آچکا ہے"
"او میرے پیارے رابرٹ! اماں تمہاری واری"
"او ماں میں تیرے قرباں۔ حق نے سُنی ہماری"

عبدالرشید چشتی مرحوم

[1] خاوند سے مراد ہے جو مر چکا ہے ۱۲

بھونرا

بھونرا لوبھی پھول کا کلی کلی رس لے (ہندی دوہرا)

طائرِ خوش خبر[۱] ہے نام مرا — اُلفتِ حُسن ہے پیام مرا
مری بستی ہے پھول کی خوشبو — غنچہ و گل کی دید کام مرا
وادیِ کوہ سیر گاہ مری — باغ مسکن ہے صبح و شام مرا
نہیں کس گل سے رسم و راہ مری؟ — سب پہ پھیلا ہوا ہے دام مرا
پھول پھولے نہیں سماتے ہیں — مسکراتے ہیں سن کے نام مرا
جتنے یہ کج کلاہ غنچے ہیں — جھک کے لیتے ہیں سب سلام مرا
مانتے ہیں صنوبر و شمشاد — سروِ آزاد ہے غلام مرا
بادۂ اُنس کا نشہ ہے مجھے — مَے اُلفت سے پُر ہے جام مرا
حُسن کو ڈھونڈھتا ہوں ہر گل میں — ذوقِ دید اس قدر ہے عام مرا

جستجوئے گل است ہستی من
ہوشیاری نثار مستی من

شاہدِ گل کا حسنِ جاں پرور — کوئی دیکھے گا مجھ سے کیا بڑھ کر؟
ابھی اس کے جمالِ رعنا تک — نہیں پہونچی نگاہِ ذوقِ نظر
ابھی اس بھینی بھینی خوشبو سے — نہیں مہکا مشامِ بادِ سحر
ابھی اس پیارے پیارے چہرے کو — نہیں دھویا ہے اوس نے آکر
اس کی شہرت کا چار سو پیغام — نہیں لے کر گئی نسیمِ سحر

۱؎ ذوق ؎ بلا سے ہو وے مرا مرغ نامہ بر بھونرا - کہ اسکو دیکھ کے وہ منہ سے خوش خبر تو کہے

حال پر عندلیبِ نالاں کے — نہیں کی اُس نے مُسکرا کے نظر
اس دلاویز حُسنِ زیبا کی — نہیں گلچیں کو خواب میں بھی خبر
مَیں ہُوں اس حال میں بھی گُل سے قریں — ہیں عنایات اس قدر مجھ پر
ہم نفس ہُوں انیس و محرم ہوں — میری اُلفت میں اس قدر ہے اثر

حجلہ آرائے خلوتستم من
بزم پیرائے جلوتستم من

دادِ گلگشت دے رہا ہُوں مَیں — محوِ ہر رنگ و ہر ادا ہُوں مَیں
پیار کرتا ہُوں جا کے گیندے کو — مُنہ بنفشہ کا چُومتا ہُوں مَیں
آنکھ نرگس سے جا لڑاتا ہُوں — مائلِ چشمِ فتنہ زا ہُوں مَیں
لگ چلا ہنس کے سیوتی سے کبھی — کبھی چنبیلی سے جا ملا ہُوں مَیں
کبھی جُوہی سے چھیڑ کر بیٹھا — دل لگی میں کوئی بلا ہُوں مَیں
یاسمن سے ہے میری سرگوشی — موتیا سے سخن سرا ہوں مَیں
ہے نسیمِ سحر سے یارانہ — رازدارِ دلِ صبا ہُوں مَیں
دِل دُکھاتا نہیں کسی کا کبھی — رہروِ جادۂ صفا ہُوں مَیں
سرِّ خُذْ مَا صَفَا سے واقف ہُوں — علمِ دَعْ مَا کَدِرْ پڑھا ہُوں مَیں

دلم از نورِ مہر معمور است
رسمِ بیگانگی ز من دُور است

فنِ نظارہ میں ہوں مَیں یکتا — سب کو لازم ہے اقتدا میرا
مجھ سے اہلِ نظر یہ گُر سیکھیں — مَیں ہُوں ذوقِ سلیم کا پُتلا
حُسن سے گو مجھ کو ہے لگاؤ مگر — دِل کسی پھول کو نہیں دیتا
روگ دِل کو نہیں لگاتا مَیں — گو مے شوق کا ہُوں متوالا

میرا مطلوب ہر جگہ موجود ‏ میرا محبوب ہر طرف پیدا
نہیں میرا مثالِ بلبلِ زار ‏ شیوۂ کار عندلیب کا رونا
گُل کو نفرت نہیں دلاتا میں ‏ شوق اپنا جتا کے حد سے سوا
نہیں میں زید و عمرو کا پابند ‏ میں مقید ہوں دامِ اُلفت کا
ہے ہر اک گل نگاہ میں میری ‏ شوخ سے شوخ سادہ سے سادا

در تصور چہ انجمن دارم
جادۂ گل چمن چمن دارم

نیرنگ

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"

میں کیا کروں جو نکلیں نالے بھی میرے موزوں ‏ موزونیِ طبیعت اک دین ہے خُدا کی
مُرغِ قفس ہوں گھبرا گھبرا کے چیخ اُٹھا ہوں ‏ فرصت کہاں ہے مجھ کو نغمے کی اور صدا کی
شاعر ہوں میں نہ حاشا شاعر کا ہوش ہو بھی ‏ ہاں مشق کر رہا ہوں فریادِ بے صدا کی
کیوں عشق کا لگاؤں میں روگ اپنے جی کو ‏ اور کیوں کروں مسیحا سے التجا دوا کی
انسان آپ حُسنِ انسان پہ ہو عاشق ‏ یہ عاشقی نہیں ہے نخوت ہے انتہا کی
اور ہو بھی تو نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دل میں ‏ سو خار کی خلش ہے کاوش ہے خار پا کی
معشوق کو کس عاشق نے پاک دل سے چاہا ‏ کس مہ جبیں نے اپنے جانباز سے وفا کی
کیا عاشقی یہی ہے لکھا کروں قصیدے ‏ تعریف میں حیا کی انداز کی ادا کی

میں نکتہ جانتا ہوں مضمون ناف و پستاں | تفضیح اور اپنے محبوب دلربا کی
ہے مجھ کو وصل و ہجراں دونوں میں ایک لذت | فرقت سے ہوں نہ نالاں قسمت کا ہوں نہ شاکی
اے عاشقو بتاؤ دل کیا ہوا تمہارا؟ | اے مرنے والو تم نے جان عزیز کیا کی
اے مے کشو تم اتنی کیوں پی گئے کہ اب تم؟ | بیخود پڑے ہوئے ہو سر کی خبر نہ پا کی
اے گلچین سخن کے دیرینہ باغبانو | دیکھو بہار میرے صحرائے پُرفضا کی
قدرت کے پاک ہاتھوں سے یہ چمن لگایا | شاہد ہے اس پہ بلبل کے آنسوؤں کی پاکی
اس پاک صاف گلشن میں آہ ایک کوئل | تانیں ٹھہر ٹھہر کر لیتی ہے کس بلا کی
ہر سینہ کوک اسکی سیدھی سی اک صدا ہے | تاثیر اس صدا میں لیکن ہے انتہا کی
قانون تار و پود قدرت کا بج رہا ہے | اور بہہ رہا ہے نغمہ امواج میں ہوا کی
جنبش سے شاخ گل کی ہے شکل وجد پیدا | پتوں کی تالیوں میں ہے شان مرحبا کی
اے شاعرو تمہاری قوال گائیں غزلیں | محفل میں اور گونجے آواز واہ وا کی
یہ لذت مسرت تم کو رہے مبارک | میں نے خوشی سے تم کو بخشی تمہیں سدا کی
رقت اٹھی[۵۱] آہستے آہستے پر ہو تمہیں کو مجھ کو | سودا نہیں کہ ناچوں آواز پر درا کی
میں شورش جہاں سے خود دور بھاگتا ہوں | پروا نہیں ہے مجھ کو تحسین و مرحبا کی
اس شاعری میں مجھ کو بتلاؤ ملگیا کیا؟ | شاہ دکن نے کوئی خلعت مجھے عطا کی؟
ہاں پا گیا بہت سے میں ہمخیال اپنے | میرے لئے بہت کچھ نعمت ہے یہ خدا کی
دن رات میری پُرنم آنکھوں میں پھر رہی ہیں | دیرینہ صحبتیں ان دیرینہ آشنا کی
جو دور کالے کوسوں سے کان میں لگائی | آواز پر وطن کے مرغانِ خوشنوا کی
فونوگراف میں جو بھر بھر کے لے گئے ہیں | یہ خوشگوار آہیں نادر سخن سرا کی
اور آہ وہ جوانی کی نیند سونے والے | جو بیخبر پڑے ہیں آغوش میں فنا کی

۵۱ آہستے آہستے محفل حال و قال میں قوالوں کی وہ صدا جس پر وہ زیادہ زور دیکر گاتے ہیں۔

جب یاد آگئے ہیں آنسو نکل پڑے ہیں اور ہاتھ اُٹھا کے مَیں نے اُن کے لئے دُعا کی

"اے ہمصفیر میرے سینے میں دل نہیں ہے"
اِک فرد ہاتھ میں ہے یارانِ باصفا کی

نادر علی خان نادر

خیالات منظوم

(بُری صحبت)

شریفوں کے بچے بُری صحبتوں میں
جہاں تک ہو امکان ہرگز نہ بیٹھیں

یہ مانا کہ ہیں صاحبِ عزم و ہمّت
ہمیشہ وہ محفوظ رکھینگے عصمت

اگر کچھ نہیں اور بد نام تو ہیں
گر بد سے بدتر ہیں بدنام جو ہیں

سفید اُن کی ناموس کی ہے جو چادر
ابھی گویا رکھی ہے دھوبی نے لاکر

یہ ممکن نہیں گو بچائیں وہ از بس
بجز داغ کے صاف لے آئیں واپس

سفیدی میں میل اور دھبّہ ذرا سا
نظر آئے گا دُور سے بدنما سا

یہ ہے ذکر اُن کا قوی ہیں جو دل کے
مگر ہیں جو ان میں طبیعت کے بودے

کہاں ہے علوِ ہمّتی ان میں رکھی
وُہ پھنس جائینگے شہد میں جیسے مکھی

جو سمجھائے گا اُنکو سمجھینگے دشمن
قریبوں سے ہوجائیگی سب سے اَن بَن

نشۂ عیش و عشرت کا جائیگا چڑھتا
غرض انہماک ان کا جائیگا بڑھتا

نکلنے کا خود بھی کریں گر ارادہ
نکلنا تو کیسا پھنسینگے زیادہ

(ترقی کی کیفیت)

یہ اکبر سے پوچھا خداوندِ عالم قناعت فتوحات سے کب کروگے؟
کہا اس نے قائم نہیں دہر میں کچھ جو بڑھتے سے ٹھہرے تو الٹے پھروگے
مگر قولِ عارف ہے اس سے بھی بڑھکر نہ مانا اگر اس کو مصیبت بھروگے
کہ دنیا میں اب دورِ بائیسکل ہے جو اک لحظہ ٹھہرے تو فوراً گروگے

پیرزادہ محمد حسین عارف

ایک ناکام بیرسٹر کا انجام

لٹائی خوب ہی باوا کی دولت ہم نے لنڈن میں گیا تھا چھوڑ تنہا باغباں گلچیں کو گلشن میں
"خریدارِ متاعِ جلوہ" تھا یاں "حسنِ بے پروا" بکھرے تھے پھول زنگار رنگ آزادی کے دامن میں
نہ تھی مضمر نقابوں میں یہاں عارض کی رنگینی نہ تھے ناز و ادا پنہاں یہاں پردے کی چلمن میں
نظر آیا یہاں پریوں کا ہم کو جمگھٹا ایسا لگا دی آگ جس نے صبر اور دانش کے خرمن میں
کبھی گرجا میں جاکر ہم نے جھانکا ماہرویوں کو کبھی تاکا کئے ہم جاکر کسی گلرو کو گلشن میں
کبھی پہنچے تھیٹر میں تو چھین آئے دل ان سے ہے جادو جن کی باتوں میں ہے شوخی جن کی چتون میں
کبھی "پکنک" کے جلسے میں ہوئے شامل تو دن بھر حمائل ہاتھ تھے "شمپین" کی بوتل کی گردن میں
ہمیں گلیوں میں شب کو بارہا یہ مرغِ دل اپنا نظر آیا کسی گیسو سے زریں کے نشیمن میں
کبھی گھوڑدوڑ میں جاکر لگائیں بازیاں ہم نے کہ اس میں جیتنا اور ہارنا داخل ہے فیشن میں

"مٹن چاپ" اور "کٹلٹ" کھا کے ہم ہنستے تھے خوب اُن پر
مگن رہتے ہیں جو دال اور چپاتی اور سالن میں

پہن کر کوٹ اور پتلون ہوتی تھی ہمیں حیرت
بسر ہوتی ہے کیونکر پائجامے اور اچکن میں

جو "ایسٹ اینڈ" سے "وسٹ اینڈ" میں جب جا نکلتے تھے
تو غم آنے نہ دیتا تھا کلف کا لرکا ۔ گردن میں

ہماری "ٹائی پن" کے آگے سورج کی کرن یوں تھی
پڑا میلا سا اک تاگا ہو گویا چشمِ سوزن میں

خط آتا تھا جو بابا کا کہ کچھ پڑھتے بھی ہو بیٹا
تو لکھ دیتے تھے ہم "محنت سے خوں بھی خشک ہے تن میں"

نہیں شک اس میں گُر سیکھے ہزاروں ہم نے فیشن کے
نہ سیکھا ایک نکتہ بھی مگر قانون کے فن میں

کتابیں بن گئیں گلدستۂ طاقِ فراموشی
ہوئے رہ رہ کے برسوں فیل ہم "اگزیمینیشن" میں

ولایت میں غرض ہم نے اُڑائے ایسے گلچھرے
کہ لی جمشید نے حسرت سے کروٹ اپنے مدفن میں

مگر کب تک یہ گلچھرے ! جو ہوتا گنجِ قاروں بھی
تو ایندھن کے لئے کافی نہ ہوتا ایسے گلخن میں

اُٹھے جب صبح کو اک دن تو جیبوں میں نہ کچھ پایا
ہوئی خالی بھری تھی جس قدر اسٹیم انجن میں

شراب و مطرب و ساقی چھٹے یکلخت سب ہم سے
سکھایا بے زری نے فلسفہ آخر کو لندن میں

ہوئے جب ہمنشیں پرسانِ حال اُن سے کہا ہم نے
"میں دامن ہی نہیں رکھتا جو اُلجھے خارِ دامن میں"

ظفر

فلکِ اخضر ہے جام مرا

یہ نظم بابو بشیر احمد صاحب کے مضمون "میرا ساغر آسمان ہے" کا منظوم ترجمہ ہے۔ اصل مضمون مخزن بابت ستمبر ۱۹۰۴ء میں چھپا تھا۔ اُس پر مغز نثر کا یہ دل کش اور رنگین ترجمہ باعث دلچسپی ہوگا :-

لگاؤں گا نہ تجھے مُنہ میں او مے انگور
کہ تو ہے مایۂ فسق و فجور و عُجب و غرور

میں وُہ نہیں کہ ترا جام پی کے ہُوں بدست
وُہ بادہ کش ہُوں کہ کہتے ہیں مجھ کو مستِ الست

مری شراب ہو تجھ سے کہیں مُصفّا تر
لطیف و خوش مزہ و خوشگوار و زیبا تر

تری شراب سے پرہیزگار ہُوں ساقی
کہ مستِ بادۂ جوشِ بہار ہوں ساقی

وُہ رند ہُوں کہ خُمِ آسماں ہے جام مرا
بلند صُوفی و واعظ سے ہے مقام مرا

ایاغِ ساقیِ گردوں جو میرا بھرتا ہے
دماغ عالمِ بالا کی سیر کرتا ہے

ہُوں مستِ نشۂ جامِ مظاہرِ قدرت
غضب کے ہوش رُبا ہیں مناظرِ قدرت

پہاڑیوں کی فضائیں ہیں خوشگوار عجب
رواں ہیں کوہ کے دامن میں آبشار عجب

مقام یہ نہیں دیکھے ہیں نیشکر! تو نے
کیا نہیں ابھی کہسار کا سفر تو نے

یہ دلفریب مقامات چل دکھلاؤں
پہاڑیوں کی ہوائے خنک کھلاؤں

پئیں گے مل کے مےِ آفتاب چل تو سہی
عجب بہار ہے۔ گلگشت کو نکل تو سہی

نثار میں ترے او کردگار! قدرت کے
کہ چپے چپے پہ جلوے ہیں تیری صنعت کے

ازل میں صانعِ ارض و سما تھی ذات تری
دلیل ہے تری ہستی کی کائنات تری

کہاں تھا میں مری قسمت مجھے کہاں لائی
عدم سے جانبِ ہستی کشاں کشاں لائی

گراں ہے ہجر ترا جانِ ناشکیبا کو
تلاش ہے اسی جلوے کی چشمِ بینا کو

کرے نہ رُوح مری کیوں تری طرف پرواز
کہ زیست ہے تری فُرقت میں تفرقہ انداز

میں کاش عمرِ رواں! تجھ کو چھوڑ کر بھاگوں
طلسمِ خانۂ ہستی کو توڑ کر بھاگوں

کہیں جو رُوح کا خالی مکان دیکھتے ہیں
تو سر اُٹھا کے سُوئے آسمان دیکھتے ہیں

کوئی عقاب کی چنگل میں جیسے ہو کودک
نگاہ یاس سے ماں دیکھتی ہو سُوئے فلک

نجات دے مجھے ان شورشوں سے تو یارب
کہ مجھ کو ہے ترے جلوے کی جستجو یارب

سرور جہان آبادی

نخلستان

صحرائے لق و دق میں ہر اک درختِ خرما   فرشِ زمیں پہ جس نے ڈالا ہے اپنا سایا!
جو میزباں رہا ہے اکثر مسافروں کا   بیٹھا ہے اُس کے نیچے اک مردِ اجنبی سا

جو اپنا لحن دل کش جنگل کو ہے سناتا

اے قافلوں کے مسکن۔ اے کارواں کے ملجا   بھولے ہوؤں کے مونس۔ بھٹکے ہوؤں کے ماوا
کھوئے مسافروں نے آرام تجھ سے پایا   سنتا رہا ہے تیری تعریف کا ترانا

عدنانیوں کے منہہ سے ہر عہد میں زمانہ

ارضِ عرب پہ تیرے احسان ہیں سراسر   دل کش کئے ہیں تو نے بیت الحرم کے منظر
یثرب کے باغ و صحرا آباد تجھ سے اکثر   بصرے کو شان تجھ سے کوفے کو ناز تجھ پر

سرسبز تجھ سے دائم ہے سرزمینِ بطحا

تعریفی گیت تیرے گایا کئے پرندے   سورج نے بھی سُنے ہیں۔ یہ راگ چہچہے چہچہے
یا اُس نے سر نکالا مشرق میں جب افق سے   اُس نے سُنا ہے اکثر چڑیوں کو یوں چہکتے

اے وُہ جسے نہیں ہے غم موسمِ خزاں کا

گر آسماں کے نیچے تو شاندار تنہا   عظمت دکھاتے اپنی ایسے کھڑا نہ ہوتا
سنسان کیسے ہوتے۔ وادیٔ کوہ و صحرا   پھر کون قافلوں کا مہماں نواز ہوتا

گویا کہ تو سبب ہے جنگل کی آبرو کا

ہے دل میں آرزو یہ پوجوں مَیں تیری مورت   شاخوں سے تیری ہم کو دکھلا کے اپنی صورت
سکھلائی مسجدوں میں محراب کی ضرورت   ہے پتّا پتّا تیرا تیغِ دو دم کی صورت

تاجِ زمرّدیں سے ہر سبز نور پیدا

پیغام دے رہا ہے تیرا ہر ایک پتا   اس تازہ میہماں کو جس کو کہ شوقِ کعبہ
پہنچا گیا ہے تجھ تک اور موت کا فرشتہ   کہتا ہے اس سے آکر۔ ہے قصد اب کدھر کا
چلئے ہمیں بلایا اُس نے کہ جو ہے یکتا

وُہ ہے خطاب کرتا اس نعشِ بے کفن سے   ہے ہے اِس آرزو میں نکلا تھا تو وطن سے
اس شوق میں ہی گذرا تو دشت سے چمن سے   تو نے نہ چھوڑی یہ دُھن گو جان نکلی تن سے
بیشک لباسِ کعبہ ماتم ترا کرے گا

نیچے ترے کھڑا ہے اک سُرخ رنگ خیمہ   اِک بے نقاب چہرہ ہے جس میں جلوہ فرما
تو اس سے چپکے چپکے یُوں کہہ رہا ہو گویا   اے قابلِ پرستش دوشیزہ تو نکل آ
تجھ کو یہاں نہیں ہے نامحرموں کا کھٹکا

وُہ مقبرے پہ گنبد جو ہے دکھائی دیتا   خلوت کدہ ہے جو اک مہمانِ دائمی کا
صدیوں سے قبر میں جو پھیلا کے پاؤں سویا   ڈالا ہے بعدِ مُردن تو نے بھی اُس پہ سایہ
پھولوں کا ہار لا کر شام و سحر چڑھایا

اے خوشنما کبوترو۔ اے دلربا پرندو   اِک بات پوچھتا ہوں اس کا جواب تم دو
سنسان جنگلوں میں تم کیوں چہک رہے ہو   آئیگا کون سُننے اس لحنِ دلربا کو
شاید تمہارے نغمے سُنتا ہے نخلِ خرما

محمود شیرانی (از لندن)

تازہ غزلیں

اب بھی جو سال بھر یہ چمن میں نہ آئیگی　　عُقبیٰ میں کیا بہار مجھے بخشوائے گی
اَے آہ تو نہ کھول سکیگی درِ قبول　　مانا کہ جا کے دیر تلک غُل مچائیگی
راتیں تو اب ہیں عمر طبیعی کی بھی اخیر　　کیوں اَے شبِ فراق کہاں تک ستائیگی
سُنتے ہیں ضبط آہ سے بنتا ہو دل کا کام　　اُس کو بھی دیکھ لینگے اگر جی میں آئیگی
مشقِ خرام ناز میں یہ موج کیا ضرور　　پاپوش سے کسی کی اگر جان جائیگی
بیٹھے بٹھائے دل میں جو حسرت کو دوں جگہ　　کیا آ کے آرزو کوئی آفت نہ ڈھائیگی
مَیں چاہتا ہوں جب تو ملاتی نہیں ہے آنکھ　　ڈھونڈے گی جب تو پھر نہ مجھے دنیا پائیگی
بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی ہو آرزو کمال　　کس شوق سے عدم کی طرف روح جائیگی
کیا حسرتِ وصال کی تشویش ناصحا　　مَیں خود مُوا ہوا ہُوں مجھے کیا ستائیگی
فصلِ خزاں میں آنے دو شبنم کو باغ میں　　بے اختیار دیر تک آنسو بہائیگی
لے کر چلی ہو ساتھ جو درد و غم و الم　　اَے رُوح کس خرابے میں بستی میں جائیگی
یہ کون زندگی ہو کہ مر مر کے ہو بسر　　کیا شاد سنکھیا نہ مرے ہاتھ آئیگی

(شاد)

پابندِ عشق ہو کے جو شوریدہ سر ہوں میں　　زنداں ہو مجھ کو وسعتِ عالم جدھر ہوں میں
بے نشہ میکشوں کی طرح بے خبر ہوں میں　　کس کی نگاہِ مست کا یارب اثر ہوں میں
فرقت میں شام ہی سے لبوں پر ہو جانِ زار　　مالک سحر کو لگی ہے چراغِ سحر ہوں میں
پہلو میں میرے آتے ہی بیچین کیوں ہُوئے　　کس مُنہ سے کہہ رہے تھے قرارِ جگر ہوں میں
اُلفت بتوں کی دل میں ہو میرے خُدا کی شان　　جو پتھروں پر جم کے اُگا وُہ شجر ہوں میں
دونوں نے مل کے اُس کی گلی میں گرا دیا　　ممنونِ لغزشِ قدم و دردِ سر ہوں میں

(حامد علیخاں بیرسٹرایٹ لا۔ لکھنو)

ادویہ جن کے استعمال سے ہزارہا مریض سلطنت صحت یاب ہوتے ہیں

اکسیر کرالانی — شفا ہے ضعف بینائی۔ دافع دھند، جالا، پھولا، ڈھلکا وغیرہ۔ قیمت فی تولہ دو روپے۔ عہ

حب ذیابیطس — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر کی کثرت سے نجات ملتی ہے۔ فی تولہ عہ

حب دافع قبض — یہ گولی پرانی سے پرانی قبض دور اور تمام عوارض معدہ سر وغیرہ کا فوری علاج ہے

مرہم زخم — ہر قسم کے پرانے زخم، گندے ناسور، پھوڑا پھنسی وغیرہ کو بہت جلد اچھا کرتی ہے۔ تیلی شیشی کلاں سے شیشی خورد عہ

سرمہ نور — چند سلائی میں دور۔ ۴ تولہ ایک روپیہ عہ

حب دافع وجع مفاصل — درد اعضا و جوڑوں کا درد دور ہو۔ ۲ ہفتے کی دوا۔ عہ

حب دافع طحال — تلی یا لعنہ وغیرہ کے لئے بے نظیر ہے۔ ۲ ہفتے کی دوا دو روپے عہ

سرمہ کحل — وبائی بیماری کے علاوہ بال بے وقت سفید نہیں ہونے دیتا۔ نزلہ، زکام کو دور کرتا ہے۔ مقوی دماغ و مفید فی شیشی سے

تیل سو دو گن — اس کے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے عہ

دوائی خارش — داڑھی کی خارش اور بدن کے دانے ایک ہی دن میں خشک ہو جاتے ہیں۔ ۲ تولہ عہ

تریاق اسہال — وجع البطن، سنگرہنی، پیچش اور مروڑ کی جڑ کو اکھاڑ دیتا ہے

اسی کے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر قسم میں کارآمد۔ ایک تولہ کی قیمت ..... عہ

حب قائم مقام افیون — چند روز افیون کی عادت چھوٹ جاتی ہیں ایک تولہ

روغن اعجاز — بالوں کا زخم بہت مفید ہے۔ سر کے لئے اکسیر ایک تولہ

دوائے درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہو۔ ایک شیشی دو روپیہ

چورن مقوی معدہ — خوش ذائقہ، بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے۔ ۴ تولہ ایک روپیہ عہ

سنون مستحکم دندان — دانت مضبوط اور خون بند۔ ایک پیسہ عہ

اسد دافع بخار — دو ایک پڑیوں سے بخار اتر جاتا ہے اور پسینہ خوب آتا ہے۔ قیمت ۲ درجن عہ

دمہ یا ضیق النفس — سانس کا رکنا اور بلغم دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے

رعنا — چہرہ کے داغ دھبے دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ

سفوف درد گردہ — دردہ و درد گردہ اور پتھری نکال کر خارج ہو جاتی ہے۔ ۲ تولہ عہ

اکسیر شفا — دوائی طاقت بطور حفظ ماتقدم کے صدہا سے مفید ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ عہ

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور (موچی دروازہ)

بذریعہ مشین تیار کردہ خوشبودار عطریات و تیل

اعلیٰ درجہ کی دیسی و انگریزی عطریات خرید نا چاہیں ہمارا

فوراً ہی ہم سے منگا لیجئے ...

نا ظرین! مندرجہ ذیل عطریات اپنی بذریعہ مشین تیار کردہ کی ہی میں منگا کر ملاحظہ فرمائیں

لونڈر آئل صاحب کا تیار کردہ - یہ انگریزی قسم کا عطر ہے۔ جس کی خوشبو نہایت ہی خوشگوار اور اصلی معلوم ہوتی ہے۔ قیمت فی شیشی عہ

عطر حنا	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر فتنہ	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر گلاب	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر حسن	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر چنبیلی	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر عنبر	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر موتیا	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر کیوڑہ	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ
عطر موتیا	فی تولہ صہ - للعہ - عا - عہ

ہر ایک قسم کے خوشبودار روغن بھی ہمارے ہاں موجود ہیں۔ منگائیے فی سیر چار روپے سے لیکر دو روپے تک خرچ ڈاک بذمہ خریدار

ملنے کا پتہ: منیجر دی حمیدیہ ٹریڈنگ کمپنی سٹی سیالکوٹ پنجاب

تجارتی ٹوکری اپنی آزمانے کے ترجیح دیں جو کرنا بھی چاہیں



سچا مونچھ کالا

کئی روز کے استعمال سے مونچھ کے بال بڑھ جاتے ہیں ہزارہا اشخاص فائدہ اٹھا چکے ہیں

ہزارہا اسنادات موجود - شیشی کلاں (عہ) خورد (عہ)

گارنٹی سکوپ سسٹم واچ پانچ سال



قیمت (للعہ)

گھڑی کی تعریف چنداں ضرورت نہیں ... کے اگر خواہشمند ہو تو فوراً درخواست کریں

دی حمیدیہ ٹریڈنگ کمپنی سیالکوٹ (پنجاب)

طلسمی منجن دنداں

جس سے پہلے آپ نے بہت منجن وغیرہ کو استعمال کیا ہوگا - مگر یہ منجن نہیں آپ نظر سے ... دانت ہلتے ہوں - درد کرتے ہوں - مسوڑھے پھول گئے ہوں - دانتوں سے خون بہتا ہو - میل جم کر دانت خراب ہو گئے ہوں اور کیڑا لگ گیا ہو - منہ سے بو آتی ہو - ٹھنڈا پانی پیتے وقت دانتوں میں درد ہوتا ہو - تو ہمارا ایجاد کردہ منجن دنداں استعمال کریں - خلیفہ کہتے ہیں کہ مندرجہ بالا امراض دور ہو کر دانت موتیوں کی مانند چمکدار ہو جاویں گے۔

قیمت فی بکس جو چھ ماہ کیلئے کافی ہے (۸؍) محصول ڈاک علاوہ

رجسٹری انکوائری و منجن دنداں: ایم علی الدین بیرون دروازہ بانسانوالہ شہر سیالکوٹ (پنجاب)

ممیرہ اور سچے موتیون کا سفید سرمہ

مصدقہ جناب نامی گرامی ڈاکٹر ڈبلیو آر کرائیمر صاحب بہادر
الف-سی-ایس-اے-آر-ایس-ایم-فیلو آف کمسٹری لندن

جسکی نسبت **لندن** و کلکتہ و پنجاب و آگرہ و میڈیکل کالج کے سند یافتہ معزز ڈاکٹران و نوابون و راجاؤن کے معزز حکیمون و صاحبان جج بہادر و مجسٹریٹ بہادر و صاحبان ڈپٹی کلکٹران بہادر و معزز یورپین صاحبان انگریز بہادر و غیرہ نے بعد تجربہ و استعمال کے ہمکو یہ لکھا ہے کہ آپ کا **ممیرہ و سچے موتیون کا سفید سرمہ** آنکھونکی بیماریون و ترقی روشنی کیواسطے بہت مفید اور سب سے بہتر و زود اثر ثابت ہوا ہے۔ کہ جسکے سارٹیفکیٹ بوقت فرمایش آپ کی خدمت مین ہم خود بھیجینگے **ملک روس** وغیرہ کے معزز ڈاکٹران و ہندوستان کے معزز ڈاکٹران و حکیم آنکھونکی بیماریون مین اور **دوا** کو چھوڑکر ہماری اس **دوا** کو استعمال کرتے ہین۔
ہم نے اصلی و عمدہ **ممیرہ** بڑی تلاش سے ہندوستان کے باہر سے منگوایا ہے۔

ہمارے سرمہ کا امتحان اور اوسمین جلد کامیابی

نگاہ ناپکر ہمارا سرمہ لگائیے دو ہفتے مین روشنی آنکھ بہت بڑھ جائیگی اور آنکھ کے جملہ نقص دور ہو جاتے ہین (۲) عینک کی ضرورت نہین رہیگی (۳) دھند-ڈھلکا-آنسو بہنا-سرخی-سوزش-کھجلی-آنکھ کے سامنے کا اندھیرا-پلکون کے اندر کے دانے و سرخی-گوہانجی (۱۲) لکھنے پڑھنے سے آنکھون کا تکان-درد بہت جلد خرطیہ رفع کرتا ہے (۱۴) کمزور نگاہ سے سوئی مین تاگا بہت جلد چھوڑ لیجیے-پرتوال-شبل-جالا-پھولی-ابتدائی موتیا بند-ناخونہ-لکرستے-(۲۲) آنکھو نمین ترنج دور سے پڑجانیکو (۲۳) پلکین گرجانیوالی بیماری کو مفید ہے (۲۴) کمزور آنکھ کو قوت دیتا ہے (۲۵) آنکھو نکا میل و مواد صاف کرتا ہے اور تمام امراض سے محفوظ رکھتا ہے۔ قیمت فی تولہ تین روپیہ ۳ محصول ۴

المشتہر رام سرن نگم کانپور
اپنا نام و مقام و نام ڈاک خانہ و ضلع خوشخط لکھو ورنہ تعمیل نہ ہوگی

چند معزز اور قابل قدر ولائق اطمینان شہادتین

(۱) عالیجناب ڈاکٹر اے وی روز صاحب بہادر آر ڈی-ایم-پی-ایل-**لندن**-
(۲) جناب ڈاکٹر اے ایچ-پی-بنرجی صاحب-ایل ایم-ایس-و سرجن کلکتہ-
(۳) جناب ڈاکٹر پی-این بنرجی صاحب ایل-ایم-ایس-اسسٹنٹ سرجن میرٹھ-
(۴) جناب ڈاکٹر اللہ یار خان صاحب ایس-جی-سی-پاسپشل اسسٹنٹ ضلع بجنور
(۵) جناب ڈاکٹر عبد الصمد خان صاحب اسپشل اسسٹنٹ ضلع کانپور

(۶) عالیجناب شمس العلما رخان بہادر جناب مولوی محمد ذکاء اللہ صاحب پروفیسر سابق میور کالج الہ آباد
(۷) عالیجناب مولوی نصیر الدین احمد صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر و اسسٹنٹ مہتمم بندوبست کانپور
(۸) عالیجناب میر حمزہ حسین صاحب بی-اے-بی-ایل-سب جج بہادر مقام منگلور-
(۹) عالیجناب مولوی سید حامد حسین صاحب منصف درجہ اول ضلع ہمیرپور-
(۱۰) عالیجناب منشی جیت لال صاحب ڈپٹی کلکٹر بہادر ضلع بستی

(۱۱) عالیجناب مسٹر جین بہاری صاحب کرجی-ایم-اے ایل-ایل-بی سشن جج بہادر گونڈا-
(۱۲) عالیجناب مسٹر نیل مادھب رائے صاحب-بی ایم-بی-ایل-جج خفیفہ بہادر کانپور-
(۱۳) عالیجناب مسٹر سنت لال صاحب سٹی مجسٹریٹ بہادر مقام منڈلیر-
(۱۴) عالیجناب مسٹر جی ڈاربی صاحب بہادر اودر نار تھ ویسٹ میں کانپور-
(۱۵) عالیجناب جی-بال صاحب بہادر انجینیر ریلوے-

المشتہر رام سرن نگم-کانپور-

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اول ۵ روپے فی پرچہ ۸ قسم دوم (۳) فی پرچہ ۴ آنہ

جلد ۸ — مارچ سنہ ۱۹۰۵ء — نمبر (۶)

ایڈیٹر شیخ عبد القادر بی اے

مخزن

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

مضامین — نثر — نظم



نوکروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں۔ اور ... ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں

⊡ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ⊙ ان شہروں میں اردو مروج ہے ⊕ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

خادم التعلیم سٹیم پریس لاہور میں منشی عبد العزیز کے اہتمام سے طبع ہوا
اور شیخ محمد اکرام اسسٹنٹ ایڈیٹر نے شائع کیا



میرے شہر میں پلیگ ہے
موت کا خوفناک نظارہ - ہر طرف سے لوگوں کی آہ
وزاری اپنی نوجوانی - عورت اور بچوں کی بیکسی
کا خیال مجھے پریشان کئے جاتا ہے - ہر ایک آدمی
زندگی سے بیزار - موت کا منتظر دکھائی دیتا ہے -
کچھ نہیں سوجھتا کیا کروں کہاں جاؤں کدھر
بھاگوں ہر طرف موت منہہ پسارے کھڑی ہے
فرشتہ :- او بزدل بے خبر
انسان! اتنا مت ڈر - ہوش وحواس کو قائم رکھ مری
بات کو غور سے سن - کہیں بھاگنے کی ضرورت نہیں - اٹھ

مخزن

ہربرٹ سپنسر

(۱۸۲۰ء سے ۱۹۰۳ء تک)

فلسفۂ جدید کی تاریخ گذشتہ صدی کے نامورں میں ہربرٹ سپنسر سے بڑا آدمی شاید مشکل ہی پیش کر سکے ۔ اس عالی دماغ شخص کے حالاتِ زندگی کون نہیں سُننا چاہتا ۔ اور اگر خود سپنسر کی زبانی سُنے جاسکیں تو اس سے بہتر ۔ حال میں اس کی اپنی تصنیف کی ہوئی سوانح عمری دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ سپنسر اُن لوگوں میں سے تھا جو اپنی رسائیِ ذہن اور قدرتی طباعی کے سوا تلمذ کے ممنون یا کسی یونیورسٹی کی تعلیم کے مشکور نہیں ہوتے اور محض اپنی محنت اور ہمت سے وُہ نام پیدا کرتے ہیں کہ دُنیا دنگ رہ جاتی ہے ۔ اہلِ علم کے دلوں پر ابھی اس بلند پایہ فلسفی کے دُنیا سے اُٹھ جانے کا داغ تازہ ہے اور اس لئے اُس کے حالات اور بھی دلچسپی رکھتے ہیں ۔ سپنسر نے اِس کتاب میں اپنے حالات کی تفصیل اور اپنے خیالات کی توضیح میں اسی شوقِ تجزیہ سے کام لیا ہے ۔ جس سے علمِ کیمیا کا ماہر حقیقتِ اشیا دریافت کرتے وقت اور علمِ نباتات جاننے والا کسی پھول یا پتے کی تشریح کرتے ہوئے لیتا ہے ۔ عبارت کے لحاظ سے یہ کتاب اس کے طرزِ تحریر کا عمدہ نمونہ نہیں کہی جاسکتی ۔ کیونکہ اُس نے اِسے عجب دقتوں کے باوجود تکمیل کو پہنچایا ۔ پہلے ۱۸۷۵ء میں اُس نے اپنی زندگی کے واقعات کا ایک ڈھانچہ ساکئی نشستوں میں کسی سے لکھوایا ۔ وُہ بولتا جاتا

تھا اور کاتب لکھتا جاتا تھا۔ پھر اور کتابوں کی تصنیف میں مصروف ہو گیا اور سوانح عمری کی ترتیب کا کام ویسے ہی پڑا رہا۔ کوئی دس سال بعد اس کی صحت پہلی دفعہ بگڑی۔ اور دماغی محنت کی کثرت کے سبب ایسا معلوم ہوا کہ شاید قوٰی نے جواب دیدیا ہے۔ مگر ایسے آدمی سے نچلا کب بیٹھا جاتا تھا۔ سوانح عمری کے وہ اوراقِ پریشاں یاد آئے اور سنہ ۱۸۶۶ء میں اسے شغلِ بیکاری سمجھ کر پھر اٹھا لیا۔ کیونکہ کوئی ایسا کام جس کے لئے زیادہ دماغ سوزی درکار ہو اُن دنوں ممکن نہ تھا۔ دن میں کسی وقت جب طبیعت بیکاری سے بالکل گھبرا جاتی تو ۱۸۶۶ء کی یادداشتوں کو ذرا وضاحت سے لکھ لیتا۔ مگر واقعات بہ پابندیِ تاریخ وقوع درج نہ ہو سکے۔ سپنسر کو ہر وقت یہ خیال ستاتا رہتا تھا۔ کہ شاید مفصل حالات کے قلمبند کرنے کے لئے اُس کی زندگی وفا نہ کرے۔ اس لئے اُس نے یہ ارادہ کر لیا۔ کہ پہلے ضروری ضروری باتیں لکھ دی جاویں۔ مگر اسی اثنا میں صحت درست ہو چلی۔ اور اُس نے بعد ازاں کئی باتیں جو پہلے چھوٹ گئی تھیں۔ جا بجا بڑھا دیں۔ ان اسباب سے ترتیب اور خوبیِ عبارت میں تو خلل آگیا۔ تاہم ہمیں اُس کا مشکور ہونا چاہئے کہ ہمارے لئے اپنی مستند تصویر چھوڑ گیا۔ جسے اُس کے بعد اشاعت نصیب ہوئی۔

عجیب بات ہے کہ ابتدائے عمر میں سپنسر بالکل معمولی قابلیت کا آدمی نظر آتا ہے۔ ریاضی میں تھوڑی سی واقفیت کے سوا جو مدرسے میں پیدا کی اور سائنس سے کچھ ضعیف شناسائی کے علاوہ جو بطورِ خود قدرتی مذاق کی وجہ سے حاصل کی۔ سپنسر اس چیز سے جسے عرف میں "تعلیم" کہتے ہیں۔ بے بہرہ تھا۔ اٹھارویں برس میں وہ اپنی تعلیمی حالت کا نقشہ یوں کھینچتا ہے:۔

ریاضی خاصی آچلی تھی۔ اور اسی لئے قوتِ استدلال مضبوط ہو گئی تھی۔ مگر زبانیں سیکھنے میں مجھے بہت کم کامیابی ہوئی۔ فرانسیسی کا تو سوائے گرامر کے ابتدائی حصے اور ایک فقروں کی کتاب کے چند صفحوں کے میں کچھ نہ پڑھ سکا۔ یونانی میں بھی قدرے صرف و نحو اور انجیل کے

چند بابوں کا ترجمہ اور لاطینی کی کسی آسان سی کتاب کا ترجمہ میں کر سکتا تھا ۔ مگر اس میں غلطیاں رہ جاتی تھیں ۔ ہنٹن میں تعلیم کا احاطہ محدود تھا ۔ تاریخ تو پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی ۔ عام علم ادب کی طرف کوئی توجہ نہ تھی ۔ عملی علوم طبعیات داخل نصاب نہ تھے ۔ اور نظم اور افسانے خارج از علوم سمجھے جاتے تھے"۔

سپنسر کی باقاعدہ درسی تعلیم کا مندرجہ بالا تفصیل پر خاتمہ ہو گیا ۔ اس کے بعد وہ فن انجنیری کی تحصیل میں لگا دیا گیا ۔ اور اکیسویں برس تک اسی شغل میں مشغول رہا ۔ کبھی لندن کے ریل کے کارخانوں میں اور کبھی برمنگھم میں وہ کام سیکھتا رہا ۔ شوق علم اس عرصے میں بھی طبعیت کو گدگدائے بغیر نہ رہ سکا ۔ اور اس لئے وہ اوقات فرصت میں ریاضیات میں اپنا علم بڑھاتا رہا ۔ اس زمانے میں سپنسر نے جو خطوط اپنے باپ کو لکھے ہیں وہ مسائل اقلیدس سے پُر ہیں ۔ اور کبھی کبھی وہ اپنے فن کے متعلق یا علم طبعی کے متعلق بھی ان میں بحث کرتا تھا ۔ اس کا باپ فزکس (طبعیات) اور کمسٹری (علم کیمیا) کا شائق تھا اور کچھ لوگ اس سے یہ علوم پڑھتے تھے ۔ اس لئے سپنسر کو بھی بچپن ہی سے ان میں تھوڑا سا مذاق پیدا ہو گیا تھا ۔ جن دنوں وہ کام سیکھ رہا تھا ان دنوں میں چند لکچر علم کیمیا پر ہوئے اور ان کے سننے سے اس علم کی چند کتابیں پڑھنے کی طرف رغبت ہوئی ۔ اور اسی زمانے میں ایک کتاب علم طبقات الارض کی خریدی اور پڑھی ۔ مگر ان عملی چیزوں کی طرف میلان کے سوا اس زمانے میں گہرے فلسفیانہ مسائل پر غور و فکر کا کہیں پتہ بھی نہ تھا ۔ اُس وقت کوئی اس نوجوان انجنیر کو دیکھ کر گمان تک نہیں کر سکتا تھا کہ علم ما بعد الطبعیۃ کے مطالعے کے لئے جس نازک خیالی کی ضرورت ہے اور جس قدر جذبات سے بھری ہوئی طبعیت درکار ہے ۔ اُس کا کوئی حصہ اس شخص میں موجود ہے ۔ یہ باتیں عموماً مذہبی طبائع میں ہوتی ہیں ۔ اور مذہب سے سپنسر کو بالکل ناموافقت تھی ۔ یہ ناموافقت ایک حد تک تو بعض موروثی خواص کا نتیجہ تھی اور ایک حد تک اس کی خصوصیت تھی ۔ اپنے بزرگوں کے خواص وہ یوں شمار کرتا ہے :- آزادہ روی

خودرائی - انکارِ تقلید اور سیاسی - تمدنی اور اخلاقی امور میں اپنی رائے کا صاف اور بے دھڑک اظہار - اس لئے کچھ تعجب نہیں - اگر ایسے بزرگوں کی اولاد مذہب سے اس درجہ بے پرواہ ہو - جیسا کہ سپنسر ذیل کی عبارت میں نظر آتا ہے : — "مذہبِ عیسائیت باعتبارِ میرے جذبات اور میرے قوائے ذہنی کے میری فطرت سے بیگانہ ہے - بہت لوگوں کو عبادت مذہبی سے ایک قسم کی فرحت ہوتی ہے - مگر مجھے کبھی نہیں ہوئی - البتہ گرجے کی موسیقی سے جو اثر قلب پر پیدا ہوتا ہے اُسے مستثنیٰ رکھتا ہوں - مگر ایک شخصی وجود کی مدح و ثنا - اور اس کے سامنے اپنی اطاعت اور عجز کا اظہار ایسی آوازیں ہیں - جن کی صدا میرے دل سے کبھی نہیں اُٹھی"۔

تحصیل فن کے زمانے میں سپنسر کو نوکری بھی مل گئی تھی - مگر اکیسویں برس میں ہی اُس نے اس ملازمت کو خیرباد کہا - تاکہ ایک کل بنانے میں جو برقی اور مقناطیسی دونوں قوتوں سے کام لے اور جس کی تجویز اس کے باپ کو سوجھی تھی - اپنا سارا وقت صرف کر سکے - لیکن ایک مہینے کی لگاتار محنت سے یہ معلوم ہوا کہ وُہ تجویز عملی صُورت میں نہیں آسکتی - مایوس ہو کے رہ گیا - اس کے بعد سات سال تک بے ٹھکانہ سی زندگی کٹی کئی دفعہ انجنیری کی عارضی ملازمت منظور کی - پر سات برس میں کُل ڈیڑھ برس ملازمت کا آیا - اور باقی وقت نئی تجویزیں سوچنے اور اُن کا امتحان کرنے میں ضائع ہوا - بغیر اس کے کہ اُن سے کوئی عملی نتیجہ مترتب ہو - اِن تجاویز کا مقصد یہ تھا کہ کوئی نئی دریافت یا ایجاد ایسی ہو جس سے مالی نفع پہنچے - لیکن یہ محنت رائگان گئی اور گو بعض چیزیں ابتدا میں اُمید دلانے والی نظر آئیں - امید جلد مبدل بہ مایوسی ہوتی گئی -

۱۸۴۲ء میں جب اس کی عُمر بائیس برس کی تھی - ہم اُسے میدانِ تصنیف میں قدم رکھتے ہُوئے دیکھتے ہیں - اُس کی پہلی کتاب ایک پولٹیکل رسالہ تھا - جس میں حکومت کے حدود و مناسب مقرر کئے گئے تھے - اس میں بعض رائیں ایسی تھیں - جنہیں بعد میں سپنسر کو

بدلنا پڑا۔ مگر غور سے دیکھیں تو اس کے پولیٹکل فلسفے کے سب اصول اس رسالے میں آگئے تھے۔ اس کا بیان ہے کہ اسی رسالے سے بعد کی مشہور کتابیں نکلیں۔ کتاب سوشل سٹیٹکس کا خیال اسی سے پیدا ہوا۔ اور جن تمدنی امور سے اس میں بحث تھی۔ ان پر غور کرتے ہوئے۔ پرنسپلز اف سائیکولوجی (یعنی علم النفس کے اصول) کی نوبت آئی۔

سنہ ۱۸۴۶ء میں سپنسر نے چند کتابوں کا مسلسل مطالعہ شروع کیا۔ تاکہ فلسفے پر کتاب لکھے سنہ ۱۸۴۷ء میں اس کے پاس موزوزہ کتاب "مارل فلاسفی" کے لئے کافی مواد جمع ہوگیا اور یہ مواد اس کے دماغ میں کھولنے لگا۔ اور اسی سال کے ماہ ستمبر میں اس نے دیباچے کے تین صفحے لکھ کر اپنے باپ کے پاس بھیج دیئے۔ سنہ ۱۸۴۸ء میں گو اپنے مستقبل کے متعلق وہ معرضِ اندیشہ میں تھا۔ تاہم ڈربی کے گرد و نواح کے کھیتوں میں گھومتے ہوئے وہ اس کتاب کے اگلے باب سوچتا رہا۔ اور یہ اس کی عادت تھی کہ سوچ کے لئے اس کی طبیعت سیر ہی کے وقت حاضر ہوتی تھی۔ سنہ ۱۸۴۹ء میں آیندہ کی تجاویز ایسی غیر متیقن تھیں۔ کہ اس کا ارادہ ہوا تھا کہ نیوزی لینڈ میں جا بسے۔ کبھی یہ ارادہ ہوتا تھا کہ باپ کے ساتھ شریک ہو کر ایک نیا مدرسہ جاری کرے۔ مگر اختتام سال سے پہلے اسکو اخبار اکانومسٹ کی نائب اڈیٹری مل گئی اور اس تشویش کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی ثابت قدمی کے ساتھ ایک منزل کی طرف ترقی کرتی گئی۔ سب سے پہلے کتاب "سوشل سٹیٹکس" تیار ہوئی۔ لندن میں جو پہلا سال گذرا۔ اس کی راتیں اس تصنیف کے لئے وقف رہیں۔ طرزِ تحریر کی طرف اس زمانے میں بہت توجہ تھی۔ سنہ ۱۸۵۰ء کے آخر میں یہ کتاب شائع ہوئی۔

سنہ ۱۸۵۰ء اور سنہ ۱۸۶۰ء کے درمیان جو دس سال کا عرصہ گذرا۔ اس کے متعلق سب سے زیادہ دلچسپ بات یہی ہے کہ اس عرصے میں سپنسر کے دل میں ایک نظام فلسفی کے خیال کا ارتقاء جاری رہا۔ انہی دنوں میں جارج ایلیٹ (مشہور افسانہ نگار) سے اس کی ملاقات ہوئی اور جارج لوئیس (مصنفِ تاریخ فلسفہ) ہکسلے اور ٹنڈل (مشہور سائنس دان) سے دوستی اور رسم پیدا ہوئی۔ جو مدت العمر قائم رہی۔ لوئیس کی دوستی کے لحاظ سے اس نے لوئیس کی مشہور

معروف کتاب "تاریخ فلسفہ" پڑھی اور اُس کا تعارف فلسفیانہ خیالات سے اسی کتاب کی بدولت ہُوا۔ وُہ خود معترف ہے کہ اس وقت تک فلسفی مسائل کی طرف اس کی توجہ نہیں ہُوئی تھی۔ اِس سلسلے کا چھڑنا تھا۔ کہ پھر بقیۂ عُمر فلسفی تصانیف کی ہی نذر ہوگئی۔ ۱۸۶۲ء میں اس کی نامور کتاب "اے سسٹم آف سنتھیٹک فلسفی" شائع ہُوئی۔ اور ۱۸۹۶ء میں اِس کی طبع ثانی کی نوبت آئی۔ سپنسر کا فلسفہ بحیثیت جدت اور زورِ بیان میدانِ قبولیت میں تو گوئے سبقت لے گیا۔ مگر واقفانِ فن کی نقادانہ رائے یہ ہے کہ اُس میں ابتدائی تعلیم میں فلسفے کی ناواقفیت کے آثار موجُود ہیں اور نتائج کے استنباط میں لغزش کئی جگہ نظر آتی ہے۔ تاہم اس کی کتابیں اپنے رنگ میں لاجواب ہیں اور دیر تک وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائینگی۔

اُنیسویں صدی کے عقائد میں قانونِ ارتقاء (ایوولیوشن) سب سے زیادہ معقُول نظر آتا ہے۔ اور گو یہ کہنا آسان نہیں کہ بیسویں صدی کے اختتام پر دُنیا اس مسئلے کو اُسی طرح تسلیم کریگی جس طرح اُنیسویں صدی کے اخیر میں کرتی تھی۔ تاہم اس کی موجُودہ وقعت کا لحاظ اس کے سب سے بڑے حامی کی توقیر پر مجبُور کرتا ہے۔ ڈاروِن اس نئے زمانے میں اس کا محرک اور سپنسر اس کا بڑا موید تھا۔ اور اس بارے میں اس کے عقائد کا اندازہ مندرجہ ذیل عبارت سے جو اس کی پہلی تصنیف سے ماخوذ ہیں۔ ہو سکتا ہے:۔

"ترقی کوئی اتفاقی امر نہیں۔ بلکہ لازمۂ ہستی ہے۔ تہذیب بجائے مصنوعی چیز ہونے کے فطرت کا اُسی طرح ایک حصہ ہے۔ جیسے جنین کا ترقی کرتے کرتے بچّے کی صُورت اختیار کرنا اور کلی کا کھِل کر پھُول بننا۔ جو جو تبدیلیاں بنی نوعِ انسان میں واقع ہُوئی ہیں اور ہو رہی ہیں وُہ وُہ اسی قانون کا نتیجہ ہیں جو ساری ذی حیات مخلوقات پر حاوی ہے۔ اور بشرطیکہ نسلِ اِنسانی قائم اور ترکیبِ اشیا بحالتِ موجُودہ رہے۔ اِن تبدیلیوں کا لازمی نتیجہ تکمیل ہے۔ جیساکہ یہ یقینی ہے کہ درخت اکیلا نمو پاتا ہے تو تناور ہو جاتا ہے اور اگر جھنڈ میں سے ایک ہو تو پتلا سا رہتا ہے۔ یا جیساکہ گھوڑا حسبِ ضرورت گاڑی میں جوتنے کے لائق یا

گھوڑدوڑ میں دَوڑنے کے لائق بنتا ہے۔ اِسی طرح یقینی ہے کہ انسان کے قوا جسمانی وذہنی اس کی تمدّنی حالت کے عین متناسب رہنے کے لئے سانچے میں ڈھلتے ہیں اور اسی طرح لازم ہے کہ وُہ چیزیں جنہیں ہم بُرائی اور بداخلاقی سے تعبیر کرتے ہیں رفتہ رفتہ غیر موجود ہوجائیں اور انسان انسانِ کامل بنجائے"۔ پھر اُسی کتاب کے ایک اور حصّے میں :۔

"ایک زبردست حرکت ہے جو ہمیشہ تکمیل کی طرف لیجارہی ہے۔ اس کی عمومیت اس درجے کی ہے کہ تمام خفیف بے قاعدگیاں اور کوتاہیاں اُس کے آگے ہیچ ہیں۔ جیسا کہ زمین کی گولائی کے خم کے سامنے کوہ و وادی دونوں بے حقیقت ہیں۔ نظرِ غائر نقائص میں بھی خواہشِ تکمیل کی جدوجہد کا ظہور پاتی ہے۔ غور کرنے والے شخص کو جو بات سب سے بڑھ کر حیرت میں ڈالتی ہے اصلی کفایتِ اشیا ہے۔ اور وُہ بظاہر پیچیدہ مگر درحقیقت سادہ اصُول جس سے ہر نقص کی اصلاح خودبخود ہوتی رہتی ہے۔ وُہی اصُول جس سے نجوم بعد حرکت اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ جس سے زخمی انگلی خودبخود درست ہوجاتی ہے۔ جو نظامِ تمدّن کے پلڑے برابر رکھتا ہے۔ جو نابینا آدمی کی شنوائی بڑھا دیتا ہے۔ جو قیمت کو پیداوار کی مقدار کے متناسب کرتا ہے اور جو ایک پُودے کو نئی آب وہوا کا عادی بنا دیتا ہے۔ سوچنے والا آدمی روز بروز انتظامِ فطرت میں نیا حسن دیکھنے لگتا ہے۔ چشمِ بصیرت کھُلتے ہی اُسے اعلیٰ موزونیت دکھلانے لگتی اور اُس کے دِل میں گہرا عقیدہ جمانے لگتی ہے۔ جب اس کے قلب پر یہ کیفیت طاری ہوتی ہے تو اُسے کسی سطحی خیال کے شخص کا اُٹھ کر یہ دعوے کرنا کہ وُہ کسی طرح فطرت کی اصلاح کرسکتا ہے اور اس بے عیب جامے میں ٹھگلی لگا سکتا ہے کتنا بُرا معلوم ہوتا ہے۔ اِن حضرت کی صُورت تو ملاحظہ ہو۔ کہ ایسے عجائبات سے تو گھرے ہُوئے ہیں اور پھر انہیں یہ جُرأت ہو کہ اس امر کا اعلان کریں کہ انہوں نے اور ان کے چند ہمعصروں نے باہمی مشورہ کرکے خدائی انتظام میں اصلاح کا کوئی طریقہ ایجاد کیا ہے! یہ دخل درمعقولات دینے والے۔ یہ خودبخود دُنیا جہان کی خبرگیری

کا بیڑا اُٹھانے والے۔ قوانینِ قدرت پر اس قدر کم اور اپنی قابلیت پر اس قدر زیادہ بھروسا رکھتے ہیں۔ کہ اگر ان کی چلنے پائے تو آج ہی سورج اور زمین کو ایک مضبوط زنجیر سے جکڑ دیں۔ کہ کہیں وُہ قوت جو اس وقت دونوں کو قائم رکھے ہوئے ہے اچانک عمل کرنے سے نہ رہ جائے۔ گویا ان کے نزدیک کوئی قاعدہ جو پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین کے مشابہ نہ ہو قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ ہے خلاصہ اُن حیرت انگیز عقائد کا جو ان ترمیم کنندگانِ تخلیق کا شعار ہیں۔"

مندرجہ بالا عبارات ظاہر کرتی ہیں۔ کہ سپنسر گو بعض باتوں میں نیا تھا۔ مگر اس پرانے مسئلے میں کہ دُنیا کی تجویز اس سے بہتر ہو ہی نہیں سکتی۔ متقدمین سے نہایت خوش عقیدہ لوگوں کا ہم خیال ہے۔ اس کی تصانیف کے بعض حصے جہاں لامذہبی کا اظہار کرتے ہیں وہیں ایسی عبارتیں خدا کی خدائی کا بے اختیارانہ اعتراف کر رہی ہیں۔ اور انہیں پڑھتے ہوئے حالی کا وُہ شعر یاد آتا ہے ؎

مانا نہیں جس نے تجھ کو جانا ہے ضرور بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

اس کی آخری کتاب یعنی سوانح عمری میں جو اس کے پسِ مرگ شائع ہوئی ہے۔ نہایت دلچسپ بات یہی ہے۔ کہ اس نے اپنے حالات اور خیالات بلا کم و کاست لکھ دیئے ہیں اور اپنے نقائص کا بے حجاب اقرار کیا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی خوبیوں کا گہرا نقش دل پر بیٹھتا جاتا ہے اور خوبیاں عیوب کو بھلا دیتی ہیں۔ اس کی اعلیٰ درجے کی دیانتداری۔ بے دھڑک اخلاقی جرأت۔ مثالیہ کی بلندی۔ چند مشکلات کے باوجود اپنے مثالیہ کو عملی صورت دینا۔ عادات کی سادگی۔ ابنائے جنس کی صحت کی جستجو۔ بچوں کی محبت اور دیرپا دوستیاں قائم کرنے کی قابلیت ایسی خصلتیں ہیں۔ جن کی تعریف کئے بغیر رہا نہیں جاسکتا اور اس سوانح عمری کو پڑھنے والا کتاب کو پسند کرتے وقت مصنف کی بحیثیتِ انسانی سچی تعظیم اپنے دل میں پاتا ہے۔ اور اس بڑے فلسفی کے خیالات سے خواہ اُسے اتفاق ہو یا نہ ہو۔ اس کو بڑا آدمی تسلیم کرنے میں انکار کی گنجائش نہیں رہتی +

عبدالقادر (از لندن)

اِنسانی افعالِ اطاعت

(سلسلے کے لئے جنوری ۱۹۱۰ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

آغاز میں پرستش بزرگون کی ہوئی - ترقی کرتے کرتے دیوی دیوتا کی پرستش میں مبدّل ہوگئی - اس طریق پر کہ جب ایک معمولی شخص کے مرجانے پر اس کی متوفّی کی ناراضگی سے خائف ہوکر اُس کے لئے غذا و لباس کی فکر شروع ہوئی - یا مُردہ کو کفن پہنانا - اُس کی قبر پر قربانیاں یا غذا کا چھوڑ دیا جانا شروع ہوا - تو ایک ایسے شخص کی حالت میں جو زندگی میں بہت زبردست اور جابر ہوتا تھا - اور جس کا دائرہ حکومت وسیع ہوتا تھا - بعد مرگ اُس کے متوفّی کے عتاب اور خفگی سے بھی مقابلتاً زیادہ خائف ہوکر اس کی تعظیم یا رضاجوئی بھی اسی کے مطابق شروع ہوئی - اور بجائے اس کے کہ ایک یا دو دفعہ صرف اشیاء مطلوبہ وہاں چھوڑ دی جاویں ہر روز یا اکثر مقبرہ کے نزدیک تحفہ تحائف نذر کئے جانے شروع ہوئے - ساتھ ہی ایک معمولی شخص کی حالت میں صرف اس کے متعلقین و پس ماندگان کو خیال حصولِ خوشنودی ہوتا تھا - کہ بھوکا - پیاسا بکر یا ننگا رہکر مردے کا متوفّی اپنے رشتہ داروں کو جن سے اسکو توقع غذا و لباس پہنچانے کی ہوسکتی تھی - انکو تکلیف نہ دیوے - ایک مرحوم بادشاہ یا شخص جابر کے مُردے سے بہت سے اشخاص کہ جو زندگی میں اس زبردست حاکم کی رعایا ہوتے تھے - خوف و ہراس ہونے کی وجہ سے عام طور پر مختلف اشخاص کی جانب سے اس کی خاطر داری یعنی اس کی پرستش شروع ہوئی - ڈالی کی شکل میں تبدیلی واقع ہوئی - اس کا نام بدل دیا گیا - گو ماہیت اور اصل مدعا یعنے حصولِ رضا - وہی رہی - بجائے مکان کے مقبرے کو مندر یا شوالہ کہنے لگے - غذا کا نام بھینٹ یا نذر یا قربانی یا چڑھاوا قرار پایا - اور متوفّی بادشاہ کے متوفّی کو دیوتا کہنے لگے اور اس کی تانیث دیوی کہلانے لگی - آخر میں متوفّی کی نسبت انسانی عقیدہ بدلا تاہم پرانی رسم و طریق کو قائم رکھکر اس خیال کو دوسرے

لباس میں دکھلایا گیا۔ کہ دیوی اور دیوتا۔ طاقت کا صرف ظہور ہیں۔ اور ان کی پرستش ایک زینہ ہے جس سے انسان خالق کی پرستش کر سکتا ہے یہ تو مابعد کے دلائل یا تعبیریں ہوتی ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ آغاز اس پرستش کا شئے کے عقب پر سے ہوا۔ اور ترقی شدہ حالت میں بھی یہ طریق جاری رہا۔ گو اس وقت مختلف تفسیریں اس خیال کی کی گئیں۔ اور اس کے ابتدا اور اس کے ارتقا کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ خیال ترقی شدہ مذاہب میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ انجیل میں جلہوا یعنے بائبل کے خدا کو۔ گوشت روٹی میوہ اور شراب سے خوش کیا جانا مذکور ہے۔ حضرت ابراہیم سے جب خدا اُس کے خیمے میں مامری کے میدان میں مُلاقات کرنے آیا۔ تو تازہ اور گرما گرم روٹیوں سے اس کی خاطر مدارات کی گئی۔ اب اگر انسان اس کتاب کو جس میں صریحاً انسان کی گذشتہ ادنیٰ حالت کے وقت کا عقیدہ موجود ہو۔ یا جس میں خُدا کو انسانی خواص والا۔ اور انسانی جذبات والا مانا گیا ہو۔ الہامی نہ مانیں۔ تو اس کا کیا قصور۔ جس مذہب میں دیوی دیوتا کے۔ یا کسی طاقت کی پرستش نہ کی ہو۔ یا پرستش کی ہدایت ہو۔ ہر ایک عام عقل والا انسان اسکو الہامی ماننے میں سخت تامل کریگا۔ کیا وجہ کہ اس میں حالات عنا کا انسانی ارتقا۔ ایک گونہ موجود ہے۔ اصول ارتقار کے عمل کو سمجھنے والے بخوبی جانتے ہیں۔ کہ دیوی دیوتا یا کسی طاقت کی پرستش ہونے کے شئے کی پرستش کی ایک اعلیٰ صورت ہے۔

ملکی حالت کا ذکر کرتے وقت ہم نے یہ بیان کیا تھا کہ قوانین کی پابندی (جو اصل میں تابعداری حاکم ہوتی ہے) کے ساتھ گو بطور فرض نہیں لیکن بطور رواج۔ پُرانی رسم ڈالی تاہنوز قائم ہے۔ جس سے صرف بیرونی طور پر اظہار اطاعت مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح سے دینی قواعد یا مذہبی احکام دربارہ طریق عمل اخلاقی جو اصل مذہب ہے۔ اور جن کی تعمیل اصل تابعداری خالق کی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس کے ساتھ بعض اوقات بطور فرض۔ بعض اوقات بطور رسم و رواج۔ پُرانی رسُوم یعنی نذر نذرانہ قربانی یا بھینٹ وغیرہ تاہنوز قائم ہیں۔ غیر ضروری اصُول جن سے صرف خارجی طور پر اظہار اطاعت مقصود ہوتا ہے۔ گذشتہ ادنی حالت کے بقایا عقاید ہیں۔ شروع میں لوگوں کا عقیدہ تھا کہ

مندر بنانے۔ تیرتھ یاترا کرنے سے۔ گناہ معاف ہوجاتے ہیں۔ اور ایشور راضی ہو جاتا ہے۔ بعد میں جب غیر ضروری اور ضروری مسائل مذہبی میں تمیز ہو جاتی ہے۔ اور نیک افعال کا کرنا ہی حصولِ خوشنودی کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ تو مندر مسجد بنانے۔ حج کرنے۔ تیرتھ یاترا کرنے کے طریق کو اگر حصولِ خوشنودیِ خدا کے خیال سے نہیں۔ تو کسی اور وجہ معقول پر جاری رکھا جاتا ہے۔ جس طرح سے کہ ملکی حالت میں بادشاہ کا نذرانہ غیر لازمی سے لازمی بن گئے اور آخر میں ذاتی منفعت کے حصول کا خیال جاتا رہا اور یہ رسوم صرف بیرونی علامات متابعت رہ گئیں۔ اسی طرح سے شروع میں گو حاکمِ غائب و طاقتِ اعلیٰ کو تحفہ تحائف قربانیاں ذاتی منفعت کے خیال سے دی جانی جاری ہوئیں۔ لیکن آخر میں لازمی ہو کر صرف خارجی نشانِ اطاعت کی حیثیت میں قائم رہیں۔ اور جس طرح سے کہ ملکی حاکم اور اس کی ماتحت حکام کے تحفے وغیرہ ٹیکس اور معاوضہ و گذران میں تبدیل ہوگئے۔ اس طریق سے افراد کی آمدنی کا کچھ حصہ مندروں اور گرجوں کے برہمنوں اور پادریوں کا حق سمجھا گیا جنکے اختیار میں لوگوں کے عقاید کے مطابق فوایدِ آسمانی کی تقسیم تھی۔ ان کو تحفہ تحائف دیئے جانے شروع ہوئے اور آخر میں یہی انکے ذریعہ معاش بن گئے۔ مندروں کے چڑھاوے پجاریوں کا وسیلۂ آمدنی متصور کئے گئے۔ اور عموماً اور بہت سی رسومات مثلاً برت۔ کتھا وغیرہ کا آغاز ہوگیا۔ جن کے ادا کرنے میں تحفہ یا عوضانہ کا دینا رواج پاکر ایک مستقل ٹیکس یا خراج برہمنوں اور پجاریوں کے حق میں قائم ہوگیا +

۲۔ سلام

ملکی حاکم کی متابعت کی بیرونی علامات بطور حرکتِ اعضاء بدنی چار قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک کورنش یعنی عجز و انکسار۔ دوسرے ملاقات۔ سوم غلامانہ حرکات کرنا۔ چہارم نمائشِ فعالِ محبت۔

۱۔ سب سے ادنیٰ حالت اسلام کی کورنش ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر آئے ہیں۔ کتا جس کو مکمل اطاعت کا اظہار مطلوب ہو۔ منہ کے بل لیٹ کر ہولے ہولے آہستہ آہستہ لوٹتا ہے۔ اسی طرح سے ادنیٰ حالت

سوسائٹی میں جب ملکی حاکم کا غلبہ از حد زیادہ ہوتا ہے۔ اور مفتوح یا مغلوب کو مکمل اطاعت کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ تو سب سے اول پیٹھ کے بل لیٹ اِدھر اُدھر لوٹنا اور زبان سے ساتھ ہی شکریہ اور خوش آمدید کرتے جانے کا رواج ہوتا ہے۔ یہ طریق لونگ سٹون انگریزی سیاح نے افریقہ کی قوم بتوکہ میں بچشم خود دیکھا ہے۔ اِس حرکت سے چونکہ مقابلہ و مخالفت کا بالکل ترک کر دینا مقصود ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ سب سے مکمل لیکن سب سے ادنیٰ حالت ہوتی ہے۔ اِس کے بعد قریب کی ادنیٰ حالت وہ ہے کہ بالکل مُنہہ کے بل زمین پر لیٹ جانا۔ اور اپنی گردن پر دوسرے کو پاؤں رکھنے دینا۔ یہ اب تک بعض افریقہ کی وحشی اقوام میں جاری ہے۔ اِس کے بعد اختصار ہو جاتا ہے۔ اور صرف مُنہہ کے بل زمین پر لیٹے لیٹنے پر اکتفا ہوتا ہے۔ جُوں جُوں طاقت شاہی کا غلبہ کم ہوتا جاتا ہے۔ بیرونی علامات اطاعت کا اختصار ہوتا جاتا ہے۔ کورنش کی طرز یعنی درجہ وار اختصار اختیارات شاہی کے محدود ہوتے جانے کے ساتھ ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ اور ادنیٰ حالت یعنی مُنہہ کے بل زمین پر لیٹی ہُوئی حالت سے اُوپر اُٹھنے میں جو سلسلہ وار حالت بدلی دیکھی جاتی ہے۔ وُہی درجہ بدرجہ سوسائٹی میں مروّج ہو گئی ہے۔ اوّل ہاتھ پاؤں اور زانو اور ماتھا سب زمین پر لگے ہوتے ہیں۔ صرف پیٹ اُوپر کو اُٹھی ہوتی ہے۔ بعد ازاں سر بھی اُٹھا ہوتا ہے۔ اِس کے بعد ہاتھ بھی زمین سے علیحدہ ہوتے ہیں۔ یعنی صرف پاؤں اور دونوں زانو زمین پر لگے ہوتے ہیں۔ کھڑی ہُوئی حالت سے زمین پر مُنہہ کے بل لیٹنے اور مُنہہ کے بل لیٹی ہُوئی حالت سے کھڑی ہُوئی حالت میں ہونے کے درمیانی حالت دوزانو بیٹھنا ہے۔ کورنش کی یہ رسم مُغلیہ بادشاہان کے وقت دربار میں جاری تھی۔ تصاویر میں پُرانے شاہان کے دربار میں وزیر و اُمرا دوزانو بیٹھے ہُوئے دکھلائے جاتے ہیں۔ دوزانو کے بعد ایک زانو ہونے کی حالت ہے جو بعض قوموں مثلاً عیسائیوں میں خدا سے دُعا مانگتے وقت اختیار کی جاتی ہے۔ اِس کے بعد اقامت کی حالت۔ اور پھر ایک زانو کو صرف تھوڑا سا خم دیدینا بطور اختصار طریق اوّل کے دیکھا جاتا ہے۔

کورنش

میں کئی تبدیلیاں ہوکر - اوّل کمر کو نیچے کی جانب خم دیا جانا اور بعد ازاں فرشی سلام سے کم ہوکر معمولی سر کو نیچے جُھکا دینا جاری ہوتا ہے - یہ خم بھی تھوڑا ہو کر رفتہ رفتہ صرف معمولی جنبش سر کی باقی رہ جاتی ہے - جس طرح کہ انگریزوں میں "ناڈ" کا دستور ہے -

۲ - مُلاقات کی رسم شروع میں لازمی نہ تھی - صرف بیرونی علامت متابعت کی تھی جس سے دُوسرے کی خوشنودی - خاص اغراض کی وجہ سے حاصل کی جاتی تھی - بعد میں ڈالی کی طرح یہ رسم بھی پُختہ ہوکر لازمی بن گئی اور ساتھ ہی بادشاہ کی طاقت مستحکم ہونے پر بہ مصلحت مُلکی ضروری کہ ماتحت دربار میں متواتر حاضری دیکر - اظہارِ اطاعت کریں تاکہ ان کا خیال بادشاہ کی جانب معلوم ہوتا رہے - اور مخالفت یا مقابلہ کی تیاری اور آپس میں سازش کا موقعہ انکو کم ملے - مغلیہ بادشاہان کے وقت دربار خاص و دربار عام ہوا کرتے تھے اُمرا ، وزرا کی حاضری دربار میں لازمی ہوا کرتی تھی - اور خاص درجے کے آدمیوں کے لئے فرض تھا کہ دن میں دو بار صبح بوقت بادشاہ عدالت کرے اور شام کو حاضری دیا کریں - جموں و کشمیر میں اب تک یہی دستور ہے - مہاراجہ صاحب دربار کرتے ہیں - ہر ایک شخص کا جو ایک خاص درجے کا ہو - حاضر ہونا رواجی فرض ہے جس کا ادا نہ کرنا باعثِ رنجیدگی خاطر ہوتا ہے - انگلستان میں بھی سابقہ وقتوں میں اس رسم کا بڑا چرچا تھا - اور آجکل بھی شاہی دربار میں اعلیٰ عُہدہ داران اور خاص درجے یا حیثیت کے آدمیوں کا جانا ایک رسمِ تعظیمانہ ہے - غیر حاضری کو غیر مؤدبانہ کارروائی سمجھا جاتا ہے - اور بلاوجہ متواتر غیر حاضری سے وفاداری کا معدوم ہونا خیال کیا جاتا ہے -

۳ - متابعت کی تیسری بیرونی علامت غلامانہ حرکات کا دکھلانا ہوتا ہے - شروع میں ذی حج - مفتوح کے ہاتھ رسی سے جکڑ کر یا اس کے گلے میں کچھ چیز ڈالکر انکو سر برہنہ - پا برہنہ - بلکہ تن برہنہ لے آتے تھے - اس کے بعد ہاتھوں کا خود بخود باندھ دینا - یا گلے میں کپڑا ڈالنا - یا برہنہ جانا - یا سر برہنہ ہونا - ایک علامتِ اطاعت و عجز انکساری بن گئے - مثلاً : بمسجد

[illegible] اُتار کر جانا - اور اندر گلے

میں پٹہ ڈالکر ہاتھ جوڑکر اس کپڑے کو آگے سے پکڑ لینا۔ گرجوں میں اور عزت کے موقعوں پر ٹوپی کا اُتارنا وغیرہ یہ موجودہ مثالیں ہیں کہ جن میں غلامانہ طریق کی نمائش نظر آتی ہے۔ جوتی اور چھلتے کے بدلے میں بعض حکام کی سختی مذہبی مقامات میں جوتے کے لے جانے کی سخت ممانعت اور چھاتا اوپر کر کے جانے کو معیوب خیال کرنا۔ ساتھ ہی بعض رسوم مذہبی کے وقت تن برہنہ۔ سر برہنہ یا پا برہنہ ہونا یہ تمام باتیں سمجھ میں آسکتی ہیں اگر اس امر کو مدنظر رکھا جاوے۔ کہ ان افعال کا آغاز بطورِ نمائش غلامانہ طریق کے ہوا۔ بعد میں اُن کے واسطے بعض موقعوں پر مختلف وجوہ وضع کی گئیں۔ مثلاً یہ کہ جوتی اندر لے جانے سے فرش میلا ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اصل میں یہ افعال نہ کرنا۔ بے ادبی اور گستاخی میں اسی وجہ سے داخل ہوئے کہ اِن کا کرنا شروع میں ادب اور تعظیم کی نشانی تھی۔

آخری شکل سلام کی بطورِ نمائش افعال محبت کے ہے۔ چونکہ جس شخص کو انسان پسند کرتا ہے۔ اسکو دیکھ کر خوش ہوتا ہے اُچھلتا ہے کودتا ہے اور اظہار مسرت کے دیگر افعال مثلاً تالی بجانا۔ چومنا۔ نعرے مارنا وغیرہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔ اور چونکہ قدرتاً ہر ایک انسان کی طبیعت کو اس سے سرور آجاتا ہے کہ دوسرا اس کو فی الواقع پسند کرتا ہے۔ یہ کمزوری انسانی دیکھکر نمائش پسندیدگی کا اظہار ملکی حاکم کی طرف کرنا رواج ہوجاتا ہے۔ ظاہری نشانات میں خوشی سے چومنا سب سے اوّل جاری ہوتا ہے۔ لیکن ایسی شکل میں کہ کورنش کی صورت اِس میں موجود ہو یعنی اظہارِ محبت ہو لیکن اطاعت آمیز۔ اِس لئے دیکھا جاتا ہے کہ سر اور کمر کو خم دیکر بادشاہ کا ہاتھ یا کپڑے کے چومنے کا رواج اکثر ممالک میں جاری ہے۔ یہ تو اعلیٰ درجہ ہے۔ اس سے پیشتر جب طاقتِ ملکی بادشاہ کی زیادہ ہوتی تھی۔ اور اسی قدر خوشامد بھی مطلوب ہوتی تھی۔ تو دور سے اس جگہ کو چھوا جاتا تھا۔ جہاں بادشاہ کھڑے ہوں۔ اور بعد ازاں جب غلبہ حاکمِ ملکی کے کم ہوجانے کی وجہ سے اُس کے نزدیک پہنچنے کا حوصلہ لوگوں کو ہوا۔ تو اس کے پاؤں کو چومنے کی رسم جاری ہوئی۔ یہ رسم اختصار پاکر۔ رواج ہوا کہ زمین کو۔ یا پاؤں کو ہاتھ سے چھو لینا۔ اور

پھر اپنے ہاتھ کو چوم لیا۔ گویا اس ٹیڑھے طریق سے چومنا جاری ہو جاتا ہے۔ آجکل پہلوان لوگ اکھاڑے میں یہ اسی طرح کرتے ہیں۔ زمین کو ہاتھ سے چھو کر ہاتھ کو چوم لینا اور پیشانی پر رکھنا۔ یہ طریق کچھ عرصہ ہوا بادشاہ کے کورنش کا تھا۔ اس کے بعد اور اختصار ہو کر رفتہ رفتہ پاؤں کو ہاتھ لگانا۔ پھر اس کم درجہ گھٹنوں کو ہاتھ لگانا۔ پھر اس سے بھی کم ہاتھ کو نیچے کر کے دوسرے کے ہاتھوں کو ہاتھ لگانا جاری ہوتا ہے۔ جس کی تازہ مثالیں بزرگوں اور رشتہ داروں کی ملاقات کے وقت ایک چھوٹے کی طرف سے دیکھی جاتی ہیں۔ بزرگوں کے پاؤں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے۔ اس سے کم درجہ قابلِ عزت رشتہ داران کے گھٹنوں کو۔ پھر معمولی رشتہ داروں اور متعلقین کو ملتے وقت صرف ہاتھوں کو نیچے کر کے۔ ان کے ہاتھوں سے ملایا جاتا ہے۔ بعد میں صرف مصافحہ کی حالت رہ جاتی ہے۔ یہ مثالیں درجہ وار اختصار کی ہیں۔ علاوہ چومنے کے چند دیگر افعالِ محبت بھی ہیں۔ جو حاکمِ ملکی سے محبت آمیز اطاعت کا اظہار کرتے وقت کئے جاتے ہیں مثلاً تالی بجانا۔ نعرے مارنا۔ اچھلنا کودنا وغیرہ۔ یہاں سے ایک مرتبہ یہ رسم قائم ہو جاتی ہے کہ بادشاہ کو دیکھ کر اظہار خوشی و پسندیدگی کیا جاتا ہے۔ خوش آمدید و مبارکبادی کے ایڈریس دیے جاتے ہیں۔ آتشبازی چلائی جاتی ہے۔ جھنڈیاں وغیرہ ادھر ادھر گاڑ کر رونق کر دی جاتی ہے۔ گولے وغیرہ چلا کر۔ چیرز۔ دیکر ایک خوشی کا جو رعایا کے دل میں ہو۔ یا کم از کم نمائش کے طور پر ہی اظہار کیا جاتا ہے۔ مذہب میں بھی جو سلام کے اشکال ہیں۔ اگرچہ ان کے نام مختلف ہونگے۔ تاہم سب کی حقیقت وہی ہے۔ ڈالی کا ذکر کرتے وقت ہم نے کہا تھا کہ مذہبی خیالات کی تبدیلی میں اوّل مُردے کے مٹنے کو بعد ازاں دیوی دیوتا کو۔ اور آخر میں خدا کو طاقتِ اعلیٰ یا حاکمِ غائب سمجھا گیا۔ اس لئے رسم سلام جب بطور ملاقات کے جاری ہوئی۔ تو اوّلاً بزرگوں یا متوفی حاکموں کی قبر پر جانا جاری ہوا جس کو استھانوں میں زیارت کرنا کہا گیا۔ پھر جب دیوی دیوتاؤں کا خیال قائم ہو کر مندر وغیرہ قائم ہو گئے۔ تو جس طرح سے ملکی حاکم کے دربار میں حاضری دی جاتی تھی۔ اسی طرح بتکدوں۔ مندروں۔ شوالوں میں جانے کی رسم جاری ہو گئی۔ تیرتھ یاترا کی ایک یہ بھی بنیاد ہوئی۔ بعدازاں

جب ایشور کا خیال قائم ہوا۔ اور کوئی خاص مقام خدا کی رہائش کا نہ مانا گیا۔ اس وقت بھی مندر وغیرہ یعنی مسجد۔ سماج۔ گرجا کو ہی خانۂ الٰہی سمجھ کر اس جگہ جانے کا رواج ہوا۔ آجکل بھی مذہبی جلسے دھرم سالوں۔ مندروں۔ گرجوں میں جانا لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ اور جس طرح سے کہ ملاقات حاکمِ ملکی اختیاری سے لازمی ہو کر صرف بیرونی علامت متابعت کی رہ گئی تھی۔ اسی طرح سے جلسوں میں جانا لازمی ہو کر صرف بیرونی علامتِ اطاعت قرار پا گئی ہے۔ جو دھرم سال یا گرجا میں نہ جاوے۔ وہ لامذہب سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ شخص مندر یا دھرم سال میں باقاعدہ حاضر ہونے والے شخص کی نسبت اخلاقی ہدایات کا زیادہ پابند ہی کیوں نہ ہو۔ قوائے عقلیہ کی ترقی کی وجہ سے اب ظاہری معنوں میں مسجد یا مندر کو خانۂ الٰہی نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم یہ درست ہے کہ شروع میں صرف یہی خیال تھا۔ اور پرانی رسم کو جو اس خیال سے پیدا ہوئی۔ قائم رکھ کر مسجد یا مندر کا اب بھی مذہب سے خارجی طور پر خاص تعلق سمجھا جاتا ہے۔

مذہب میں کورنش کے طریق میں بھی بہت سی مختلف حالتیں دیکھی گئی ہیں۔ پہلے مردے کے مشنٹ۔ بعد ازاں دیوی۔ دیوتا۔ پھر خداتعالیٰ کی اطاعت کا اس طریق سے اظہار سوسائٹی کی مختلف مذہبی حالتوں میں دیکھا گیا ہے۔ لطف یہ کہ اسی طرح کے درجہ وار اختصار کے ساتھ جس کا ذکر اوپر ہوا۔ جوں جوں اصل اصولِ مذہب ترقی پاتے گئے۔ اخلاقی ہدایات قائم ہو کر خارجی رسومات کی ضرورت کم بھی جاتی رہی۔ اور جوں جوں خدا کو کم مطلق العنان مانا گیا۔ اور مستقل قواعد یا قانون مذہبی یعنی اخلاقی ہدایات پر عقیدہ قائم ہوا۔ طریقِ سلام بھی مختصر ہوتا گیا۔ ڈنڈوت کے بعد دوزانو ہو کر زمین پر ماتھا گرانا۔ وغیرہ وغیرہ درجے وار اختصار کی حالتیں پیدا ہوئیں۔ سلام کی تیسری و چوتھی شکلیں غلامانہ طریق کی نمائش اور افعالِ محبت مخلوط بہ افعالِ اطاعت تھیں۔ یہ بھی مذہب میں دیکھی جاتی ہیں۔ ہاتھ جوڑنا۔ پھر ہاتھوں کا قدرے کھول دینا۔ جس طرح مسلمان دعا مانگنے کے وقت کرتے ہیں۔ گلے میں کپڑے ڈالنا جس طرح دھرم سالوں میں آجکل دیکھا جاتا ہے۔ مقدس مقامات میں جوتی۔ چھاتے کا اتارنا۔ پچھلے قدموں واپس آنا جب تک کہ نظر سے غائب نہ ہو جائے

بخلافانہ طریق کی نمائش مذہب یعنی موجود ہونے کی تمثیلیں ہیں۔ مندر کے آستان کو چومنا۔ ڈیوڑھی یا دروازے کو چومنا۔ ماتھا رگڑنا۔ یا جہاں بُت پرستی جاری ہو۔ وہاں بُت کے پاؤں کو چومنا۔ یا اسکی اختصار کے ساتھ بُت کے پاؤں کو ہاتھ لگا کر ہاتھ کو چومنا یہ مختلف طریق مذہب میں نمائش افعال محبت اطاعت آمیز کے ہیں۔

چونکہ بدن یا ماتھا زمین پر رگڑنے سے خاک لگ جاتی ہے۔ اس لئے بدن یا سر یا اور پیشانی پر خود بخود خاک کا ڈالنا۔ بصورت ملنا۔ گویا اپنے آپ کو ذلیل بتلا کر ایشور کی عزت و تکریم کی ایک علامت ہو جاتی ہے۔ بعد ازاں اخیر میں آغاز رسم کی وجہ کو نظر انداز کر کے یہ رسم جاری رہتی ہے گو اس کے معنے کچھ اور بیان کئے جائیں۔

ڈالی کی طرح مذہب کے اصلی اصول قائم ہونے پر مقدم کی بجائے مذہبی رسومات مؤخر ہو گئیں اور رسوم و عقاید مذہبی جو شروع میں اس خیال سے پیدا ہوئے تھے کہ انسانی خواص والی طاقت اعلیٰ کو اس طریق سے خوش کیا جا سکتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ کمزور ہو گئے۔ لیکن اصل اصول مذہبی کے قائم ہونے کے بعد بھی گزشتہ ادنیٰ حالت کے یہ رسوم و عقائد برابر موجود رہے۔

۳ - خوشامد

شروع میں اظہار اطاعت اپنے سے کسی چیز کو علیحدہ کرنے اور دوسرے کو دینے سے ہوتا ہے۔ بعد میں حرکات بدنی سے۔ اس کے بعد صرف اسی پر اکتفا ہو سکتا ہے کہ محض زبانی اظہار ہی امر کا کیا جاوے کہ اعضا بدنی کو مناسب جنبش دینے پر تیار ہوں۔

انگریزوں میں ٹوپی کا سر سے اُتارنا رسمِ تعظیم ہے۔ لیکن جب زیادہ تعظیم مدنظر نہیں ہوتی۔ وہاں بطور اختصار یہ کافی سمجھا جاتا ہے کہ ٹوپی کے ایک کنارے کو صرف ہاتھ سے چھو دیا جاوے۔ جس کے معنے ہوتے ہیں کہ ٹوپی اُتارنے پر تیار ہوں۔ بزرگ یا بادشاہ کے سامنے کرسی سے بالکل علیحدہ ہو کر سیدھا کھڑا ہونا ہوتا ہے۔ لیکن ہوا بخود کر کے [illegible] بیٹھا ہوا کرسی [illegible]

یا اونچا کیا جاتا ہے۔ اور یہی کافی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سے دیگر طریق تعظیم میں اختصار شروع ہو جاتا ہے۔ بجائے پاؤں پر گرنے کے اور ماتھا ٹیکنے کے صرف منہ سے ہی کہا جاتا ہے۔ "پاؤں لاگیں" "پائیں پڑیں سیئے" "یا مہاراج متھا ٹیکنے ہاں" سوسائٹی میں ڈالی اور سلام کے بعد جب تیسرے درجے یعنی خوشامد زبانی کا رواج ہوتا ہے۔ تو بجائے پاؤں پر گرنے کے۔ یا غلامانہ طریق دکھلانے کے "عاجز" "خاکسار" "غلام" "آپ کے پاؤں کی خاک" وغیرہ الفاظ و فقرے۔ معمولی طریق گفتگو میں مروج ہوتے ہیں دہلی کی طرف جہاں ادب کا خیال زیادہ ہے۔ وہاں ملنے پر ہر شخص مخاطب سے کہا جاتا ہے۔ کہ آپ کا "اسم شریف" اور "کہاں سے تشریف لانا ہوا" اور جواب میں اپنا نام اس طریق پر بتایا جاتا ہے۔ کہ "اس عاجز کا نام۔ بندہ حقیر۔ پرتقصیر میاں محمد نظیر ہے" اور اگر پوچھو کہ یہ مکان کس کا ہے۔ تو کہیں گے "اس غلام کا غریب خانہ" اپنی طرف اشارہ کرکے۔ یا مخاطب کی طرف اشارہ کرکے "حضور کا" "یا آنجناب کا"۔ گویا بطریق مختصر آپ کو وہ اپنا مالک و آقا ظاہر کرکے اپنی جائیداد کو دوسرے کی مملوکہ بیان کرتا ہے۔ جہاں آزادانہ خیال ہو۔ یا جہاں غلبہ حکومت کم رہا ہو۔ وہاں اس قسم کی شائستگی یا دوسرے الفاظ میں غلامانہ طرز نظر نہیں آتی۔ انگریز سے پوچھو یہ کوٹھی کس کی ہے۔ تو کہیگا۔ "اِٹ اِز مائی ہوس"۔ یہ میرا گھر ہے یہ کبھی نہ سنوگے کہ اس غلام کا یا اس عاجز کا۔ پنجابی سے پوچھو۔ تو یہ بھی نہیں کہ "میرا" بلکہ کہیگا۔ "ساڈا گھر ہے"۔ اس فرق کی وجہ صریحاً وہ ہے جو مذکور ہوئی کہ ہندوستانیوں نے غلامی بہت دیکھی۔ اب اگرچہ غلامی جاتی رہی ہے لیکن طریق گفتگو باقی ہے۔ یہ اپنی تحقیر کے الفاظ بعد میں بیشک اس نیت سے استعمال کئے جانے شروع ہوئے۔ تاکہ شخص مخاطب کے مقابلتاً بڑائی کرکے اسکو خوش کیا جاوے۔ لیکن شروع میں یہ الفاظ صرف غلام استعمال کرتے تھے۔ پھر چونکہ غلامانہ طریق کی نمایش ایک اعلیٰ طریق حصول خوشنودی کا تھا۔ اس لئے غلامی جاتے رہنے کے بعد بھی اس قسم کے الفاظ مستعمل رہے۔ اور داخل شائستگی سمجھے گئے۔ یہاں تک کہ حاکم محکوم کو۔ اعلیٰ ادنیٰ کو بھی اسی قسم کے الفاظ سے یاد کرنے لگے۔ "غلاموں کا غلام"۔ "داسوں کا

داس"۔ اور انگریزی میں "آپ کا عاجز اور تابعدار غلام" وغیرہ فقرے مروج ہوئے جو بڑے اشخاص چھوٹے اشخاص کو خط لکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں کوئی افسر کسی غیر کو اگر کوئی تحریر بھیجے۔ تو نیچے ہوگا "آپکا عاجز و تابعدار غلام"۔ مراد یہ نہیں کہ در اصل غلام ہے۔ یہاں مراد صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ فعل محبت نہیں۔ بلکہ دوسری قسم کا فعل ہے جہاں دوستی و رشتہ داری کا اظہار مطلوب نہیں ہوتا۔ دریغ کی چھپی نہیں ہوتی بلکہ سرکاری طور۔ اس جگہ خط کے بھیجنے اور لینے والے میں خاصہ دوری مدنظر ہوتی ہے۔ نہ تعلق دوستانہ۔ یہ صرف فعل اطاعت کر دکھلایا جا سکتا ہے۔ اور چونکہ خود کو مالک لکھنا قدرتے معیوب گنا جاتا ہے۔ اس لئے یہ الٹا فقرہ استعمال ہوتا ہے جس سے گو اپنے آپ کو غلام اور دوسرے کو مالک کہا جاتا ہے۔ لیکن مراد ہوتی ہے کہ تمہارے اور ہمارے درمیان مالک اور غلام کا رشتہ ہے۔ پڑھنے والا خود سمجھ لیتا ہے کہ لکھنے والا غلام نہیں بلکہ مالک ہے۔

ان کلمات یا فقرات کے علاوہ جن سے اپنی تحقیر اور کسر نفسی پائی جاوے۔ براہ راست کلمات دوسرے کی صفت و ثنا عظمت بڑائی کی خوشامد کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ مدعا صرف حصول خوشنودی ہوتا ہے۔ اس براہ راست خوشامدی الفاظ یا کلمات میں بھی سادہ۔ پیچیدہ۔ سیدھی اور ٹیڑھی طرزیں ہوتی ہیں۔ سادہ خوشامد کی مثالیں ہیں۔ لفٹنٹ گورنر۔ وائسرائے۔ اور بادشاہ کے لئے ہز آنر۔ ہز اکسلنسی۔ ہز مجسٹی۔ راجہ مہاراجہ نواب کے لئے ہز ہائی نس وغیرہ۔ ممبران کونسل کے لئے۔ آنریبل۔ ممبران پارلیمنٹ کے لئے رائٹ آنریبل۔ پادریوں کے لئے۔ ریورنڈ اور بشپ کے لئے رائٹ ریورنڈ۔ لارڈ شپ فل لارڈ یعنی قابل پرستش مالک۔ بادشاہوں کے لئے "لفظ اعظم"۔ "ذو الجلال"۔ "سایہ ایزدی" "حافظ دین"۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی جیسا کہ حوالی اور اسلام شریعت میں غیر لازمی سے لازمی بن گئے۔ رواجی طور پر فرض ہو جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات قانونی خطاب ہو جاتے ہیں۔ اب اگر لارڈ کو "مائی لارڈ" "یور لارڈ شپ" کر کے نہ لکھو۔ ہز ان

[illegible]

میں داخل ہوجاتا ہے کہ یہ قدم ایڈرس کی ہر وقت پوری کی جاوے۔ اسکو توڑنا گناہ یا جرم نہیں۔ تو سخت نازیبا ضرور ہوجاتا ہے۔ انگریزوں میں لیڈی صاحبان سے گفتگو کرتے وقت اُن کے لباس۔ شکل۔ وغیرہ کی تعریف کرنا ایک فعل شائستہ ہوجاتا ہے۔

پیچیدہ خوشامدی کلمات کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ "اس عاجز کے غریب خانہ کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے منور کیجئے۔" اور ایسی مثالیں فیضی اور ابوالفضل وغیرہ کی تحریروں میں بیشمار ملینگی۔ چند مروجہ دیسی مثالیں اس قسم کی فقرات میں جو زمیندار حاکموں کو مخاطب ہوکر کہتے ہیں۔ "اساڈا رب تساڈے سوا کون ہے۔ اُوپر خدا ہیٹھ تسی حضور ساڈے مائی باپ ہو۔" (اوپر خدا نیچے آپ ہمارے ماں باپ ہیں) نائب تحصیلدار کو مخاطب ہوتے وقت اسکو سشن جج بلکہ ہمارا رب آپ کے سوا کون ہے) چیف کورٹ کے اختیار والا ظاہر کرینگے۔ مثلاً "خدا دے بعد تسی۔ ہر گل دا اختیار رکھدے ہو۔ چاہو مجرم پھانسی دا حکم دے دیون۔" (خدا کی جگہ آپ کو ہر بات کا اختیار ہے خواہ حضور پھانسی کا حکم دیدیں) ٹیڑھے طریقے سے خوشامد کی مثالیں ہیں۔ جب کسی نے بہت عمدہ کچھ لکھا یا کہا۔ بول اُٹھے کہ "واہ صاحب واہ" "غضب کردیا" "کمال کردیا۔ شاعری کی داد دیجئے۔" "تو کیا نازک خیال ہے" "کیا باریک بینی ہے" "کمال کردیا ہے" "یہ آپ ہی کا حصہ ہے" یا "انہیں کا کام ہے۔" شیخ سعدی صاحب بھی اسی خیال سے فرما گئے۔ کہ بادشاہ اگر دن کو رات کہے۔ تو آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہہ دینا چاہئے کہ "اینک ماہ و پروین"۔ خیالِ شاہی کی تائید ٹیڑھے طریقے سے داخلِ خوشامد ہے۔

مذہب میں بھی مذکورہ بالا ہر ایک قسم کے خوشامدانہ الفاظ جن سے خدا کی بڑائی اور انسان کی تحقیر پائی جاتی ہے استعمال کئے جاتے ہیں۔ گو شروع میں یہ الفاظ اس خیال سے کہ مردہ کے نشئے اور دیوی دیوتا کی طرح۔ خدا انسانی خواہشیں و جذبات رکھتا ہے۔ اور خوشامد سنکر راضی ہوگا۔ مستعمل ہونے شروع ہوئے۔ پرارتھنا۔ خوشامد کی ایک مذہبی صورت ہے۔ جسکی بنیاد شروع میں اس عقیدے پر ہوتی ہے کہ "خوشامد سے خدا راضی ہے"۔ اب اگرچہ سوسائٹی کی ترقی کرنے پر اور مذہب میں بھی ساتھ ساتھ ترقی ہونے پر یہ خیال بدلتا جاتا ہے تاہم کسی اور بنا پر اس رسم کو جاری رکھا جاتا ہے ✦

دیوان چند

سُورج - زمین - چاند

سُورج

یہ شعلہ رو ستارہ تمام عالم کا دل ہے اور اپنی حرکت سے ہر چیز کی زندگی قائم رکھتا ہے۔ ان تمام قندیلوں میں سے جو آسمان کے بے انتہا میدانوں میں گردش کرتی ہیں۔ آفتاب کی چکاچوند کرنے والی روشنی توجہ کو سب سے پہلے اسیر کرتی ہے۔ لیکن گو اس کی ظاہری جسامت کتنی ہی بڑی ہو اور اس کی روشنی کیسی ہی نورانی ہو۔ یہ ان لکھوکھا ستاروں میں سے صرف ایک ہے جن کو کہکشاں کی ساخت میں استعمال کرتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے یہ ایک نظام کا مرکز ہے یا کروں کے کنبے کا سردار یعنی وہ کرے جن کا یہ کسی زمانے میں گہوارہ تھا اور جو اب ہوش سنبھال کر ہمیشہ کے لئے اپنے ولی نعمت کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ آفتاب ایک شہنشاہ کی طرح اپنے چمکیلے تخت پر اپنے فدائیوں کے ہجوم میں بیٹھا ہے۔ اس کی نہ نظر آنیوالی طاقت ان کو آکاس میں قائم رکھتی ہے اور ان کو انکی مقرر شدہ راہ پر چلاتی ہے۔ اس کی برکت سے ہر جگہ زندگی و حرکت کا ظہور ہے۔ اگر اس کی روشنی بجھ جائے تو ہماری زمین پر دوامی رات چھا جائے۔ اور اس رات کے آتے ہی تمام جاندار چیزوں کی حیات منقطع ہو جائے کیونکہ صرف آفتاب کی ہی شعاعیں ہیں جو ہم کو جلّہ آور برف کی دوامی چادر سے بچاتی ہیں۔

ہماری زمین یا دیگر سیاروں کے مقابلے میں سُورج کا حجم بہت زیادہ ہے۔ زمین سے پندرہ لاکھ گنے ہے اور جتنے ستارے اس کے گرد چکر لگاتے ہیں ان سب کو اگر یکجا کیا جائے تو بھی ان سب سے سات سو گنا ہے۔

ہیئت والوں نے صرف سُورج کے حجم کو معلوم کرنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے اس کے

وزن کا بھی تخمینہ لگانے کی کوشش کی ہے اور اس میں کامیاب ہوئے ہیں۔ زمین کے وزن سے مقابلہ کر کے سورج کے عظیم الشان بوجھ کا پتہ لگایا ہے۔ اگر ہم ایک خدائی ترازو بنا سکیں۔ جس کے ایک پلڑے میں سورج ہو تو دوسرے میں اس کا پورا وزن کرنے کے لئے ساڑھے تین لاکھ زمین جیسے کُرے ڈالنے پڑینگے۔

زمین بمدار نو کروڑ [illegible] لاکھ میل سورج سے دُور ہے۔

بعض ستارے اس فاصلے سے دور اور بعض [illegible] سے کم پر چکر لگاتے ہیں۔ کسی کو آفتاب جلاتا ہے اور کسی کو دوامی جاڑے کے سپرد کرتا ہے۔ عطارد جو آفتاب کا سب سے نزدیک ہمسایہ ہے اور صرف تین کروڑ ستر لاکھ میل کے فاصلے پر ہے [illegible] شعلے کی حالت میں ہے۔ نپ ٹیون جس کی سطح بلاشبہ تمام برف [illegible] مستور ہے۔ سارے نظام شمسی کے پرلے کنارے پر چکر لگاتا ہے۔ اور آفتاب سے دو ارب چوراسی کروڑ پچاس لاکھ میل ہے۔ صرف ۱۶۴ سال میں آفتاب کے گرد ایک چکر لگاتا ہے۔ [illegible] حساب سے نپ ٹیون کا سال ہمارے ۱۶۴ سالوں کے برابر ہے۔

گو آفتاب کی چمک دمک بے مثال ہے لیکن ڈھائی سو سال ہوئے کہ دانائوں نے اس بات کو معلوم کیا کہ اس کی سطح پر بعض سیاہ دھبے بھی ہیں۔ یہ دھبے گو آفتاب کی سطح کے لحاظ سے بہت چھوٹے ہیں لیکن ہماری زمین کے مقابلے میں بے انتہا [illegible]

انسانی آنکھ عام طور پر ان دھبوں کو دیکھنے سے عاری ہے۔ لیکن [illegible] سے پچاس ہزار میل کا قطر رکھتے ہیں (زمین کا قطر آٹھ ہزار میل ہے) [illegible] کریں کہ یہ دھبے آفتاب کے جسم میں [illegible] کے ساتھ ان میں غرق ہو سکتی ہے۔

اگرچہ ان دھبوں کے وجود کا [illegible] نہایت آسان [illegible] ان کا موجود ہونا ظاہر کیا گیا تو بعض [illegible]

بات کو مغز خیال کیا۔ ان کے نزدیک آفتاب جیسا پاک اور نورانی ستارہ بے عیب ہونا چاہیے تھا۔
مگر ان دھبوں کی موجودگی میں کسی کو آجکل شک نہیں۔ لیکن ابھی تک فاضلان سائنس اس بات کو
طے نہیں کر سکے کہ ان کی ماہیت کیا ہے۔ بعض ہیئت دانوں کا خیال ہے کہ یہ دھبے آفتاب
کی سطح میں شگاف ہیں جن سے ہم کو اس کے اندرونی حالات ظاہر ہوتے ہیں۔ بعض
[illegible] کا خیال ہے کہ یہ سیاہ دھبے [illegible] کے بادل ہیں جو آفتاب کی جلتی ہوئی آگ
[illegible] ہیں لیکن جس باقاعدگی کے ساتھ یہ دھبے ظاہر ہوتے ہیں ان سے یہ
[illegible] صرف داغ [illegible] بلکہ سطح آفتاب کے جزو ہیں اور انہیں دھبوں کے باعث
[illegible] آفتاب کی محوری گردش [illegible] سال میں ایک دفعہ
[illegible]

[illegible] تیز [illegible] نہیں
[illegible] اندازہ لگانے کی کوشش کی ہے [illegible]
[illegible] فرض کرو [illegible] جیسے چودہ لاکھ گز [illegible]
[illegible] کوئلے کی تہ چڑھادی جائے [illegible] ایک دفعہ آگ لگائی جائے
گرمی [illegible] ہوگی جو آفتاب ہر سال اپنے ارد گرد دیتا ہے۔ اگرچہ یہ گرمی جو ہم کو نو کروڑ
[illegible] میل کے فاصلے پر ملتی ہے [illegible] لیکن بعض ماہرین ہیئت والوں
[illegible] کرنے کی کوشش کی ہے [illegible] اور وہ اس
[illegible]

زمین

[illegible] زمین کی طرف ذرا چپٹا واقع ہوا ہے۔ اس کی دو حرکتیں ہیں۔
[illegible] چکر سال بھر میں ختم ہوتا ہے اور دوسری اپنے محور کے گرد جو قریباً

۲۴ گھنٹے میں تمام ہوتی ہے۔ کوپرنیکس نے سب سے پہلے یہ امر سب پر ظاہر کیا اور گلیلو کی روشن ضمیری نے اس کی تائید کی۔

ہمارے کرہ کے گرد ایک موٹی تہ ہوا کی ہے جو اس کو نہایت ہی نرم گدیلے کا کام دیتی ہے۔ ہوا کی بلندی لاپلیث کے حساب کے مطابق ۴۰ میل ہے۔ اور گو یہ بظاہر چال ہلکی ہے لیکن ڈاکٹروں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم میں سے ہر ایک کے جسم پر ۴۰۰ من کے قریب دباؤ ڈالتی ہے لیکن یہ بھاری بوجھ ہم کو معلوم نہیں ہوتا ہے کیونکہ یہ جسم کے اندر اور باہر یکساں ہے۔ اور سیاروں کے مقابلے میں زمین کچھ ایسی بہت امیر نہیں کیونکہ اس کا صرف ایک چاند ہے حالانکہ بعض اَور سیاروں کے دو چار بلکہ آٹھ چاند تک بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمارا ایک ہی چاند اپنی شاندار اور محبت بھری روشنی سے دلوں کو لبھانے کے لئے کافی ہے۔

ہماری زمین ایک قطب سے دوسرے قطب تک جانداروں سے پُر ہے اور زندگی کے کرشمے اس میں نئی نئی طرح ظاہر ہوتے ہیں۔ منطقہ حارہ۔ منطقہ منجمدہ میں۔ ہوا میں۔ زمین میں۔ سمندر کی تہ میں جانور اور پودے بود و باش رکھتے ہیں۔ اور زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ جب ایک نسل منقطع ہو جاتی ہے تو کوئی اَور اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابھی زمین پر کئی پیدائشوں کا ایک سلسلہ آور آنے والا ہے اور اس وقت تک جاری رہیگا جب کہ ہر ایک چیز ایک ہی تباہی میں ٹوٹ پھوٹ کر مفقود ہو جائیگی۔ درحقیقت زمین اپنی روشنی اور زندگی کے زمانے کے بعد ٹھنڈا ہونے کی کیفیت میں ان تمام حالتوں میں سے گذریگی جو اب چاند کو درپیش ہیں۔ اور کسی دن ضرور بالضرور چاند کی طرح ہماری زمین بھی مُردہ اور ٹھنڈا ستارہ بن جائیگی۔

زمین کی ہر ایک چیز اس بات کی کامل گواہی دیتی ہے کہ اس پر بھی بعینہٖ وُہی تبدیلیاں اپنا رنگ جما رہی ہیں جو چاند پر کسی زمانے میں ہو چکی ہیں۔ حساب لگا کر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ سمندر کا (جتنا وہ ابتدا میں تھا) ۱/۵ حصہ جذب ہو چکا ہے اور جو باقی ہے وُہ بھی بلاشبہ ابھی

گم شدہ حصے کے ساتھ شامل ہو جائیگا اور پانی کے غائب ہونے کی رفتار جُوں جُوں پانی کم ہوگا اور زیادہ ہوگی۔ زمین کا اُوپر کا چھلکا (جسکو ہم زمین کہتے ہیں) دن بدن موٹا ہوتا جاتا ہے اور یہ آسانی کے ساتھ ڑدے زمین کے تمام سمندروں کے پانی سے پچاس گُنا زیادہ پانی جذب کر سکتا ہے۔

اس وقت زمین کی سطح شق ہو جائیگی جس طرح کہ آجکل چاند کی ہے۔ تمام ہوا ان غاروں میں گُھس جائیگی جو اسکی شق ہونے سے پیدا ہونگے اور زندگی تو اس سے بہت عرصہ پہلے ہی ختم ہو جائیگی۔ لیکن یہ حیرت ناک قہر جس کا نازل ہونا لابدی ہے۔ بہت عرصے کے بعد ظہور میں آئیگا۔ کیونکہ سلف کے تجربوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین کی حرارت کو صرف پندرہ درجے کم کرنے کے لئے نوّے لاکھ سال درکار ہیں۔

چاند

زمین کا یہ اکیلا اور وفادار ساتھی جو کہ ابتدا میں اسی کا ایک علیحدہ شدہ آتشی ٹکڑا تھا۔ اب زرد ہے اور سرد ہے۔ جوانی کے ایام میں نہ یہ گردش تھی نہ یہ صُورت۔ ان دنوں اس کی ساری سطح پر شعلہائے آتش کے دریا رواں تھے۔ لیکن زمین کی کشش نے آہستہ آہستہ سب کچھ محو کر دیا۔ شکل گول ہو گئی۔ رستہ مقرر ہو گیا اور ہزارہا سال کے گذر جانے سے اُس کا پیچ و تاب بھی کم ہوا اور چاند نے وُہی زرد نقرئی غمزدہ چہرہ اختیار کیا جس سے ہم واقف ہیں اور یہی وُہ شاندار آئینہ ہے جو ہر رات سُورج کی بکھری ہوئی شعاعوں کو ہم تک عکس کر کے پہنچاتا ہے۔

ستاروں کے دُور دراز فاصلے کے مقابلے میں وُہ فاصلہ جو کہ چاند کو ہم سے جُدا کرتا ہے۔ نہایت ہی خفیف ہے۔ چاند تو گویا ہمارا ہمسایہ ہے اور صرف آنکھ سے ہی اس کی ظاہری ساخت کی غیر معمولی خصوصیتیں نظر آسکتی ہیں۔ لیکن یہ خفیف فاصلہ بھی جب انسانی معیار سے دیکھا جاتا ہے تو کچھ کم نہیں کیونکہ چاند زمین سے دو لاکھ سینتیس ہزار میل دُور ہے۔ اگر ایک انجن معمولی رفتار

سے جائے تو سال بھر میں پہنچے لیکن برعکس اس کے اگر کوئی بھاری چیز چاند سے زمین کی طرف پھینکی جائے تو وُہ صرف تین دن ایک گھنٹہ ۳۵ منٹ و ۱۲ سیکنڈ میں زمین پر پہنچ جائے چاند کی سطح ہر حصے پر نہایت ناہموار واقع ہوئی ہے لیکن چاند پر ہماری زمین کی طرح پہاڑوں کے سلسلے موجود نہیں۔ اکیلی اکیلی چٹانیں تو بہت کثرت سے ہیں اور چاند کی چھٹائی کے لحاظ سے زمین کی پہاڑوں سے وُہ بلند بھی ہیں کیونکہ چاند کی سب سے بلند چوٹی اپنے ارد گرد کی وادیوں سے چوبیس ہزار سات سو فیٹ بلند ہے۔ چاند کے بہت سے پہاڑ آتش فشانی کے ذریعے سے نمودار ہوئے ہیں اور بعض جگہ تو اُس کی اندرونی آگ نے سطح کو ایسا توڑا ہے کہ کریڑ کے کریڑ ایک دُوسرے کے پاس جمع ہیں۔ غالباً بہت کم ستارے آتش فشانیوں سے اس طرح تباہ ہوتے ہونگے جس طرح کہ چاند۔ بعض کریڑوں کا قطر پانچ فرسنگ ہے لیکن ایک کا دس فرسنگ ہے۔ اور ان کا بھی جوش خروش مدت سے بند ہے اور آجکل چاند سچ مچ اور یقیناً ایک مُردہ ستارہ ہے۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ سیاہ دھبے جو چاند پر نظر آتے ہیں۔ اس کے سمندر ہیں لیکن اب یہ معلوم ہوگیا ہے وُہ صرف وسیع میدان ہیں۔

چاند کی چٹانیں اور اس کی شکستہ اور پامال شدہ زمین بالکل ویران ہے۔ اس جگہ گھاس کا ایک پتہ نہیں اُگتا اور ایک پھول بھی نہیں کھلتا جب ہوا اور پانی ہی نہ ہو تو زندگی ناممکن ہے اگر کوئی جاندار چیز اس جگہ جائے تو تین طرح کی موت کا فوراً شکار ہے۔ بھوک سے مرے پیاس سے مرے اور دم گھٹنے سے۔ چاند کے ان خوفناک اور سرد ملکوں میں ہر ایک چیز سُستی اور سردی میں مدفون ہے۔ نہ کوئی آواز ہے نہ آواز کی گونج۔ نہ آسمان نہ بادل نظر آتے ہیں۔ نہ پہاڑوں کی چوٹیوں پر برف اور نہ میدانوں میں سبزہ زار +

عبدالعزیز

دو ہفتے سیاحت میں

دو چیزوں کی دلچسپی کو تغیراتِ زمانہ کبھی کم نہیں کر سکتے۔ اوّل سوانح عمری۔ دوم حالاتِ سفر۔ جن ممالک کا سفر اب عام ہو چکا ہے۔ اُن کی سیاحت کے حالات بھی جب کوئی نیا سیاح انہیں لکھے مزا دیے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہر نظارے سے ہر طبیعت ایک جداگانہ نتیجہ نکالتی ہے اور ہر دل میں ایک نیا سلسلۂ خیال چلتا ہے۔ اور ایک دل کے جذبات اور کیفیات دوسروں کے لئے قدرتی دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ مضمون جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ دراصل ایک جج کی خط و کتابت کا حصہ ہے۔ جو ہم نے نہایت کوشش سے اپنے ایک معزز دوست سے حاصل کیا ہے جو انگلستان میں مقیم ہیں۔ اِن کے ایک مہربان حال میں براہ برلن اور وائنا قسطنطنیہ گئے اور اپنے سفر کے حالات بہ قیدِ تاریخ اپنے دوست کو لکھتے رہے۔ ہر چند کہ یہ اوراق بغرضِ اشاعت نہیں لکھے گئے۔ ہمیں یہ ایسے دلچسپ معلوم ہوئے کہ ہم نے اشاعت کے لئے مانگ لئے۔ خصوصاً یہ دکھانے کی غرض سے کہ ایک بیدار مغز ہندوستانی کو دو ہفتے میں یورپ دار الخلافہ جرمنی پر سرسری نظر ڈالنے سے کیا خیال آتے ہیں:—

۱۸۔ جنوری کو صبح کے ۵ بجے برلن پہنچا۔ خستگی بے انتہا تھی۔ اِس لئے ایک ہوٹل میں چند گھنٹے آرام کیا۔ اِس کے بعد یہ دن اور اس سے اگلا دن برلن شہر کی سیر میں صرف کیا۔ سردی نہایت سخت تھی۔ ندی اور نہر منجمد تھی۔ برلن بہ نسبت لندن اور پیرس کے نہایت صاف اور نیا شہر نظر آتا ہے۔ باقی ریلوے اور ٹرام وغیرہ اسی طرز پر ہیں جیسے لندن اور پیرس میں۔ برلن میں فوجی طمطراق اور نمائش بہت نظر آئی اور مُلک میں ایک قسم کی قومی ترقی و پیشقدمی کی رُوح محسوس ہوتی تھی۔

۲۰۔ جنوری کے ۸ بجے صبح میں برلن سے جانب وائنا روانہ ہوا اور ۱۰ بجے شب کے

وئنا پہنچا۔ ڈرسڈن تک زمین سطح تھی۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہوا اور پراگ کے قریب تک چلا گیا۔ اور اس کے بعد وئنا تک پھر سطح زمین نظر آئی۔ ڈرسڈن سے پراگ تک پہاڑ اور جنگل اور دریا آلپا کے پیچ وخم کا منظر قابل دید تھا۔

۲۱۔ جنوری وئنا کے سیر میں صرف ہوا اور اس شہر میں کیا بلحاظ شہرت وصفائی اور کیا بلحاظ وہاں کے باشندوں کی طرز معاشرت وشائستگی کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب ہم یورپ کے درجۂ اول کے ملکوں اور قوموں سے نکل کر دوم درجے کے ملک وقوم میں آ گئے ہیں۔ وئنا پرانا شہر ہے۔ اور قرون متوسطہ کے قدیم گرجے اور یادگاریں یہاں بکثرت ہیں۔ رقبہ اس سلطنت کا یورپ میں دوسرے درجے پر ہے اور ملک بلحاظ آب وہوا اور قدرتی مناظر جغرافی حالت کے روس وجرمن سے بہتر اور فرانس واطالیہ کے مدمقابل ہے۔ تاہم یہ سلطنت بمقابلہ انگلینڈ۔ روس وجرمن وفرانس کے پسماندہ ہے۔ اس کے دو سبب ہیں۔ اول تو یہ سلطنت دو مختلف گر متحد ملکوں اور قوموں کا مجموعہ ہے یعنی آسٹریا اور ہنگری۔ اول قوم کی زبان جرمن اور دوسری قوم کی اس سے مختلف ہے۔ اور ہنگری قوم زیادہ تر منگولین نمونے کی ہے۔ دوسرے اس ملک کا بادشاہ نہایت ضعیف ہے۔ اور ملک بمقابلہ مغربی یورپ کے علم میں بہت پسماندہ ہے۔ اور عوام الناس رومن کاتھلک اور جاہل ہیں۔

۲۱۔ جنوری کو شب کے ۱۰ بجے میں یہاں سے چلا اور وہ رات اور ۲۲۔ جنوری کا سارا دن ریل ہی میں گذرا۔ ملک سطح تھا۔ مگر برف سے بالکل سفید ہو رہا تھا۔ آبادی بہت کم۔ مسافر اکثر نہایت مفلس اور غلیظ نظر آئے۔ لیکن قُوا میں بہت مضبوط۔ لباس اور ٹوپی بالکل روسی کاسک لوگوں کی سی تھی۔ ۸ بجے رات کو میں بلگراد پہنچا۔ کچھ تو خستگی اور کچھ کھانے میں بے احتیاطی اور ریلوے کی سخت کثافت کے باعث طبیعت نہایت خراب رہی۔ یہاں سے میں نے استنبول تک سکینڈ کلاس کا ٹکٹ تین پونڈ آٹھ شلنگ دیکر لیا۔ آسٹریا کی ریلیں نہایت کثیف اور ریلوے سٹیشن نہایت ادنیٰ درجے کے بغیر ریلوے پلیٹ فارم کے نظر آئے۔ اس سے تو ہمارے ہندوستان کی ریلوے لائن اور سٹیشن بدرجہا بہتر وصاف ہیں۔

۲۲-جنوری کے ۱۰ بجے بلگراد سے جانب استنبول روانہ ہوا- بلگراد دریائے ساوے کے کنارے ایک اونچی پہاڑی پر آباد ہے-آب و ہوا نہایت عمدہ مگر روسی اثر و تقلید ہر بات میں نظر آتی تھی- فوج و قوم کا لباس بالکل روسی اور کتابت بھی روسی طرز کی تھی- باوجودیکہ یہ ریاست صدیوں تک ترکوں کے زیر حکومت و اثر رہی ہے تاہم یہاں کسی بات میں ترکی اثر کا نام و نشان بھی نظر نہ آیا! رات بیداری میں کٹی اس لئے کہ سیکنڈ کلاس بھرا ہوا تھا-

۲۳-جنوری کی صبح کو ہم نشِ اسٹیشن پر پہنچے- یہاں سے ایک لائن سالونیکا کو جاتی ہے جو شاید ۲۵۰ میل کے قریب ہے- ۱۰ بجے ہم بلغاریہ کی سرحد میں داخل ہوئے اور ۲۳ جنوری کے سارے دن ہماری ٹرین بلغاریہ کے ملک میں سے چلی- اس ریاست کا رقبہ مع مشرقی رومیلیا کے ۳۸ ہزار میل مربع ہے- اور ترکی علداری یورپ کا رقبہ قریب ۶۸ ہزار میل ہے- یہ ملک تمام پہاڑی ہے اور تمام سرزمین برف سے ڈھنپی اور سفید نظر آتی تھی- آبادی قریب ساڑھے تین ملین (۳۵۰۰۰۰۰) ہے- لیکن ان لوگوں میں ہر جگہ ایک قومی روح و حوصلہ مندی نظر آتی تھی- گورنمنٹ کانسٹیٹیوشنل[1] ہے اور ملک میں علم کی اشاعت روبترقی نظر آئی- حتّٰی کہ ریل کے قریب چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بھی مدرسے نظر آئے- یہاں سے بھی ترکی اثر کا نام و نشان غائب ہو چکا ہے!

۲۴-جنوری کے ۸ بجے شب کے ہم مصطفےٰ پاشا اسٹیشن پر پہنچے- یہاں سے ترکی سرحد شروع ہوتی ہے- یہاں بھی مثل اسٹریا- بلگراد- بلغاریہ کی سرحد کے اسباب کا معائنہ ہوا اور پاسپورٹ[2] دکھانا پڑا- ہندوستان اور یورپ میں ترکوں کی بابت بہت کچھ سنتا تھا اور دل میں بیقراری تھی کہ اس عجیب قوم کی صورتیں کیسے ہونگی لیکن چند نمونے جو سب سے پہلے اس مقام پہ دیکھنے میں آئے ان کو دیکھکر تو یہ شعر یاد آیا ؎

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا ‏ ‏ جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

[1] یعنی جس میں شاہی تو ہو مگر خودمختاری نہ ہو- بلکہ رعایا کی رائے کو انتظام امور میں دخل ہو- [2] پروانہ راہداری- تذکرہ-

نہ تو صورت اور ڈیل ڈول میں کوئی عجیب بات نظر آئی اور نہ اور کسی بات میں کچھ خصوصیت دیکھی کیرکٹر قریب قریب ویسا ہی ہے جیسے دنیا کے اور مسلمانوں کے۔ مگر ان کے یورپ سے قریب ہونے اور ہنوز صاحب حکومت ہونے اور گذشتہ عظیم الشان تاریخ کی وراثت کے باعث اور نیز آب و ہوا کے سبب ایک آن ان میں پائی جاتی ہے۔

۲۴۔ جنوری یوم دوشنبہ ۶ بجے صبح صادق کے ہم استنبول کی شہر پناہ کے قریب ہوکر اور بحر مارمرا کے کنارے کنارے ہماری ٹرین گذری۔ وسط استنبول میں گولڈن ہارن کے کنارے اسٹیشن پر ہم بخیریت اترے۔ اوّل تذکری کا معائنہ ہوا۔ ۱۵ منٹ صرف ہوئے۔ اس کے بعد اسباب کا معائنہ گمرگ[1] میں ہوا۔ چند سفری کتابوں کے باعث مشکل پیش آئی۔ کتابیں ضبط ہونے والی تھیں کہ ایک پاس کے آدمی نے مجھ سے کہا کہ کچھ نذر کرو۔ ۲ شلنگ نذر کئے اور پیچھا چھوڑایا اور ہوٹل سیو پول میں جو پیرا میں ہے اُترا۔ اس موسم میں یہاں برف باری اور قدرے بارش سے تنگ و کثیف سڑکیں نہایت تکلیف دہ ہیں۔ اور بلحاظ اس شہر کے لاثانی موقع اور خوبصورتی کے و قدیم عظیم الشان و خوشنما عمارات و مساجد کے اور نیز ایک عظیم الشان سلطنت اور اسلام کا دار الخلافہ ہونے کے یہاں کی سڑکیں باعثِ شرم ہیں۔ لیکن نہ صرف سڑکیں اور پبلک ورکس بلکہ تمام صیغے اور محکمے اپنی ظاہری حال سے یہ بتلاتے ہیں کہ انتظامی مشین سخت قابلِ اصلاح ہے۔ یہاں رشوت کا بازار گرم ہے اور تُرک باستثنا چند خاص خوبیوں مثل شجاعت و سخاوت و مروّت کے باقی باتوں میں دُنیا کے اور مسلمانوں سے بہتر نہیں۔ پُرانی پُشت کے تُرک نہایت شاندار وجیہہ اور خوبصورت ہیں مگر موجودہ نسل کے تُرک یہاں بھی معمولی سے نظر آتے ہیں۔

استنبول بلحاظ اپنے لاثانی موقع اور قدرتی مناظر کی خوبصورتی کے دُنیا میں ایک بے نظیر شہر ہے۔ دُنیا کا کوئی شہر یا کوئی خوبصورت مقام اس کے مقابل نہیں ہو سکتا۔ یہاں کی مساجد

[1] چُنگی خانہ ۱۲

اُن کے نرالے خوبصورت مینار۔ عالیشان محل۔ سرو صنوبر کے جنگل جو باسفورس کے کناروں کے پہاڑی ڈھالوں کو ڈھانپے ہوئے ہیں اور دریا مرمرا باسفورس اور گولڈن ہارن کا منظر ان تمام باتوں نے اس شہر کو ایسی زینت دے رکھی ہے کہ اگر ساری دُنیا کو اس پر رشک ہو تو بجا ہے۔ قلم اور کیمرا[۵۱] دونو اس کی پوری تصویر کھینچنے سے عاجز ہیں اور یہ لُطف صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مُسلمانوں کو اس ایک مقام پر جتنا فخر ہو بجا ہے اور یورپ کو اس پر جتنا رشک ہو زیبا ہے۔

یہ شہر تین حصّوں پر منقسم ہے۔ دو حصّے یُورپی کنارے پہ ہیں اور تیسرا ایشیا کی طرف استنبول ایک طرف و غلطہ و پیرا گولڈن ہارن کی دُوسری طرف۔ ایشیائی حصّے کو سکوتری کہتے ہیں۔ غلطہ و پیرا میں یونانی اور یورپین آبادی ہر اور تمام سفارت خانے یہاں ہیں۔ گولڈن ہارن پہ دو پُل پُرانی وضع کے ہیں جن پر ہر شخص سے آدھی پینی (ہندوستانی سکّے کا آدھ آنہ) محصُول لیا جاتا ہے۔

استنبول مشرقی یورپ اور ایشیا کا ایک بڑا مرکز ہے۔ ایک عجیب مجمُوعہ ساری دُنیا کی قوموں مذہبوں اور زبان کا یہاں نظر آتا ہے۔ ہمارے کُرہ مشرقی کے شمالی حصّہ کی قومیں اور جنوبی یورپ کی قومیں اور برّاعظم ایشیا اور افریقہ کی مختلف اقوام یہاں سب ملی جُلی پھرتی ہیں۔ ایک طرف دلیر تنومند حبشی۔ دُوسری طرف نازک جاپانی اور چینی لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک قابلِ دید منظر ہے۔ اور اس اعتبار سے دُنیا میں سب سے نرالی جگہ یہ معلوم ہوتی ہے۔

اِس اسلامی سلطنت کے بقا کا راز عساکرِ عثمانیہ ہیں۔ یہ بہادرانِ اسلام بھاری ڈیل ڈول یا ظاہری وردیوں کے طمطراق یا دکھاوے کے سپاہی نہیں۔ لیکن ان کی سیدھی سادی صورتیں غریبانہ وردی سادہ چلنا پھرنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ سپہگری کے اصلی جوہر ان میں ہیں جو

[۵۱] عکسی تصویر کا سامان ۱۲

نہیں دنیا میں لاثانی سپاہی بناتے ہیں اور جب تک کہ ایک ایک اُن میں سے صفحۂ دُنیا سے نیست نہ ہو جائے پیچھے نہ ہٹیں گے۔ کاش اِن کے افسر بھی ان کے لائق کے ہوتے! اصلی فوج یہ ہے باقی سب تماشا ہے!

یہ بات مجھے یہاں آکر معلوم ہُوئی کہ تُرک محض سپاہی قوم ہے اور انتظام میں یا تو اُنکی طبیعت ہی نہیں لڑتی یا اب مادہ نہیں رہا۔ اِس کی کمی ہر طرف محسُوس ہو رہی ہے۔ انگریز انتظام کے سلیقے میں یورپ کی تمام اقوام سے بہتر ہیں مگر وہ جنگی قوم نہیں۔

تُرکوں پر تعصب کا الزام بالکل کذب ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ تُرک عیسائی اقوام یعنے اپنی رعیت یُونانی وارمنی وغیرہ اقوام سے اس قدر مِل جُل گئے ہیں اور اُنہوں نے اُن کو اتنی آزادی دے رکھی ہے کہ عجب نہیں کہ چند دن میں مُلک کی ساری دولت اور زمین اور پیشوں پر عیسائی حصہ رعایا کا قبضہ ہو جائے۔ استنبول میں جدھر جائیے ہر قسم کی دوکانیں۔ ریسٹوران[1]۔ حجامی خیاطی۔ بزازی۔ نجاری۔ صرافی۔ بنک۔ غرض آمدنی کے سب پیشے دمیغنے یُونانیوں یہُودیوں اور ارمنیوں کے قبضے میں ہیں۔ مُسلمان یا تو فوج میں ملازم ہیں یا سول میں۔ اُمرا کے نوکر چاکر یا حمال! خوفناک حالت ہے اور تُرک اس سے بالکل غافل ہیں۔ انہیں ہنُوز اِس عظیم الشان مسئلے کا احساس نہیں ہُوا۔ کہ زمانہ اسی کو باقی رکھتا ہے جو مقابلے میں اپنے آپ کو بہترین ثابت کرے۔ اور دُوسروں کو کاٹ چھانٹ کے پھینکتا جاتا ہے۔ تعلیم بہت کم اور ابتدائی ہے اور تُرکوں میں علم کا شوق بھی نظر نہیں آتا۔ دن رات قہوہ خانوں میں کافی چاء پیتے اور تاش وغیرہ کھیلتے ہیں۔ مَیں نے اب تک ایک مُسلمان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی!!! انہیں کے قریب بلغاریہ وسرویا کی چھوٹی سی ریاستیں ہیں جہاں انگلینڈ۔ جرمنی اور مغربی یورپ کے طرز خیال کا پرتو پڑ رہا ہے۔ وہاں کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ ہے اور پریس کو نسبتاً آزادی ہے۔ مگر یہاں یہ سب باتیں مفقود ہیں۔

---

[1] دار التفریح ۱۲

جن چند باتوں نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا اور جس طرزِ معاشرت نے مسلمانوں میں مخربِ اخلاق اثرات پیدا کیے وہ ہنوز یہاں پائے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترک سخت بے چینی میں ہیں اور یورپ ان کے سینے پر بیٹھ کر ڈرانے دلتا ہے۔ لیکن پھر بھی تو ان میں اپنی اصلاح کی کوشش نہیں اس روسی شکست سے ترکوں پر خدا نے اپنا پورا فضل کیا ہے۔ کاش کہ یہ اس سے اور بے فکر نہ ہو جاویں۔ بلکہ آیندہ ترقی کی فکر کریں۔ ترکوں کو صرف شمال کی طرف سے خطرہ ہے باقی استنبول کا فتح ہونا کسی اور طرف سے ناممکنات سے ہے۔ قدرتی بالفاظ ایسے ہیں کہ استنبول تک کسی بحری قوت کا پہنچنا اس زمانے میں ناممکن ہے۔ البتہ اگر آیندہ جنگ کی کوئی صورت زمین سے اوپر معلق ہوا میں غباروں کے ذریعے سے ہو تو شاید ممکن ہو۔ سلطان نے چند کام اچھے کیے ہیں۔ ایک تو استنبول کے گریک ارمنی و یورپین اثراتِ بد سے اپنی مسلمان عورتوں کی خوب حفاظت کی ہے کہ اس وقت ایک مسلمان عورت فاحشہ کا وجود بالاعلان یہاں نہیں باقی عیسائی و یورپین قوموں کو پوری آزادی ہے۔ مسلمان عورتیں برقعے کے ساتھ باہر جاتی ہیں اور ٹرام وے۔ اسٹیشن ریلوے وغیرہ پر ان کے لیے علیحدہ کمرے نشست خلوت کے مقامات ہیں۔ لباس اندر یورپین مگر اوپر ایک سیاہ چادر سے بالکل ڈھنپا ہوا رہتا ہے۔ انکو ہر طرح پر خاصی آزادی حاصل ہے اور یہ اپنے مردوں کی سچی رفیق ہیں۔

استنبول - ۲۷ - جنوری شام

آج میں یلدز کوشک کی طرف رسمِ سلاملق دیکھنے گیا۔ یہ نظارہ قابلِ دید ہے۔ اس محل کا موقع اور صورت حیدرآباد دکن کے فلک نما سے مشابہ ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس کے سامنے اور اطراف کا منظر لاثانی ہے۔ ۱۱ بجے ہر چہار طرف سے پلٹنیں رسالے حمیدیہ مارچ کے بینڈ کے ساتھ جمع ہونا شروع ہوئے۔ یہ حمیدیہ مارچ وجد کی حالت طاری کرتا ہے۔ پلٹنوں کے سبز علم و ہلال کی جھنڈیاں۔ اور بہادر سپاہیوں کے چہرے ایک عجیب حالت ہر شخص پر پیدا کرتے تھے۔ دور دور تک سیاہ نظر آتی تھی اور غریب غربا تماشائی اس فوج کے پیچھے بہت دور کھڑے

ہُوئے تھے۔ پاشاؤں جنرلوں کی سُنہری وردیاں عجب بہار دیتی تھیں۔ سُلطان کی سواری نمودار ہُوئی۔ سپاہیوں نے "پادشاہم چوق یشا" کے نعرے مارے۔ حمیدیہ قومی راگ بجا۔ مینارے پر ایک خوش الحان موذن نغمے کے ساتھ اذان دے رہا ہے اور جس وقت سُلطان کی سواری آئی۔ اکثر پرانے طرز کے مسلمان درود پڑھنے لگے۔ یہ نظارہ کبھی فراموش نہ ہوگا۔ اِسی نظارے سے یورپ کا دل لرزتا تھا۔ مَیں نے دُور سے سُلطان کو دیکھا۔ ناک نہایت خمدار ہے۔ میانہ قد۔ داڑھی بھری ہُوئی اور کھچڑی نما اور رنگ بہت گورا نہیں ہے۔

یہاں مساجد میں جُوتے سے نماز پڑھتے ہیں۔ صرف اُوپر کا حصہ جو سیاہ ربڑ کا جوتا ہوتا ہے اُتار لیتے ہیں۔ باقی اندر کے لمبے بُوٹ نہیں اُتارتے۔ مذہب برائے نام ہے۔ استنبول میں عیسائی تُرک وارمنی کی شناخت بہت مشکل ہے۔ لباس ایک۔ غذا ایک اور سب ملے جُلے ہیں۔ عیسائی دُوراندیش ہیں۔ مگر تُرکوں میں دُوراندیشی کم ہے اور علم کے شوق کی یہ حالت ہے کہ کسی کے ہاتھ میں اگر کتاب ہو تو سب تعجّب سے اس کو دیکھتے ہیں! سُلطان اور اِن کی پارٹی اندر سے پُرانے وضع کے لوگ ہیں۔ مگر باہر سے لباس و معاشرت یورپین ہے۔ نئی پود میں صفات کی وُہ پختگی کہاں۔ تُرکوں سے مَیں ایرانیوں کو دماغی حیثیت سے بہتر خیال کرتا ہُوں۔ اور ایرانی بہت زیادہ اصلاح پذیر ہیں۔ یہ خیال کرنا کہ ترک بلحاظ اپنی موجُودہ علمی افلاس و بدنظمی کے کوئی دُوسرا مُلک فتح کرلینگے ناممکن ہے۔ ہاں اگر اپنی رہی سہی میراث کو بچالیں تو گویا بہت کچھ ہے۔ اِن کی حالت ایک بوسیدہ اور انحطاط پذیر شخص سے مشابہ ہے۔ جس کے حوصلے اور اُمنگیں سب سرد ہیں۔ ان میں اس ملک گیری کی رُوح کا شائبہ بھی نہیں ہے جو انگلینڈ فرانس۔ جرمنی اور رُوس میں ہے۔ وُہ قومی تخیل ڈیڑھ سو برس سے ان میں مفقود ہو چکا ہے۔ اس قوم کی حالت اس شخص سے مشابہ ہے جو جوانی میں نہایت مضبوط اور عُمدہ کاٹھی کا ہو لیکن اب عُمر کا ڈھلاؤ اس پر آچلا ہو۔ مگر جوانی کے بدن کی کساوٹ کے نشان اب تک اِس میں پائے جاتے ہوں +

پردیسی سیلانی

قومی زندگی

(سلسلے کے لئے اکتوبر ۱۹۰۴ء کا نمبر ملاحظہ ہو)

حال کی قوموں میں اہل اطالیہ تو خیر فرنگستانی ہیں۔ جاپانیوں کو دیکھو کس حیرت انگیز سرعت سے ترقی کر رہے ہیں۔ ابھی تیس چالیس سال کی بات ہے کہ یہ قوم قریباً مُردہ تھی ۱۸۶۹ء میں جاپان کی پہلی تعلیمی مجلس قائم ہوئی۔ اس سے چار سال بعد یعنی ۱۸۷۲ء میں جاپان کا پہلا تعلیمی قانون شائع کیا گیا اور شہنشاہ جاپان نے اس کی اشاعت کے موقع پر مندرجہ ذیل الفاظ کہے۔ "ہمارا مدعا یہ ہے کہ اب سے ملک جاپان میں تعلیم اس قدر عام ہو کہ ہمارے جزیرے کے کسی گاؤں میں کوئی خاندان جاہل نہ رہے"۔ غرضکہ ۳۶ سال کے قلیل عرصے میں مشرق اقصیٰ کی اس مستعد قوم نے جو مذہبی لحاظ سے ہندوستان کی شاگرد تھی۔ دنیوی اعتبار سے ممالک مغرب کی تقلید کر کے ترقی کے وہ جوہر دکھائے کہ آج دُنیا کی سب سے زیادہ مہذب اقوام میں شمار ہوتی ہے اور محققین مغرب اس کی رفتار ترقی کو دیکھ کر حیران ہو رہے ہیں۔ جاپانیوں کی باریک بین نظر نے اس عظیم الشان انقلاب کی حقیقت کو دیکھ لیا اور وہ راہ اختیار کی جو ان کے قومی بقا کے لئے ضروری تھی۔ افراد کے دل و دماغ دفعتہً بدل گئے اور تعلیم و اصلاح تمدن نے قوم کی قوم کو اور سے کچھ اور بنا دیا۔ چونکہ ایشیا کی قوموں میں سے جاپان نے رموز حیات کو سب سے زیادہ سمجھا ہے۔ اس واسطے یہ ملک دنیوی اعتبارات ہمارے لئے سب سے اچھا نمونہ ہے۔ ہمیں لازم ہے کہ اس قوم کے فوری تغیر کے اسباب پر غور کریں اور جہاں تک ہمارے ملکی حالات کے رُو سے ممکن و مناسب ہو اس جزیرے کے تقلید سے فائدہ اُٹھائیں۔

ان واقعات کی روشنی میں اگر ہندوستان کی حالت کو دیکھا جائے تو ایک مایوس کر دینے والا نظارہ سامنے آتا ہے۔ کیا ہمارا ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہے؟ اپنے مکان کے اسباب آرائش کو

ہی دیکھو تو معلوم ہو جائیگا کہ ذرا ذرا سی بات کے لئے ہم اقوام غیر کے محتاج ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں - آپ کا لمپ جرمن میں بنا ہے اُس کی چمنی آسٹریلیا میں تیار ہوئی ہے اس کا تیل روس سے آیا ہے اور گندھک کی سلائی جس سے یہ لمپ روشن کیا جاتا ہے سویڈن یا جاپان سے پہنچی ہے کلاک جو آپ کی نشستگاہ کی دیوار پر آویزاں ہے امریکہ کے کارخانوں میں تیار ہوا تھا اور وہ چھوٹی سی گھڑی جو آپ کی جیب میں ٹک ٹک کر رہی ہے جنیوا کے کاریگروں کی صنعت کا نمونہ ہے - علیٰ ہذا القیاس پہننے کا کپڑا ہاتھ کی چھڑی چاقو قینچی دروازوں کی چلمنیں اور روزمرہ کے استعمال کی صدہا چیزیں غیر ملکوں کے کارخانوں میں تیار ہو کر آپ کے پاس پہنچی ہیں ایسے حالات میں جب مصنوعات و تجارت کی طرف سے ہمارا ملک بالکل غافل ہو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم اس تمدن میں جس کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے کامیاب ہونگے -

اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے ملک سے کپاس چاول کوئلہ اور مصالح خام کی اور صورتیں ممالک غیر کو جاتی ہیں مگر غور کرنے پر معلوم ہوگا کہ تمدن سے بعید وہ ملک ہے جو ممالک غیر کے لئے مصالح خام کا ایک ذخیرہ ہو اور مصنوعات کے لئے اوروں کا محتاج ہو - وہ ملک جس کا دارومدار صرف زراعت پر ہو جیسا کہ ہندوستان کا ہے نہ ترقی کی دوڑ میں کامیاب ہو سکتا ہے نہ قحطوں اور وباؤں سے نجات پا سکتا ہے جب تک کہ وہ اپنی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کی کوئی اور راہ نہ اختیار کرے - جب تک ہندوستان صنعتی ملک نہ ہوگا اور ہم جاپانیوں کی طرح اپنے پاؤں پر کھڑے نہ ہونگے اس وقت تک قدرت ہمیں قحط کے تازیانے لگاتی رہیگی طرح طرح کی وبائیں ہمیں ستاتی رہینگی - جس سے ہم جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے ضعیف و ناتوان ہوتے جائینگے - اقوام ہند میں سے ہمارے ہندو بھائیوں نے اس راز کو کسی قدر سمجھا ہے اور چونکہ یہ لوگ بالطبع اس کام کے لئے موزوں بھی ہیں اس واسطے یقیناً ان کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے - لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اگر اس اعتبار سے مسلمانوں کو دیکھا جائے تو ان کی حالت نہایت مخدوش نظر آتی ہے - یہ بدقسمت قوم حکومت کھو بیٹھی صنعت کھو بیٹھی تجارت کھو بیٹھی اب وقت کے تقاضوں سے غافل ہے - افلاس کی تیز تلوا

سے مجروح ہوکر ایک بے معنی توکّل کا عصا ٹیکے کھڑی ہے ۔ اور باتیں تو خیر ابھی تک اُنکی مذہبی نزاعوں کا ہی فیصلہ نہیں ہوا ۔ آئے دن ایک نیا فرقہ پیدا ہوتا ہے جو اپنے آپ کو جنّت کا وارث سمجھکر باقی تمام نوعِ انسان کو جہنم کا ایندھن قرار دیتا ہے ۔ غرضکہ ان فرقہ آرائیوں نے خیرالامم کی جمیعت کو کچھ ایسی بُری طرح منتشر کر دیا ہے کہ اتّحاد و یگانگت کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی ۔

مولوی صاحبان کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی شہر میں اتفاق سے دو جمع ہو جائیں تو حیاتِ مسیح یا آیاتِ ناسخ و منسوخ پر بحث کرنے کے لئے باہمی نامہ و پیام ہونے ہیں اور اگر بحث چھڑ جائے اور بالعموم چھڑ جاتی ہے تو ایسی جوتیوں میں دال بٹتی ہے کہ خدا کی پناہ ۔ پُرانا علم و فضل جو علمائے اسلام کا خاصہ تھا نام کو بھی نہیں ۔ ہاں مسلمان کافروں کی ایک فہرست ہے کہ اپنے دستِ خاص سے اس میں روز بروز اضافہ کرتے رہتے ہیں ۔ امرا کی عشرت پسندی کی داستان سب سے نرالی ہے ۔ خیر سے چار لڑکیاں ، اور دو لڑکے تو پہلے ہیں ابھی میاں تیسری بیوی کی تلاش میں ہیں اور پہلی دو بیویوں سے پوشیدہ کہیں کہیں پیغام بھیجتے رہتے ہیں ۔ کبھی گھر کی جوتی بیزار سے فرصت ہوئی تو بازار کی کسی حُسن فروش نازنین سے بھی گھڑی بھر کے لئے آنکھیں لڑا آئے ۔ اوّل تو کسی کو جرأت نہیں کہ حضرت کو نصیحت کرے اور اگر کسی کو لب کشائی کا حوصلہ ہوا بھی تو چین بجبیں ہو کر ارشاد فرماتے ہیں " مجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو " عوام کی تو کچھ نہ پوچھئے کوئی اپنی عمر کا اندوختہ بیچے کے ختنے پر اُڑا رہا ہے ۔ کوئی سیلے اُستاد کے خوف سے اپنے نازپروردہ لڑکے کا پڑھنا لکھنا چھڑوا رہا ہے کوئی دن بھر کی کمائی شام کو اُڑاتا ہے اور کل کا اللہ مالک ہے کہکر اپنے دل کو تسکین دیتا ہے ۔ کہیں ایک معمولی بات پر مقدمہ بازیاں ہو رہی ہیں کہیں جائداد کے جھگڑوں سے جائداد ہی فنا ہو رہی ہے ۔ غرض کس کس کی شکایت کریں لنکا میں جو بسا ہے باون ہی گز کا ہے ۔ تمدّن کی یہ صُورت کہ لڑکیاں ناتعلیم یافتہ نوجوان جاہل روزگار ان کو نہیں ملتا ۔ صنعت سے یہ گھبراتے ہیں ۔ حرفت کو یہ عار سمجھتے ہیں ۔ مقدماتِ نکاح کی تعداد ان میں روز بروز بڑھ رہی ہے ۔ جُرم کی مقدار ان میں روز افزوں ہے ۔ دماغ شاہجہانی

آمدنیاں قلیل اور افلاس کا یہ عالم کہ "رمضان خوب مہینا ہے مسلمانوں کا"۔ یہ وقت بڑا نازک وقت ہے اور سوائے اس کے کہ تمام قوم متفقہ طور پر اپنے دل و دماغ کو اصلاح کی طرف متوجہ نہ کرے کوئی صورت نظر نہیں آتی - دُنیا میں کوئی بڑا کام سعی بلیغ کے بغیر نہیں ہوا - یہاں تک کہ خدا تعالیٰ بھی کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک کہ وُہ قوم اپنی حالت خود نہ بدلے - ایک فرنگستانی مصنف لکھتا ہے کہ دیانتداری سے محنت کرنا سب سے بڑی عبادت ہے خواہ اس محنت کا اثر کسی فردِ خاص کی ذات تک محدُود ہو خواہ تمام قوم پر اسکا اثر پڑتا ہو - لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو فرد کا وجود قوم کے وجُود کے بغیر تصوّر میں بھی نہیں آسکتا اور فرد کی کوئی ایسی حرکت نہیں جسکا اثر تمام قوم پر نہ پڑتا ہو - ایسی صورت میں آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہر فرد کی محنت حقیقت میں ایک قومی کام ہے - اگر اس محنت کا مُدعا مذموم ہوگا تو قوم پر بُرا اثر پڑیگا - اور اگر نیک ہوگا تو قوم پر اچھا اثر پڑیگا - پس فرد قوم کا پہلا فرض یہ ہے کہ وُہ دیانتداری کے ساتھ اس تمدنی مقصد کو پُورا کرے جو قوم نے اس کے ذمّے دے رکھا ہے اور اس بات کو سمجھ جائے کہ اس کا عروج و زوال حقیقت میں قوم کا عروج و زوال ہے - یہی ہے وُہ محنت جس کا نام عبادت رکھا گیا ہے اور جسکی نسبت ایک فارسی شاعر کہتا ہے :- ؎

اشکِ من خونِ جگر خوردو دویدن آموخت
جز بہ محنت نشود پا بہ رہِ عشق رواں

دُنیا میں کسی قوم کی اصلاح نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس قوم کے افراد اپنی ذاتی اصلاح کی طرف توجہ نہ کریں کیونکہ جیسا مَیں نے ابھی کہا ہے فرد کے تمام افعال و حرکات حقیقت میں قومی افعال و حرکات ہیں - یہاں تک کہ اُس کی زندگی بھی اس کی اپنی نہیں ہے بلکہ قوم کی ملکیت ہے - خودکشی کیوں جرم قرار دی گئی ہے ؟ بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خودکشی کا اقدام کرنے والے کو سزا دینا ظلم ہے مگر یہ ایک سطحی خیال ہے - قانون نے اس بات کو اصولاً تسلیم کر لیا ہے کہ فرد کی زندگی حقیقت میں قوم کی زندگی ہے اور خودکشی کرنے والا اپنی جان پر ظلم نہیں کرتا بلکہ حقیقت میں اس تمدنی قوت کو معدوم کرنا چاہتا ہے جس کا وُہ بحیثیت فردِ قوم ہونے کے ایک مظہر ہے -

اگر ہم جاپان کی تاریخ سے فائدہ اٹھانا چاہیں اور موجودہ وقت میں بھی ملک ہمارے واسطے بہترین نمونہ ہے تو اس وقت ہمیں دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے - یعنی اصلاح تمدن اور تعلیم عام مسلمانوں میں اصلاح تمدن کا سوال درحقیقت ایک مذہبی سوال ہے کیونکہ اسلامی تمدن اصل میں مذہب اسلام کی عملی صورت کا نام ہے اور ہماری تمدنی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جو اصول مذہب سے جدا ہو سکتا ہو - میرا یہ منصب نہیں کہ میں اس اہم مسئلے پر مذہبی اعتبار سے گفتگو کروں تاہم میں اس قدر کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ حالات زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب آجانے کی وجہ سے بعض ایسی تمدنی ضروریات پیدا ہوگئی ہیں کہ فقہا کے استدلالات جن کے مجموعے کو عام طور پر شریعت اسلامی کہا جاتا ہے ایک نظر ثانی کے محتاج ہیں - میرا یہ عقیدہ نہیں کہ مسلمات مذہب میں کوئی اندرونی نقص ہے - جس کے سبب سے وہ ہماری موجودہ تمدنی ضروریات پر حاوی نہیں ہیں - بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ قرآن شریف اور احادیث کے وسیع اصول کی بنا پر جو جو استدلال فقہا نے وقتاً فوقتاً کئے ہیں - ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو خاص خاص زمانوں کے لئے واقعی مناسب اور قابل عمل تھے مگر حال کی ضروریات پر کافی طور پر حاوی نہیں ہیں - اگرچہ شیعہ مفسروں نے بعض بعض اصول کی تشریح میں ایک حیرت ناک وسعت نظر سے کام لیا ہے تاہم جہاں تک میرا علم ہے شریعت اسلامی کی جو توضیح جناب ابوحنیفہ نے کی ہے ویسی کسی اسلامی مفسر نے آج تک نہیں کی - اگر مذہب اسلام کے رو سے مجسموں کے ذریعے بڑے بڑے علما اور حکما کی یادگاریں قائم رکھنے کا دستور جائز ہوتا تو یہ عظیم الشان فقیہ اس عزت کا سب سے پہلا حق دار تھا - دینی خدمت کے اس حصے یعنے فلسفہ شریعت کی تفسیر و توضیح میں امیر المومنین جناب علی کے بعد جو کچھ اس فلسفی امام نے سکھایا ہے قوم اسے کبھی فراموش نہیں کرے گی - لیکن اگر موجودہ حالات زندگی پر غور و فکر کیا جائے تو جس طرح اس وقت ہمیں تائید اصول مذہب کے لئے ایک جدید علم کلام کی ضرورت ہے اسی طرح قانون اسلامی کی جدید تفسیر کے لئے ایک بہت بڑے فقیہہ کی ضرورت ہے - جس کے قوائے عقلیہ و متخیلہ کا پیمانہ اس قدر وسیع ہو کہ وہ مسلمات کی بنا پر قانون اسلامی کو نہ صرف ایک جدید پیرائے میں مرتب و منظم

کر سکے بلکہ تخیل کے زور سے اصول کو ایسی وسعت دے سکے جو حال کے تمدنی تقاضوں کی تمام ممکن صورتوں پر حاوی ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے اسلامی دنیا میں اب تک کوئی ایسا عالی دماغ مقنن پیدا نہیں ہوا اور اگر اس کام کی اہمیت کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام شاید ایک سے زیادہ دماغوں کا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے کم از کم ایک صدی کی ضرورت ہو۔ یہ بحث بڑی دلچسپ ہو مگر چونکہ قوم ابھی ٹھنڈے دل سے اس قسم کی باتیں سننے کے عادی نہیں ہے اسواسطے میں اسے مجبوراً نظر انداز کرتا ہوں۔ ؎

نیست جرأت بعرضِ حال مرا
گلہ مندم زبے زبانیہا۔ (انت رامم مقلص سودہرہ ی)

باوجود اس بات کے میں چند خاص تمدنی ضروریات کی طرف ناظرین کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ ان پر غور کرکے ان سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائیگی۔ اصلاح تمدن کے ضمن میں سب سے زیادہ نازک مسئلہ حقوقِ نسوان کا ہے جس کے ساتھ چند اور ضروری مسائل مثلاً تعدد ازدواج پردہ تعلیم وغیرہ وابستہ ہیں۔ مغربی علما نے حقوق نسوان کے متعلق مذہب اسلام پر بعض بعض بڑے بیجا اعتراض کئے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض حقیقت میں مذہبِ اسلام پر نہیں ہیں جیساکہ ان علما نے خیال کیا ہے۔ بلکہ ان کی آماجگاہ وہ استدلالات ہیں جو فقہائے اسلام نے کلام الٰہی کے وسیع اصولوں سے کئے ہیں اور جن کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہو کہ فردی اجتہادات مذہب کے کوئی ضروری اجزا نہیں ہیں۔ ان تمام اعتراضات کا مقصد و مُدعا یہی ہو کہ اصول مذہب اسلام کے رُو سے عورتوں کی حیثیت محض غلامانہ ہے لیکن ذرا سوچنے کا مقام ہو کہ جس نبی نے نوع انسانی کے ایک بہت بڑے گروہ یعنے غلاموں کو حقوق کے رُو سے آقاؤں کے مساوی کردیا۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہی نبی نوع انسانی کے ایک نہایت ضروری حصے کو جسکو اُس نے اپنی تین محبوب ترین اشیا میں شامل کیا ہے۔ غلاموں کی صورت میں منتقل کردیتا۔ مسلمانوں کا موجودہ طریق عمل زیادہ تر فقہائے قدیم کے ذاتی استدلالات پر مبنی ہے اور اس میں

کچھ شک نہیں کہ استدلالات ترمیم طلب ہیں اور کون کہ سکتا ہے کہ ان استدلالات میں موجودہ حالات کے رُو سے ترمیم کرنا گناہ ہے بشرطیکہ یہ ترمیم اصُولِ مذہب کے مخالف نہو۔ عمومیات کو چھوڑکر اگر خصوصیات پر نظر کی جائے تو عورتوں کی تعلیم سب سے زیادہ توجّہ کی محتاج ہے۔ عورت حقیقت میں تمام تمدّن کی جڑ ہے۔ "ماں" اور "بیوی" دو ایسے پیارے لفظ ہیں کہ تمام مذہبی اور تمدنی نیکیاں ان میں مستتر ہیں۔ اگر ماں کی محبت میں حُبِّ وطن اور حُبِّ قوم پوشیدہ ہے۔ جس میں سے تمام تمدنی نیکیاں بطور نتیجے کے پیدا ہوتی ہیں تو بیوی کی محبت اس سوز کا آغاز ہے جس کو عشقِ الٰہی کہتے ہیں۔ پس ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ تمدن کی جڑ کی طرف اپنی توجہ مبذول کریں اور اپنی قوم کی عورتوں کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ مرد کی تعلیم صرف ایک فردِ واحد کی تعلیم ہے مگر عورت کو تعلیم دینا حقیقت میں تمام خاندان کو تعلیم دینا ہے۔ دُنیا میں کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اگر اس قوم کا آدھا حصہ جاہل مطلق رہ جائے۔ لیکن اس ضمن میں ایک غورطلب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مشرقی عورتوں کو مغربی طریق کے مطابق تعلیم دی جائے یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کی جائے جس سے ان کے وُہ شریفانہ اطوار جو مشرقی دل و دماغ کے ساتھ خاص ہیں قائم رہیں۔ میں نے اس سوال پر غور و فکر کیا ہے مگر چونکہ اب تک کسی قابلِ عمل نتیجے پر نہیں پہنچا اسواسطے فی الحال مَیں اس بارے مَیں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

تعدّدِ ازدواج کا دستور بھی اصلاح طلب ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس کا جائز قرار دیا جانا ایک دقیق رُوحانی وجہ پر مبنی تھا اور علاوہ اس کے ابتدائی اسلام میں اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے اس کی ضرورت بھی تھی۔ مگر جہاں تک مَیں سمجھتا ہُوں موجُودہ مسلمانوں کو فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ موجُودہ حالت میں اس پر زور دینا قوم کے اقتصادی حالات سے غافل رہنا ہے۔ اور اُمرائے قوم کے ہاتھ میں زنا کا ایک شرعی بہانہ دینا ہے۔

عورتوں کے حقوق کے ضمن میں پردے کا سوال بھی غورطلب ہے کیونکہ کچھ عرصے سے اس پر بڑی بحث ہورہی ہے۔ بعض مسلمان جو مغربی تہذیب سے بہت متاثر ہوگئے ہیں اس

دستور کے سخت مخالف ہیں - اور اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں اور نیز حال کے دیگر اسلامی ممالک میں پردے کی یہ صورت نہیں ہے جو آج کل ہندوستان میں ہے - لیکن اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں پردے پر سخت زور دیا جانا اخلاقی وجوہ پر مبنی تھا - چونکہ اقوام ہندوستان نے اخلاقی لحاظ سے کچھ بہت ترقی نہیں کی - اس واسطے اس دستور کو یک قلم موقوف کر دینا میری رائے میں قوم کے لئے نہایت مضر ہوگا - ہاں اگر قوم کی اخلاقی حالت پھر ایسی ہو جائے جیسی کہ ابتدائے زمانہ اسلام میں تھی - تو اس کے زور کو بہت کم کیا جا سکتا ہے اور قوم کی عورتوں کو آزادی سے افرادِ قوم کے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے کی عام اجازت ہو سکتی ہے -

ان تمام اصلاحوں کے علاوہ شادی کی بعض قبیح رسوم قوم کی توجہ کی محتاج ہیں - نارضامندی کی شادیاں مسلمانوں میں عام ہو رہی ہیں - جن کی وجہ سے ۹۹ فی صدی اسلامی گھروں میں اس بات کا رونا رہتا ہے کہ میاں بیوی کی آپس میں نہیں بنتی - منگنی کا دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے بشرطیکہ شادی سے پہلے میاں بیوی کو اپنے بزرگوں کے سامنے ملنے کا موقع دیا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے کی عادات اور مزاج کا مطالعہ کر سکیں اور اگر ان کے مذاق قدرتاً مختلف واقع ہوئے ہیں - تو منگنی کا معاہدہ فریقین کی خواہش سے ٹوٹ سکے - لیکن افسوس ہے کہ موجودہ دستور کے مطابق فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ پر پورا عمل نہیں ہو سکتا - لڑکا خواہ منگنی سے پہلے اپنے سسرال کے گھر میں جاتا ہی ہو منگنی کے بعد تو اس کو اس گھر سے ایسی ہی پرہیز کرنی ہوتی ہے - جیسے ایک متقی کو میخانے سے - افغانوں میں منگنی کے بعد میاں بیوی کو آپس میں ملنے کی عام اجازت ہوتی ہے لیکن یہ غلیہ دستور اسلامی نہیں ہے بلکہ اسرائیلی ہے اور پٹھانوں کے اسرائیلی الاصل ہونے پر دلالت کرتا ہے - اس میں کچھ شک نہیں کہ اس دستور میں بہت سی قباحتیں ہیں - منجملہ ان کے ایک یہ ہے کہ منگنی کے بعد سے شادی کے زمانے تک بعض مسلمان ذاتوں میں بہت سا روپیہ فضول طور پر خرچ ہوتا ہے - علاوہ اس کے روز کی خانہ جنگیاں اور شکوے شکایت

ہوا کرتے ہیں۔ جن سے جانبین میں ابتدا ہی سے بدمزگی پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی نتائج سے میاں بیوی کی آئندہ زندگی بسا اوقات نہایت تلخ ہو جاتی ہے۔ تاہم اگر اس کی اصلاح کر دی جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ دستور نہایت مفید ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس میں مغربی دستور کورٹ شپ کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور اس کے نقائص معدوم۔ منجملہ اور قومی امراض کے ایک بیجا نام و نمود کی خواہش کا مرض ہے جو عام طور پر ہمارا دامنگیر ہے۔ مجھے اس وقت ایک معنی خیز لطیفہ یاد آیا جسکو بیان کرنے سے رُک نہیں سکتا۔ ہمارے سیالکوٹ کے قریب تحصیل وزیر آباد میں ایک بزرگ کیسر شاہ نام رہا کرتے تھے۔ رندانہ طریق کے ایک صاحب کرامت درویش تھے اور مراقبہ وحدت الوجود سے انہیں خصوصیت تھی۔ قرب و جوار کے تمام معززین ہندو اور مسلمان ان کے حلقہ مریدان میں شامل تھے۔ ایک روز کا ذکر ہے کہ ایک دیوان صاحب جو ان کے معتقد تھے اپنے اکلوتے بیٹے کی شادی سے فارغ ہو کر حضرت کی زیارت کو آئے اور آتے ہی اپنے نام و نمود کا نقشہ اُتارنا شروع کیا۔ وہ بزرگ ان کے اخراجات کی طویل فہرست خاموشی سے سن رہے تھے کہ ایک درویش نے سائیں صاحب کی خدمت میں آکر عرض کیا کہ حضرت کھانا تیار ہے۔ سائیں صاحب نے پوچھا بھائی نری خشک روٹی ہے کہ ساتھ کوئی سالن بھی ہے؟ درویش نے عرض کیا حضرت سالن اس وقت موجود نہیں۔ آپ نے دیوان صاحب سے فرمایا کہ ذرا بازار سے جاکر ایک مولی تو لے آؤ ہمیں یہی سالن کا کام دے جائیگی۔ اتفاقاً دیوان صاحب کے جیب میں اس وقت کوئی پیسہ موجود نہ تھا فدا کھسیانے ہوئے اور سائیں صاحب کے سامنے جو چند کوڑیاں رکھی تھیں انہیں دیکھ کر بولے حضرت یہ کوڑیاں ولائیے میرے پاس اسوقت کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹے کی شادی پر جو نام و نمود تم نے حاصل کیا ہے اُسے دے کے ایک مولی لے آؤ۔ دیوان صاحب مسکرائے اور کہنے لگے حضرت بھلا نام و نمود کے عوض میں بھی کوئی کھانے پینے کی چیز ہاتھ آسکتی ہے۔ سائیں صاحب نے اپنے معمولی ظریفانہ طریق میں فرمایا کہ بھائی تیرے نام و نمود کی قیمت ایک مولی بھی نہیں پڑتی۔ اُس کے حصول سے

فایدہ ہی کیا۔ دیوان صاحب نہایت خفیف ہوئے اور آیندہ کے لئے اپنی حرکات سے توبہ کی۔

اصلاح تمدن کے بعد ہماری دوسری ضرورت تعلیم علم ہے۔ مُسلمانوں نے بالعموم یہ سمجھا ہے کہ تعلیم کا مقصد و منشا زیادہ تر دماغی تربیت ہے اور جو تعلیمی کام آج تک ہمارے اہل الرائے نے کیا ہے۔ اس کی بنا اِسی خیال پر رہی ہے۔ مگر مَیں نے جہاں تک اس مسئلے پر غور و فکر کیا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ تعلیم کا اصل مقصد نوجوانوں میں ایک ایسی قابلیت کا پیدا کرنا ہے جس سے ان میں باحسن وجوہ اپنے تمدنی فرائض کے ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ میری مراد یہ نہیں کہ جو دماغ قُدرتی طور پر علمی تحقیقات کی اصلی صُورتوں کی طرف میلان رکھتے ہیں اُن کے نمو کو روک دیا جائے بلکہ میرا مدعا یہ ہے کہ مجموعی حیثیت میں قومی تعلیم کی بُنیاد ان ضرورتوں پر ہونی چاہیے جو انقلابِ حالات کی وجہ سے پیدا ہوئی ہوں۔ انگلستان ایک تجارتی قوم ہے نپولین ہمیشہ اس قوم کو دوکانداروں کی قوم کہا کرتا تھا مگر مَیں سمجھتا ہُوں کہ تاریخی لحاظ سے یہ بات نپولین کے زمانے میں اس قدر صحیح نہ تھی جس قدر کہ اب ہے۔ یہ مُلک اپنی خوراک کے چار حصّے اور قریبًا قریبًا تمام مصالح خام غیر ممالک سے حاصل کرتا ہے اور ہر دو صُورتوں میں قیمت کے عوض غیر ممالک کو اپنی مصنوعات دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر یوں کہو کہ انگلستان ایک بہت بڑی دوکان ہے جس سے تمام دنیا کی قومیں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید کرتی ہیں۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ انگلستان کو زیادہ تر ایسے آدمیوں کی ضرورت ہے جو اس کے تجارتی کاروبار کو سرانجام کر سکیں لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے مُلک میں تعلیم کا مُدعا زیادہ تر تجارتی قابلیت پیدا کرنا ہو اور اگر واقعات کے رُو سے دیکھا جائے تو انگلستان نے اپنی قومی تعلیم میں اس بات کو ملحوظ رکھا ہے۔ اس وقت قومی زندگی کے شرائط میں جو حیرت ناک انقلاب آیا ہے میری رائے میں اس کی سب سے بڑی خصُوصیت صنعت و تجارت ہے۔ ایشیائی قوموں میں سے جاپانیوں نے سب سے پہلے اس تغیّر کے مفہوم کو سمجھا اور اپنے مُلک کی صنعت کو ترقی دینے میں ایسی سرگرمی سے مصروف ہُوئے کہ آج یہ لوگ دُنیا کی مہذب اقوام میں شمار ہوتے ہیں اس امتیاز کی وجہ

یہ نہیں ہے کہ جاپانیوں میں بڑے بڑے فلسفی یا شاعر یا ادیب پیدا ہوئے ہیں۔ بلکہ جاپانی عظمت کا تمام دار و مدار جاپانی صنعت پر ہے۔

وہ مصاف زندگی جو آجکل اقوامِ عالم میں شروع ہے اور جس کے نتائج بعض اقوام کی صورت میں یقیناً نہایت خطرناک ہونگے ایک ایسی جنگ ہے جسکو مسلح سپاہیوں کی ضرورت نہیں بلکہ اس کے سپاہی وہ ہنرمند دستکار ہیں۔ جو خاموشی کے ساتھ اپنے اپنے ملک کے کارخانوں میں کام کر رہے ہیں۔ اس زمانے میں اگر کسی قوم کی قوت کا اندازہ کرنا مطلوب ہو تو اس قوم کی توپوں اور بندوقوں کا معائنہ نہ کرو بلکہ اس کے کارخانوں میں جاؤ اور دیکھو۔ وہ قوم کہاں تک غیر قوموں کی محتاج ہے اور کہاں تک اپنی ضروریات کو اپنی محنت سے حاصل کرتی ہے۔ ان حالات کو مدنظر رکھ کر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہندوستانیوں اور خصوصاً مسلمانوں کو تعلیم کی تمام شاخوں سے زیادہ صنعت کی تعلیم پر زور دینا چاہیئے۔ واقعات کے رو سے میں یہ بات وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جو قوم تعلیم کی اس نہایت ضروری شاخ کی طرف توجہ نہ کریگی وہ یقیناً ذلیل و خوار ہو جائیگی۔ یہانتک کہ صفحۂ ہستی پر اس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہیگا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان بالخصوص اس سے غافل ہیں اور مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اپنی غفلت کا خمیازہ نہ اٹھائیں۔ میں صنعت و حرفت کو قوم کی سب سے بڑی ضرورت خیال کرتا ہوں اور اگر میرے دل کی پوچھو تو میں سچ کہتا ہوں کہ میری نگاہ میں اس بڑھی کے ہاتھ جو تیشے کے متواتر استعمال سے کھردرے ہو گئے ہیں ان نرم نرم ہاتھوں کی نسبت بدرجہا خوبصورت اور مفید ہیں جنہوں نے قلم کے سوا کسی اور چیز کا بوجھ کبھی محسوس نہیں کیا۔ اس مضمون کے متعلق تاثرات کا جو ہجوم میرے دل میں ہے میں اُسے الفاظ میں ظاہر نہیں کر سکتا۔ اور یقیناً ان ٹوٹی پھوٹی سطور سے میرے مافی الضمیر کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ ؎

از اشک میرسید کہ در دل چہ خروش است
ایں قطرہ ز دریا چہ خبر داشتہ باشد

اقبال

معشوقہ عرب کی یاد

او نقم[1] کی گھاٹیو! او، او شعوب[2] کی وادیو! اور او ضعاء[3] کے سبزہ زار باغو! تمہارا بُرا ہو۔ او، اے وُہ ریگستان! جہاں قبیلہ عنس خیمہ زن ہے اور اے وُہ شہر! جہاں قبیلہ قدم آباد ہے میں تمہیں کچھ بھی دوست نہیں رکھتا۔ میرے خُدا! اگر کبھی ان مقامات میں تو ابر صبح کو برسنے کا حکم دے تو ننھی ننھی ٹھنڈی بوندوں کے بدلے گرم انگارے ہی برسا۔

ہاں او وادی اُشی! تو مجھے البتہ محبوب ہے جہاں شام کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اِدھر اُدھر سیر کرتے پھرتے ہیں کیونکہ تو اُن رشک حاتم نوجوانوں کا مسکن ہے۔ جو اپنے قبیلے کی طرف سے دیت و قرض ادا کرتے ہیں اور اُس زمانے میں وُہ حقوق مہمانداری ادا کرنے والے ہیں جب پَو پھٹنے کے پہلے نہ برسنے والے رقیق[4] ابر کے شامیانے چھم چھم کرنے والے ریگستانی فرش پر تنے رہتے ہیں اور جب قحط خلق خدا پر اپنے دانت تیز کرتا ہے تو وُہ اُس کو دندان شکن جواب دینے والے ہیں اگر صبا رفتار گھوڑوں کی پیٹھوں پر اُنکو دیکھو تو ایسے شہسوار معلوم ہونگے جس کے زبردست اعضا میں نام کو جنبش نہیں۔ اور ان کے تیز دم گھوڑے اپنی سُموں سے پتھریلی زمین میں شعلے بھڑکاتے ہیں۔ اُن کے چُولہے راکھوں[5] سے بھرے رہتے ہیں اُن کی پاکدامن بیبیاں اُن کو عزیز رکھتی ہیں۔ جب سردی لمبی ناکوں سے پانی بہا دیتی ہے۔ بدلی برسنے کا نام نہیں لیتی۔ اس وقت یہ اپنے قبیلے کی بیوہ عورتوں اور مساکین پر ابر کرم برساتے ہیں۔

ان نوجوانوں کے وُہ اُونٹ جن پر صرف بہار کے دِنوں سواری کی جاتی ہے اور جو بلند کوہان والے ہیں بڑے ہی بدبخت ہیں کیونکہ عام بخشش کی وجہ سے اپنے بڑے نیزوں والے مالک سے

---

[1] مقام کا نام ہے ۱۲ [2] مقام کا نام ہے ۱۲ [3] یمن کا کشمیر ہے ۱۲ [4] عرب اسے علامت قحط سمجھتے ہیں ۱۲ [5] اس مال کو کہتے ہیں جب قاتل قتل کے عوض میں ادا کرے ۱۲ [6] علامت قحط اسکو عرب جانتے ہیں ۱۲ [7] کثرت ضیافت کنایہ

جدا ہمیشہ ہو جاتے ہیں اُن کی کریمۃ النسب اُونٹنیاں چراگاہ نہیں جاتیں۔ کیونکہ کون جانتا تھا کہ اُن کا مہمان کب قدم رنجہ فرمائیگا۔ اُن کے دسترخوان کے پیالے لذیذ کھانوں سے بھرے ہوئے بالکل تاج پوش معلوم ہوتے ہیں۔

اے وادی آشی! میرے دل میں اب کوئی ہوس باقی نہیں اگر ہے تو یہ ہے کہ کاش میں اپنے منتخب چمکتی تلوار والے دوستوں کے ساتھ جو چھوٹے چھوٹے بال والے قدم باز بھیجنے والے گھوڑوں پر سوار ہوتے جن کی سُموں سے پتھر کے ٹکڑے ایسے اڑتے جیسے چھواروں کی گٹھلی توڑنے والے پتھر سے گٹھلیاں۔ صبح ہی صبح آسیاج۔ سمان میں گذرتا ہوا۔ اور ان دوستوں پر چادریں نہ ہوتیں بلکہ نبع[1] اور ایجم[2] کی شاخوں کی کمانیں زیب دوش ہوتیں اور یہ مختصر سا قافلہ محترم کی گھاٹیوں سے گذرتا ہوا تیرے سبزہ زار باغوں کے گرد خیمہ زن ہوتا اور ہماری چاروں طرف سفر کی وجہ سے دُبلے ہونے والے اُونٹ ہوتے اُس وقت میں تجھ سے پوچھتا کہ اے وادی آشی! اُس رشک فردوس چمن کا کیا حال ہو جس تک زمانے کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ جہاں وہ پاکدامن لڑکیاں سکونت گزین ہیں جو بالکل گڑیا معلوم ہوتی ہیں جن پر فدا ہونے والے وہ شریف النسب نوجوان ہیں جو اپنے گھروں میں تو آقا ہیں مگر جب تم اُن کے ساتھ اُن کے کجاووں میں سفر کرو تو تمہارے خادم بنے رہینگے۔ اُنہیں۔ وشیزہ لڑکیوں میں میری ہرنی رویقہ بھی ہوگی۔

اور پھر میں اپنے غبار آلودہ زلفوں والے دوستوں کے ساتھ سفر کے تکان سے سو جاؤں اور میری پیاری رویقہ مجھے خواب میں نظر آئے۔

ہاں ہاں میرے دونوں[3] دوستو! خاموش۔ خاموش۔ وہ دیکھو رویقہ دبے پاؤں چلی آرہی ہے کیسی خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ ہمالبتہ انگلیاں تو بالکل اُسروع[4] ہی معلوم ہوتی ہیں کمر تو تمہارے سے بھی پتلی ہے دانت تو بالکل گلِ بابونہ ہی ہیں۔ نہیں حباب دریا ہیں۔ نہیں نہیں اولے

[1] علامت قحط اسے عرب جانتے ہیں۔ [2] یہ دو درخت ہیں جنکی کمان بڑی مضبوط ہوتی ہے [3] عربوں کی رسم ہے کہ شعر میں دو کو مخاطب کیا کرتے ہیں۔ [4] یہ ایک کیڑا ہے جو ریگستان میں ہوتا ہے۔ اس کا سر تو سُرخ ہوتا ہے۔ مگر اور بدن سفید۔ عربی شعراء مہندی لگی ہوئی انگلیوں کو اس سے تشبیہ دیتے ہیں۔ کیا سچی تشبیہ ہے؟

ہیں۔ قامت نیزہ سا سڈول سیدھا ہے آنکھیں نشیلی ہیں اور میری[1] سفید اونٹنی کے ہانکنے والے گادان صحرائی کی آنکھوں اور اُنکی آنکھوں میں تو ہی بتا کیا فرق ہے؟ جُوڑا بندھے ہُوئے بال چھواروں کے خوشے معلوم ہوتے ہیں۔ ایں! اس وقت اِس نے خمار کیوں نہیں اوڑھا؟ ہاں ہاں سچ تو ہے مجھ سے پردہ ہی کیوں کرنے لگی۔ آ! روَیقہ! آ میرے پالان کے پاس بیٹھ جا! اپنے آپ ذہن سے میرا سوزِ دل سمجھا ہاں یہ تو بتا قوائی کیونکر تیری نزاکت تو تجھے پڑوسن کے ہاں بھی نہیں جانے دیتی تھی روَیقہ! قسم ہے برسنے والی بدلیوں اور چمکنے والی تاروں کی میں تجھے بھولا نہیں اور نہ عیش و رحت اور طول عہد نے نجد میں دامن[2] زمین پر کھینچ کے اٹکھیلیاں کر کر کے چلنے کا سماں میری لوح دل سے محو کیا اور نہ اپنی دل کی قسمت میں میں نے تیرے سوا کسی اور کو شریک ....

ایں! ایں!! کہاں جاتی ہو؟ اچھا جاتی ہو تو مجھے توشہ لے دینے دو۔[3]

از حماسہ

سید سلیمان

ذینوفن اپنے اُستاد حکیم سُقراط کی نسبت لکھتا ہے :۔

جب تک بھوک نہ لگتی تھی وُہ دسترخوان پر نہ بیٹھتا تھا۔ بھوک بڑھانی کے لئے اچار چٹنی کچھ نہ کھاتا تھا جب تک کھانے میں مزہ آتا تھا نوالہ توڑتا تھا۔ مزہ کم ہوتے ہی کھانے سے ہاتھ کھینچ لیتا تھا۔ جب تک پیاس لگتی کچھ نہیں پیتا تھا کہیں ضیافت میں جاتا تھا۔ تو کیا مجال ہے معمول یا بھوک سے ایک نوالہ زیادہ کھالے۔ یا پیاس سے ایک بُوند زیادہ پی جائے۔ اَور دل کو بھی یہی نصیحت کیا کرتا تھا کہ جس چیز کے بھوک سے زیادہ کھا جانے کو جی چاہے کبھی نہ کھانا۔ اور جس شے کے پیاس سے زیادہ پینے کو دل چاہے ہرگز نہ پینا۔ کیونکہ معدہ بھوک سے زیادہ کھانے اور پیاس سے زیادہ پینے ہی سے بگڑتا ہے +

---

[1] عربی شعرا ہمیشہ اپنے کلام میں اس کو مخاطب کرتے ہیں ۱۲ [2] دامن زمین پر کھینچ کے چلنا اہل عرب کے نزدیک تبختر کی علامت ہے ۱۲ [3] یہ ایک محاورہ ہے جس کو عرب بازدید کے موقع پر بولتے ہیں ۱۲

جنابِ داغ مرحوم

حسرت اور تاسف کا مقام ہے کہ آج ہماری قلم کو اقلیم سخن کے ایک بزرگ دوست اور مقتدر بادشاہ سلف کی ایک قابل قدر یادگار اور خلف کے باعث افتخار کی موت کا واقعہ درج مخزن کرنا پڑا۔ یعنی جہان استاد بلبل ہند ناظم یار جنگ دبیر الدولہ نواب فصیح الملک بہادر نواب میرزا خاں صاحب داغ دہلوی تاریخ ۱۶ فروری ۱۹۰۵ء بمقام حیدرآباد دکن۔ عازم ملک بقا ہوئے اور اپنے ہزاروں شاگردوں اور لاکھوں قدردانوں کو افسوس اور رنج کرنے کے لئے چھوڑ گئے إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

مرحوم ۲۵ مئی ۱۸۳۱ء مطابق ۱۱ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ کو بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ آپ نواب شمس الدین احمد خاں مرحوم کے فرزند تھے اور آپکا خاندان دہلی مرحوم کے شریف ترین خاندانوں میں سے تھا۔ ابتدا ہی سے فن شعر سے طبیعت کو لگاؤ اور دل کو شوق تھا۔ گیارہ بارہ برس کے سن میں آپنے خاقانی ہند شیخ محمد ابراہیم ذوق مرحوم کا تلمذ اختیار کیا۔ طبیعت نے یوماً فیوماً ترقی کی اور اوائل جوانی ہی میں اساتذۂ وقت نے آپ کے کلام کی داد دینی اور آپ کی حوصلہ افزائی شروع کی۔ ایام غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے تک آپکی عمر بے فکری اور عیش و آرام میں کٹی مگر غدر کی آفت نے جہاں شرفا اور اہل کمال کو تباہ اور پریشان کیا وہاں آپکو بھی ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ غدر کے بعد آپ رامپور کو تشریف لے گئے۔ وہاں عرصے تک مختلف خدمات پر مامور رہے اور میدان سخن میں کوس استادی بجایا۔ گلزار داغ۔ آفتاب داغ اور مثنوی فریاد داغ ایام قیام رامپور کا نتیجہ ہیں۔

۱۸۸۸ء میں آپ حیدرآباد دکن میں تشریف لائے اور کئی سال تک دربار دکن میں ملازمت کی امید پر حیدرآباد میں مقیم رہے۔ تین سال کے بعد آخر کار سرکار نظام میں ملازم ہوگئے اور روز بروز ترقی منصب پاتے گئے۔ اسوقت مرتے دم تک آپ حیدرآباد دکن میں ملازم رہے۔ آپکے شاگردوں کی طویل فہرست کو حضور نظام خلد اللہ ملکہ کے نام نامی کے شمول کی زینت حاصل ہے۔

جب آپکے انتقال کی خبر لاہور میں پہنچی تو ہمارے مکرم دوست پروفیسر محمد اقبال صاحب ایم اے نے جو آپکے ارشد تلامذہ میں سے ہیں آپکی وفات کی برجستہ اور فی البدیہ تاریخ "نواب میرزا داغ" کہی۔ چنانچہ یہ تاریخ پیسہ اخبار لاہور میں شائع بھی ہو چکی ہے۔ آئندہ پرچہ میں ہم حضرت داغ مرحوم پر پروفیسر اقبال کی ایک نظم اور انکے کلام پر سید غلام بھیک صاحب نیرنگ کی ایک تنقید شائع کرینگے۔ اگر اسوقت تک حضرت مرحوم کی تصویر بھی دستیاب ہو گئی تو

نیا شوالہ

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو بُرا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بُت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بُتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
تنگ آ کے مَیں نے آخر دَیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا۔ چھوڑے ترے فسانے
کچھ فکر پھوٹ کی کر مالی ہے تو چمن کا
بوٹوں کو پھونک ڈالا اس بیر بھری ہوا نے

پتھر کی مُورتوں میں سمجھا ہے تو خُدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ مل کے غیریت کے پردوں کو پھر اُٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دُوئی مٹا دیں
سونی پڑی ہُوئی ہے مُدت سے جی کی بستی
آ! اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں
دُنیا کے تیرتھوں سے اُونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسمان سے اس کا کلس ملا دیں
پھر اک انوپ ایسی سونے کی مُورتی ہو
اس ہردوارِ دل میں لا کر جسے بٹھا دیں
سُندر ہو اس کی صُورت چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں جو دل کی ہوں مرادیں
زُنار ہو گلے میں تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنے صنمکدے میں شانِ حرم دکھا دیں
پہلو کو چیر ڈالیں درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اِک آگ سی لگا دیں
آنکھوں کی ہے جو گنگا لے کے اُس سے پانی
اس دیوتا کے آگے اِک نہر سی بہا دیں
"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھُولے ہُوئے ترانے دُنیا کو پھر سنا دیں
ہر صبح اُٹھ کے گائیں منتر وُہ میٹھے میٹھے
سارے پُجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں
مندر میں ہو بلانا جس دم پُجاریوں کو
آوازہ اذاں کو ناقوس میں چھپا دیں
اگنی ہے وُہ جو نرگن کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

اقبال

رباعیاتِ احسن

کی اُلفتِ پنج تن ہمارے جی نے
معمور ہیں نورِ حق سے اپنے سینے
احمد ۔ حیدر ۔ بتول ۔ شبّر ۔ شبیر
ہیں منزلِ واحد کے یہ پانچوں زینے

شبیر کی کچھ بات نہ مانی ۔ نہ ملے
ہرچند کہا ظلم کے بانی نہ ملے
اسلام سے یوں شرک جدا رہتا ہے
جس طرح کہ تیل اور پانی نہ ملے

تھے شمر و عمر ظلم و ستم کے بانی
کچھ آلِ نبی کی نہ حقیقت جانی
سبطِ احمد کی تشنہ کامی پہ مگر
پانی بھی ہوا جاتا تھا پانی پانی

کیا ڈر ہے اگر روزِ قیامت ہو سیاہ
کیا خوف زیادہ ہیں اگر اپنے گناہ
احسن کہ حسن کے بخشوائیں گے ہمیں
سبطین علیہم السلام انشاء اللہ

کیوں لب پہ ہمارے نہ رہے نالہ و آہ
کیونکر نہ غم و رنج میں ہو حال تباہ
احسن افسوس زندگی پر اپنی
شبیر ہوئے شہید اِنّا لِلہ

پھول کانٹے

یا

گل و گلچیں

جب ہو چکے بخوبی تیار پھول[1] کانٹے[2]
دامن میں بھر کے بیٹھا گلزار[3] پھول کانٹے

اپنی جگہ پہ دونوں تھے مظہر صباحت
تھے مایۂ ترکے مژگاں خسار پھول کانٹے

تھے زینت گلستاں، یا داغ سنبلستاں
لیکن تھے ذات حق کے اسرار پھول کانٹے

اپنے بنانے والے کی قدرت عجائب
رگ رگ سے کر رہے تھے اظہار پھول کانٹے

اشرار کے کرشمے۔ ابرار کے طریقے
دونوں بتا رہے تھے دو چار پھول کانٹے

اک "مرگ" نام گلچیں داخل ہوا چمن میں
تکنے لگا وہ ہر سو ہر بار پھول کانٹے

واں دایۂ بہاری۔ اتنے میں یوں پکاری
حضرت ہمیں نہیں ہیں کچھ بار پھول کانٹے

پالا ہے میں نے ان کو کن کن خرابیوں سے
میرے تو ہیں یہ نور الابصار پھول کانٹے

جاؤ ہٹو بھی صاحب! کیا ظلم کر رہے ہو؟
میں توڑنے نہ دونگی زنہار پھول کانٹے

بولا بچشم نم وہ[4]۔ ہم کیا کریں۔ کہ ہم سے
منگواتی ہے ہماری سرکار پھول کانٹے

جو نخل بند ہستی دونوں جہان کا ہے
اُس لایزال کو ہیں درکار پھول کانٹے

ہم داغ دے گئے ہیں اکثر گلوں کے دل پر
ہم لے گئے ہیں چن کر بسیار پھول کانٹے

اس گلشن مجازی سے انتقال کر کے
دیکھیں گے اب حقیقی دربار پھول کانٹے

اک نور[5] میں رہیگا۔ اک نار[6] میں پڑے گا
رہ جائینگے نہ اصلا بیکار پھول کانٹے

[1] کنایہ از ابرار ۔ [2] کنایہ از اشرار ۔ [3] دنیا سے کنایہ ہے ۔ [4] وہی مرگ ۔ [5] اشارہ بسمت خدائے متعال ۔ [6] بہشت ۔

چلائی ہاں کہ ہے ہے اس زندگی میں یارب دکھلائینگے کہاں پھر دیدار۔ پھول کانٹے!
رو رو کے اُس نے آخر دونو کئے حوالے سنے دے کے چلدیا وہ پاکار[۱]۔ پھول کانٹے

آغوشِ مادری میں دو روز رہ کے طالب
راہِ فنا میں آئے ناچار۔ پھول کانٹے

طالب بنارسی (ایڈیٹر)

ٹیپو سلطان

واقعاتِ تاریخ کو نظم میں ادا کرنا اور ان پر موزونیت کا رنگ چڑھانا کچھ آسان کام نہیں ہے۔ سخن ور اُس کی مشکلات سے خوب واقف ہیں۔ اور شاید مندرجہ ذیل نظم کی جو ہمارے دوست حافظ محمود صاحب شیرانی۔ منشی فاضل نے لکھی ہے داد دینگے۔ آپ ان دنوں انگلستان میں مقیم ہیں اور انگریزی لٹریچر سے آشنائی پیدا کر رہے ہیں۔ انگریزی میں یہ انداز نظم کا بکثرت موجود ہے۔ لارڈ مکالے کی اُن نظموں سے جن میں اُنہوں نے اہلِ روما کے قدیم جنگ آوروں کی بہادری اور حُبِ وطن کی داد دی ہے کون واقف نہیں۔ افسوس کہ انگلستان کے مصنفین تو دوسرے ملک کے ناموروں کے کارناموں کی تعریف میں رطب اللسان ہوں اور ہمارے اہلِ ملک کبھی اپنی تاریخ کے ورق اُلٹ کر نہ دیکھیں۔ اگر دیکھیں تو ہندوستان کی تاریخ ازسرتاپا بہادری کی داستانوں سے پُر ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ کون کس فریق کا تھا اور کس سے لڑا مگر اپنی اپنی جگہ ہر ایک کے دست و بازو نے جوانمردی کا حق ادا کیا۔ شیرانی صاحب نے اس نظم میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ اسی اصول کو مدنظر رکھ کے کیا ہے۔

۱؎ تحضیر کا پیادہ مراد از ملک الملکوت ۱۲

پورس سکندر سے لڑا - پرتھی راج شہاب الدین غوری سے اور ٹیپو سلطان انگریزوں سے - اس سے بحث نہیں کہ عام ہمدردی سکندر سے ہو یا پورس سے - مسلمانوں کی ہمدردی غوری سے ہو یا پتھورا سے - جنوبی ہندوستان انگریزی سلطنت میں خوش ہے یا ٹیپو سلطان کی حکومت میں ہوتا - جو کوئی بھی ہندوستان کے لئے لڑا ہندوستانی کی نظر میں قابلِ وقعت ہے - اور ہندوستان کے ناموروں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق - شیرانی صاحب کو ٹیپو سلطان کے بارے میں کئی انگریز مورخوں سے اختلاف ہے - مگر ایسے معاملات میں آزادیِ رائے کا دخل بجا ہے :-

اے رستگانِ محفل،　　رفتید و سے نہ از دلِ ما

عجائباتِ زمانہ کے اے تماشائی　　رہا ہے سیرِ جہاں کا جو تو تمنائی
محیطِ ارض پہ کی تو نے گام فرسائی　　قطب سے کی ہے قطب تک کی دشت پیمائی
نظر میں ہے تیری خورشید کا طلوع و غروب
زمیں کے دیکھ کے آیا ہے تو شمال و جنوب
تماشہ گاہ ہے ترا زمین کا محور　　بہت کیا ہے خطِ استوا میں تو نے سفر
جو دن کو سایۂ خورشید میں کیا بستر　　چلا ہے رات کو تو کہکشاں کے رستے پر
کبھی رہا ہے تو ریڈ انڈینز[1] کے بن میں
کبھی قیام کیا پپوا[2] کے مسکن میں
افق پہ جبکہ عناصر میں ہو صف آرائی　　جہاز لائے تباہی میں موجِ دریائی
فضا میں جبکہ چلی ہو سموم صحرائی　　غبارِ دشت سے آنکھوں میں تیرگی چھائی
ہر ایک حال میں چلنے سے کام ہے تجھ کو
نہ لطفِ صبح نہ کچھ خوفِ شام ہے تجھ کو
دیارِ ہند میں جب سیر کے لئے آنا　　تو اپنے پہلو میں تو اک دلِ حزیں لانا

---

[1] امریکہ کے اصلی باشندے۔ [2] آسٹریلیا کے اصلی رہنے والے ۱۲

مجاہدات میں یاں کی نہ دل کو اُلجھانا　　دکن میں جا کے سرنگا پٹم چلا جانا

کہ جس کی خاک میں سوتا ہے شیرِ ہندوستاں

زمانہ بھول گیا جس کے ہوئے سب احساں

ادب ہو شرط تجھے اس مقامِ عبرت پر　　بہانا اشک تو اس تاجور کی تربت پر

فلک سے لڑنا تو اس نامور کی حسرت پر　　ہزار آفریں اس شیر دل کی جرأت پر

کہ جس کے نام سے ڈرتے تھے بچگانِ فرنگ

جھکا ہے سامنے جس کے بہت نشانِ فرنگ

زمینِ ہند سے اُٹھا نہ کوئی فرزانہ　　رہا یہ مُلک ہمیشہ شطیح بیگانہ

بقدرِ ظرف جو ملتا کسی کو پیمانہ　　دکھاتا کر کے وہ کچھ ہائے وہ ہوئے مستانہ

جہاں نے ختم کئے دور سالہا تو دراز

ہوا نہ پیدا پتھورا[1] کا کوئی ہم آواز

وہ جام جس سے کہ مدہوش ہوگیا تھا پور[2]　　وہ بادہ جس سے کہ سلطان لودھی[3] تھا مسرور

وہ آگ جس میں سراجل کے شیر شاہ سور　　اسی شراب نے ٹیپو کو بھی کیا مخمور

زمانہ گرچہ مخالف ہی پایا ٹیپو نے

کرے گا کون جو کچھ کر دکھایا ٹیپو نے

سپہرِ ہند کا وہ اک چمکتا اختر تھا　　دکن کی خاک کا اک آبدار گوہر تھا

نصیبِ ہند تھا اقبال تھا مقدر تھا　　نہ کیوں ہوا ایسا کہ آخر کو ابنِ حیدر تھا

خیال اُس نے کیا کچھ نہ اپنی زحمت کا

قدم قدم پہ رہا دھیان اس وصیت کا

فلک بکامِ تو باشد کہ اہتمام کند　　سپہر بادۂ عیشے ترا بجام کند

[1] مہاراجہ پرتھی راج جو تراوڑی کی لڑائی میں سلطان شہاب الدین غوری سے لڑا تھا ۔ [2] یعنی پورس جس نے سکندر کی افواج کا مقابلہ کیا تھا۔

تہ تیغ غنچہ کیں تو بدر جام کند　　　　اگر ببید تو اندر پے سر تمام کند

تا کہ زور بہ بازوے تیغزن باقی ہست

بگیر تیغ کہ آں حسرتِ کہن باقی ہست

ندھونڈو لُطفِ سحرگاہ شامِ ماتم میں　　　　کبھی نہ دیکھو گے ذی حجہ تم محرم میں

دکھائے خاک بہار اپنی باغ عالم میں　　　　وُہ پھُول جو کہ کھلا ہو خزاں کے موسم میں

کئے خُدا نے مقرر ہر ایک کام کے وقت

سحر کا کام ملا اس کو ہائے شام کے وقت

دکھائے اُس نے شجاعت کے خُوب ہی جوہر　　　　اِدھر وہ یکہ و تنہا خُدا کی ساری اُدھر

وُہ کیا کرے نہ ہو جس کا کہ آسماں یاور　　　　شکست و فتح تو ہے منحصر مقدر پر

نہ ہارا حوصلہ اس تیغ زن نے خوب کیا

مقابلہ تو مرے پہلواں نے خوب کیا

نظام دیکھ کے اندازِ جنگ ہیں مسرور　　　　پھرا ہے پیشوا لیکر غنیمت موفور

کھینچیں کس لئے انگریز اپنے آپ کو دُور　　　　کہ جس سے رکھتے تھے دل پر وُہ سینکڑوں ناسُور

پڑا تھا خاک پہ اس نامور کا لاشہ ہائے!

فلک یہ تو نے دکھایا ہے کیا تماشہ ہائے

وُہ بادہ جس کا کہ خانِ شہید تھا شیدا　　　　وُہ نوش جس کو کہ تغلق نے ناپسند کیا

وُہ زہر جس کا کہ ہیموں نے پی لیا پیالہ　　　　ازل کے دن سے یہ حصہ نصیبِ ٹیپو تھا

مرا وُہ مَوت جسے کہتے عاشقانہ موت

سپاہی کہتے ہیں جس کو سپاہیانہ موت

بجا ہے اس کو جو بیداد گر کہیں انگریز　　　　درست ہے جو اُسے بے ہُنر کہیں انگریز

روا ہے اس کو اگر بے خبر کہیں انگریز　　　　رقیب کو ستم آرا اگر کہیں انگریز

کہ اس کے آگے چھلکتا رہا ایاغ فرنگ
جلا نہ سامنے اُس کے کبھی چراغ فرنگ

ہزاروں اُٹھ گئے دُنیا سے بے پھلے پھولے
وُہ ہونہار جو دنیا میں آئے اور نہ رہے
وُہ تازہ غنچے جو مُرجھا گئے بغیر کھلے
اسی طرح سے گیا ٹیپو وقت سے پہلے
کہ اس کو موت ہی آئی شباب سے پہلے
پلایا زہر ہے اس کو شراب سے پہلے

رہا زمانہ میں کچھ روز میہماں کی طرح
بہار اس کی جوانی بھی تو خزاں کی طرح
چھپا نگاہوں سے وُہ گنج شائگاں کی طرح
دلوں سے محو ہوا یادِ رفتگاں کی طرح
کسی بشر نے نہ کی اُس پہ اشک افشانی
فرشتے گو یہ کرتے ہیں فاتحہ خوانی

بہار گائینگی جب بلبلیں گلستاں میں
خزاں کا دَور ہو جب موسم زمستاں میں
مقابلے پہ ہوں جب دو حریف میداں میں
اُڑائیں ساغرِ مے جبکہ بزم یاراں میں
جہاں میں رسم ہے جب تک کہ شادی و ماتم
ہمیشہ روئیگا اس کے لئے سرنگا پٹم

مذہب اور سائنس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

چیخ کر بولا کہ اے سائنس کیا بکتا ہے تو
سُن چکا ہُوں مَیں تری ازابتدا تا انتہا
تیری باتیں سُنکے آتا ہے مجھے ناداں وُہ یاد
بیٹھکر اک شاخ پر جو تھا اُسی کو کاٹتا
ہے اسی خلاق اکبر نے تجھے سب دی ہُوئی
عقل و دانش ناز جس پر ہے تجھے اتنا بڑا

پر اسی کی ذات سے منکر ہوا جاتا ہے تو　　تجھ سا محسن گش زمانے میں نہ دیکھا اور سنا
حد سے بڑھ کر علم پر اپنے نہ کر تو اعتماد　　ورنہ چُندھیا دیگی تیری آنکھ کو اُس کی ضیا
آفرینش کی حقیقت سے نہیں آگاہ تو　　عاقبت اور رُوح کا مطلق نہیں تجھ کو پتا
تو بتا سکتا ہے جسم و جاں میں رشتہ منفصل　　کس جگہ ہوتا ہے اور گر ہے تو کیسا اور کیا؟
فلسفے سے ہیں تیرے اگر نہیں لیکن یہی　　تو بتا دے مادہ کیا؟ وقت کیا ہے؟ کیا خلا؟
کیا یہ دُنیا دل میں ہی یا دل کے باہر بس رہی؟　　ہر عمل کے واسطے ردِّ عمل کیونکر ہوا؟
کیا ثبوت اسکا ہی تیرے پاس میں رکھتا ہوں دل؟　　کیا یہ سب کچھ محض اک دھوکا ہے اور مکر و دغا؟
یہ تو کہتا ہی یقیں پر ہے مری سب دار و گیر　　علم سے نزدیک تیرے۔ میں ہُوں کوسوں بھاگتا
پر یہ لاعلمی مری بہتر ہے تیرے علم سے　　وہم میرا ہے یقیں سے تیرے اعلیٰ برملا
تو بھی بزدل بنکے لے لیتا ہے لاعلمی سی کام　　فرض کر لیتا ہی جب تجھ کو نہیں کچھ سُوجھتا
تجھ کو اقلیدس کی صحت پر بڑا ہو گا گھمنڈ　　گو ہے سارا علم موضوعہ اصُولوں پر بنا
جبکہ تو بھی اس مرض میں مبتلا ہے جس میں میں　　ہر کس و ناکس سے کرتا ہے سرا پھر کیوں گلا
ہیں حواسِ ظاہری سے تیرے معلومات سب　　تجربہ ہادی ہے تیرا فیکٹ[ا۵] تیرا رہنما
اُلٹی گنگا میں بہا تا ہُوں مجھے کیا علم سے　　غیب و لاعلمی پہ ہے میں نے دھری اپنی بنا
غیب سے نکلا ہوں میں اور غیب میں جاتا ہوں میں　　غیب میں بڑھتا ہُوں میں اور غیب ہامن ہر مرا
قتل و خُوں کرنیکو دُنیا میں نہیں آیا ہُوں میں　　محض تیرا ہے یہ اک بہتان و کِذب و افترا
خُوں کبھی میں نے نہیں کوئی کیا ہے۔ بلکہ میں　　خونِ ناحق کرنے والے سے ہُوں لیتا خُوں بہا
تو کسی صُورت نہیں ظلم و ستم میں مجھ سے کم　　گر تری دانست میں میں نے کئے جور و جفا
ہے نئے ہتھیار تو ایجاد کرتا آئے دن　　ڈھنگ لڑنے کا بتاتا ہے تو ہنگام وغا
تیری نی مثفور ڈ[۵۲] نے اور مارٹینی نے تری　　خُون کتنے بیگناہوں کا۔ بتا سچ سچ۔ پیا

---

[۵۱] امر واقعہ۔ [۵۲] بندوق کی قسمیں۔

کتنے معصوموں کو ہے اب تک کیا تو نے یتیم
کتنی خاتونوں کو تو نے آجتک بیوہ کیا

واسطے تیرے ہی لڑنے کے لئے آیا تھا جو
تیرا ہی ایجاد کردہ بمب شل اس پر پھٹا

سچ بتا تجھ کو گلیلو اور ہرشل کی قسم
کیوں ہے پنجے جھاڑ کر تو یوں مرے پیچھے پڑا

گر مری تعلیم سے واقف ہو تو اچھی طرح
رنجشوں سے پاک ہو جائے ترا دل او صفا

سینکڑوں روتے ہوئے آئے تری درگاہ سے
جنکو میں نے اپنی گودی میں لیا آخر بٹھا

سینکڑوں ناکام تیرے در سے آئے لوٹ کر
ٹھیک میں نے کر دیئے جن کے دماغوں کے قوا

جسم جس کی اک ترازو ہے نہیں اس میں کلام
اور مستثنےٰ نہیں اس سے دماغ انسان کا

اس میں ہیں نقطے ہزاروں عامل اعضائے جسم
اور ہزاروں جن میں جذبے دوڑتے ہیں دائما

ڈگمگا جاتی ہے ترکیب دماغی - گر نہ ہو
ایک نقطے کے مقابل اور مساوی دوسرا

ان نقاط قدرتی میں ایک ایسا بھی ہے جو
خواہش تحقیق حق میں رہتا ہے ہر دم لگا

پر نہیں خواہش کبھی اس کی ہوئی پوری نہ وہ
اس مذہب سے ہے چھوٹ سکتا جو ہے اسکا صلہ

کیا مذہب میں ہی ساری زندگی کٹ جائے حیف
کیا یونہی کچھ جی کے انساں بعد میں مرجائیگا

ہائے لے ظالم تجھے اس کا نہیں کچھ بھی خیال
اس پریشانی کی حالت سے وہ ہو کیونکر رہا

دیکھ میں نے اسکی خواہش کے لئے جائز ہے جو
کر دیا ہے لاکے ایسی راہ پر اس کو کھڑا

جس کو کہتے ہیں شریعت میں صراط مستقیم
لڑکھڑاتا پھر نہیں اس پر کبھی پاؤں جما

نقطۂ خواہش کو میں نے نقطۂ تسکیں سے
کر دیا ساکن - جبھی تو تھا ابھی میں نے کہا

"سینکڑوں ناکام تیرے در سے آئے لوٹ کر
ٹھیک میں نے کر دیئے جن کے دماغوں کے قوا"

بلہ دوئم شعر مذہب نے کہا جب یہ تو میں
بول اٹھا صد مرحبا صد مرحبا صد مرحبا

دونوں سائنس اور مذہب کو کہا میں نے شریف
ہو تو تم دونو - ولیکن وائے برحال شما

غیب میں مذہب مناتو چین اور سائنس تو
علم سے اپنے نکلکر غیب میں کیوں جا گھسا

اپنے اپنے دائروں میں کیوں نہیں رہتے - اگر
ان حدود اللہ کو توڑو گے پاؤ گے سزا

کام جو مذہب کا ہے سائنس وُہ تیرا نہیں — اور جو تیرا کام ہے مذہب نہیں سائنس کا
اس لئے کج بحثیاں سب یہ تمہاری ہیں فضول — ہاں اگر کچھ کر دکھانا ہے تو اس سے بڑھ کے کیا
اتفاقِ باہمی سے گر بڑھیں رُوح و دماغ — ہو فلاحِ دین و دنیا ۔ اور تمہاری واہ وا
اچھا جاؤ چین سے مل کر رہو اور مت لڑو — اور تم سے کیا کہوں تم کو ہدایت دے خُدا

محمد اکبر خان

دیوارِ کُہن

"ز نقش و نگار در و دیوار شکستہ — آثار پدید است صنادید عجم را"

ہوا میں رات قیامت کی سنسناہٹ تھی — اور اُس پہ تار کے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ تھی
جھکا اداس قمر جا رہا تھا مغرب کو — غریب پچھلے پہر جا رہا تھا مغرب کو
جگر پہ کھائے ہُوئے داغ بے ثباتی کا — کسی درخت کی شاخوں سے ہو رہا تھا جُدا
خراب و کہنہ و شکستہ ایک تھی دیوار — تھے جس نے دیکھے لڑکپن کے میرے لیل و نہار
قریب اس کے میں اُس دم کھڑا ہوا تنہا — زمانہ اپنے لڑکپن کا یاد کرتا تھا
وہ دل فریب نہ صُورت نہ تھے وہ نقش و نگار — کھڑی ہُوئی تھی زمین پر ضعیف و خستہ و زار
ہزار دل سے بھلاتا تھا پچھلی باتوں کو — خیال یاد دلاتا تھا پچھلی باتوں کو
دکھا رہی مجھے عبرت تھی کس غضب کا سماں — خُدا دکھائے کسی کو نہ ایسی شب کا سماں
اُدھر بس ہائے وُہ اس دم کی چاندنی ڈھلتی — بڑھا رہی تھی جو رہ رہ کے بیکسی اُس کی
بنا گئی مجھے کچھ ایسا محوِ نظّارا — زمانہ آنکھوں میں بچپن کا پھر گیا سارا
جما دیا ایسا تصوّر نے رُوبرو نقشہ — دکھا دیا مجھے طفلی کا ہُو بہ ہُو نقشہ

گذر گیا ترے آگے زمانہ اے دیوار!
کہ تیرے شہر میں سب سے قدیم ہیں آثار

پڑا ہے آج جو یہ بے مکین ویرانہ
بنا دیا ہے جسے بیکسی نے غمخانہ

کسی زمانے میں عیش و طرب کا یہ گھر تھا
چہل پہل تھی غضب کی، غضب کا یہ گھر تھا

اگرچہ اب نہ رہا بام و در کا وہ نقشہ
مگر مجھے نہیں بھولا ہے گھر کا وہ نقشہ

یہاں تھا صحن - وہاں سائباں - ادھر دالان
اُدھر کو آہ تھی اک کوٹھری رفیع الشان

ادھر کو وہ مری خلوت تھی آہ! خوش منظر
پرانے تاڑ یہ آتے تھے جس جگہ سے نظر

میں گرمیوں میں یہاں آہ! شام کو اکثر
تھا بیٹھتا کبھی ہلکی سی اک مسہری پر

وہ چھوٹی چڑیوں کا گنگنی پہ تیری اے دیوار!
چہک چہک کے ہم آہنگیوں سے گانا ملار

وہ لالالی مری بچپن کی فاختہ ہو کدھر
تھا آشیانہ کبھی آہ۔ جس کا کوٹھے پر

غضب کی درد بھری جس کی تھی کبھی "کوکو"
تھی دوپہر کو جو سرگرم نالۂ یاہو

گذر گئی ہو نہ جی سے اجل نصیب کہیں
کہ اب نظر نہیں آتی مجھے غریب کہیں

میں کاش اُس کے پر وہاں کا نشان پاتا
تو پاس رکھ کے دل غمزدہ کو بہلاتا

یہاں پہ آہ! وہ دالان تھا جو خوش منظر
میں گرمیوں میں جہاں محوِ خواب تھا اکثر

اسی کی اک یہ شکستہ بے رنگی دیوار
اُسی کی ہائے! یہ خستہ ہے رہ گئی دیوار

یہیں تو راتوں کو جلتے تھے خوشنما فانوس
یہیں بلور کے روشن تھے جابجا فانوس

یہیں کے فرش پہ میں لوٹتا تھا بچپن میں
کہ چاندنی میں یہیں کھیلتا تھا آنگن میں

خوشی پرستی تھی دیوار! تیرے منظر سے
کہ تجھ کو آہ! محبت تھی میرے گھر بھر سے

مری رفیق تھی - اور میری ہمخیال تھی تو
کہ رنج و عیش میں میری شریکِ حال تھی تو

مرا تھا اُن دنوں ساون میں جب مرا بھائی
اُداسی چہرے پہ گھر بھر کے غم میں تھی چھائی

پڑا ہوا تھا میں اک کھرّی چارپائی پر
ملول و خستہ و ماتم زدہ - لپیٹے سر

تو غمزدہ سی تھی اسوقت تو بھی اے دیوار!
اداس مجھ کو نظر آتے تھے ترے رخسار

جگرخراش فسانہ وہ یاد ہے اگلا
کہ گرمیوں کا زمانہ وہ یاد ہے اگلا

وہ چلچلاتی ہوئی دھوپ جیٹھ کی۔ وہ سموم
وہ دل ملول۔ وہ چہرہ فسردہ و مغموم

بچے دے رہے مجھے جب گرمیوں کے دن آ آ
تو ہو رہی تھی پریشان تو بھی اے دیوار

کدھر ہے آہ! وہ عہد گذشتہ او دیوار!
گذر گئے مری طفلی کے کیا وہ لیل و نہار؟

وہ کم سنی کا زمانہ نہ آئے گا پھر کیا؟
وہ دن نہ مجھ کو زمانہ دکھائیگا پھر کیا؟

نسیم دے کے ہوا مجھ کو اپنے دامن کی
وہ میٹھی نیندیں سلائیگی کیا نہ بچپن کی ا

پسند آہ! تھیں جب کھیل کود کی باتیں
پلٹ کے کیا نہ وہ آئینگی چاندنی راتیں!

رہا نہ آہ! وہ اگلا سا خوشنما چہرہ
اور اس ابلق آتا ہے چاند کا چہرہ

ہیں تیوریاں بھی تو تاروں کی آہ! بدلی سی
دکھائی دیتی ہے مجھ کو نگاہ بدلی سی

برادر و پدر و خویش و اقربا و عزیز
بدل گئی مری بچپن کی ہائے اک اک چیز

جب آہ! ہو گئیں ان سب کی صورتیں تغیر
تو کیا عجب کہ ہو تیری بدل گئی تعمیر

مگر ہے آہ! یہ کیا کم تیری وفاداری
بنا ہے جاتی ہے بچپن کی شرط غمخواری

اگرچہ تجھ کو زمانے نے کر دیا ہے نزار
بری نہیں ہے مگر اپنے جی سے تو دیوار!

کہ آج بھی تو مجھے سہ پہر کو اے غمخوار!
پناہ دینے کو سائے میں اپنے ہے تیار

وہ چھوٹے چھوٹے ترے ہائے! خوشنما پتھر
میں شیفتہ کبھی بچپن میں آہ! تھا جن پر

وہ کم سنی کی تیری غمگسار ٹھیکریاں
وہ دل میں چبھتی ہوئیں نوکدار ٹھیکریاں

جو مجھ سے نوک کی بچپن میں لیتی تھیں کشر
نہیں ہے اُن کی کوئی آج لینے والا خبر

ہے آفریں تیری ہمت کو۔ لیکن اے دیوار!
کہ بیکسی میں بھی تو آج انکی ہے غمخوار

ملول و بیکس و افسردہ و فراق نصیب
پڑے ہوئے ترے سائے میں آج بھی ہیں غریب

بجا ہے آہ! یہ میرا خیال کیا دیوار!
کہ تو مجھے بھی نہ بھولی ہو اے مری غمخوار!

مگر یقین میرے دل کو آہ! کیوں کر ہو
کہ میری یاد ابھی نقش تیرے دل پہ ہو

اگر مجھے اے کاش! تو نہ بھولی ہو — مجھے بھی آہ! تری آرزو نہ بھولی ہو
اگرچہ دُور رہا تجھ سے میں فراق نصیب — اگرچہ سائے سے تیرے بچھڑ گیا میں غریب
گذر گئے تری فُرقت میں آہ! کتنے سال — رہا میں وادیٔ غربت میں آہ! کتنے سال
میں گو رہین ستمہائے روزگار رہا — ترے خیال سے غافل نہ زینہار رہا
زمانہ یاد لڑکپن کا جب کبھی آیا — ترا خیال وہیں بنکے بیکسی آیا
ملے تھے مجھ کو جو طفلی کے آہ! دن دو چار — وہ گذرے گود میں تیری ہی اے مری غمخوار!
تجھی نے مجھ کو سکھائے خرام کے انداز — تجھی نے مجھ کو بتائے خرام کے انداز
وہ چھوڑ دینا لڑکپن میں مجھ کو دائی کا — ترے سہارے سے چلنا وہ سیکھنا م
فلک کے اگلے وہ پیمان یاد ہیں تیرے — مُربیہ! مجھے احسان یاد ہیں تیرے
ل کے جب کسی شے پر میں رُوٹھ جاتا تھا — کسی کی گود میں جب آہ! میں نہ آ
تجھ سے لگ کے میں ہو جاتا تھا کھڑا دیوار — ما کے تجھ سے میں روتا تھا غمزدہ
دامن دیکھ کے مجھ کو گلے سے لپٹا کر — لگا کے سینے سے آنسو تھی پونچھتی ا
ہیں ہُوں آہ! لڑکپن کی وہ ادا بھولا — میں جب بڑا ہوا اور گیند کھیلنا سیکھا
سے نصیب نہ جب کھیلنے کو آتے تھے — نکل کے گھر سے کہیں باہر میں نہ جاتے تھے
برستی ہوتی تھی جب گھر میں مینہہ کی بوچھاڑ — تو کھیلتا تھا میں اُسوقت تجھ سے اے دیو
مجھے میں گیند تھا دیتا مجھے تو دیتی تھی — بلا میں دور سے ہو کر نثار لیتی تھی
گذر گئی مری طفلی تو آہ! کتنی جلد — بدل گئی تری ظالم! نگاہ کتنی جلد
دیا نہ ساتھ جو طفلی نے میرا اے غمخوار! — تو کاش! ویسی ہی بچپن کی رہتی تو دیوار
یہ میں نے مانا کہ بچپن نہ پھر سرا آتا — کر نہ آہ! زمانہ شباب کا
دوتا جو کاش! ضعیفی سے قد مرا ہوتا — تو تجھ سے تکیہ لگانے کا آسرا ہوتا
جلا رہی ہے لہو مجھ کو تیری حالت زار — کہ کچھ دنوں کی تو مہماں ہے اے مری غمخوار!

جگر میں زخم ہیں۔ پہلو میں سینکڑوں ناسور
نہ تمکنت ہے نہ اب وہ شباب کا آہ

جھکا ہی ہے بڑھاپے کی کیا زمیں گیری
ملا کے خاک میں چھوڑے گا عالمِ پیری

تھا اتفاق کہ تیرے قریب آ نکلا
ادھر کو بھول کے یتیں غم نصیب آ نکلا

نصیب پھر ترا دیدار دیکھئے کب ہو
ادھر کو عزمِ دلِ زار دیکھئے کب ہو

جدا میں ہوتا ہوں تجھ سے ترا خدا حافظ!
نکلتی ہے مرے دل سے دعا خدا حافظ!

ہوا لپٹ کے جو دیوار سے جدا میں غریب
دکھا کے بیٹھ جو چپ چاپ چل دیا میں غریب

نگاہِ یاس سے پہلے مری طرف دیکھا
زبانِ حال سے پھر یوں کہا کہ اے بیٹا

مزیست کے دن ہو چکے۔ اجل ہے قریب
کہ پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھی ہوں میں غریب

میہمان کوئی دن کی۔ قضا ہے سر پہ سوار
نصیب تم کو نشست ہو پھر مرا دیدا

نہ بھلانا مری وصیت کو
کہ چھوڑے جاتی ہوں میں یادگارِ عبرت

سمجھ کو نہ تم اس جگہ کھڑا پاؤ
زمیں پہ خاک کا پتلا مرا پڑا پاؤ

... پہ ہو کے نہ اتفاق سے یوں گزر جانا
لب بے زبان لہیں عبرت سے تم نہ کر جانا

بھول کر بھی اسے دیکھنا حقارت سے
کہ پاک تر نہیں صحبت ہو کوئی عبرت سے

(اسمر جہان آبادی)

غزل

فغان و آہ کس امید پر کرے کوئی
وہ کہتے ہیں مرے نالوں سے کیوں تڑپے کوئی

یہی بہ لطف ... وزا ... ل سے
کسی کے حسنِ جاں سوز پہ مرے کوئی

بتوں سے کس کو امید وفا ہے الفت ہے
عبث کسی کی محبت کا دم بھرے کوئی

تری جفاؤں سے اُن کے دل کو سمجھا یا
یہ نامراد نہ مانے تو کیا کرے کوئی

سکھا دیا ہے کہیں آس پاس دانوں نے
کسی سے رہنے لگا ہے پرے پرے کوئی

سوالِ وصل نہیں ہے شوقِ دید نہیں
تمہارا حرج اگر تم پہ یوں مرے کوئی؟

... ہے عشق ... رخار آخر تک
... روگ تو کیوں نہ اجل مرے کوئی

ایک اشد ضرورت اور اُس کی تکمیل

جہاں تک مشاہدہ اور تجربہ کام دے سکتا ہے یہ پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ اس موجودہ زمانے میں شاید ہی کوئی شخص ہو جو تین چار پاپوش ہنگر سال بھر میں توڑ دیتا ہو اور جس طرح اور معاملات میں انگریزی تقلید کو فیشن خیال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح پاپوش کے لحاظ سے بھی بوٹ یا گورگابی پہننا فیشن میں داخل ہو کر ایسا مقبول عام ہو چکا ہے۔ کہ ہر خاص و عام کو انکی ہر وقت ضرورت لگی رہتی ہے جو اعلے درجے کے پائدار فیشن ایبل اور مضبوط بوٹ وغیرہ دستیاب نہ ہونے کی وجہ سے سخت تکلیف محسوس کر رہے ہیں چنانچہ **اس اشد ضرورت** کو پورا کرنے کیواسطے جسکو پبلک بانسی پکار پکار کر ظاہر کر رہی ہے۔ ہم نے اپنے کارخانے میں جو مدت سے شہر سیالکوٹ میں جاری ہے۔ علاوہ آہنی سامان کے تیار کرنے کے عرصہ ایک سال سے چرمی سامان بوٹ گورگابی وغیرہ کے تیار کرانے کا مستقل انتظام کیا ہوا ہے اور بڑے بڑے لائق اور ماہر کاریگر انگریزی کارخانہ جات زر کثیر خرچ کر کے بلائے ہوئے ہیں اور ہر طرز اور فیشن کے ایسے نفیس اور پائدار بوٹ وغیرہ تیار کرائے جاتے ہیں۔ جو بالکل انگریزی ساخت اور طرز کا مقابلہ کرتے ہیں چمڑا اعلے سے اعلے نامور کارخانوں سے بڑی چھان بین سے منگوایا جاتا ہے اور اس کارخانہ کے ساختہ سامان کی مضبوطی اور پائداری شہرہ آفاق ہو چکی ہے۔ ہم نے چونکہ یہ شاخ کارخانہ میں محض رفاہ عام اور ملکی خدمات کے لحاظ سے کھولی تھی اسواسطے صرف ایک سال کی خدمات سے ہماری پابندی کی وجہ سے جو ترقی ہوئی ہے وہ اُن پُرزور ریمارکس اور سارٹیفکیٹس سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جو معزز دوست خوش ہو کر مرحمت فرماتے ہیں۔ چونکہ سچائی اور ایمانداری جو تجارت کا جزو اعظم ہے۔ ہم نے اپنا شعار مقرر کیا ہوا ہے۔ آپ بذریعہ نقد قیمت یا ویلیو پے ایبل تھوڑا سا مال بطور نمونہ منگوا کر تو ملاحظہ فرماویں انشاءاللہ آپ کا انصاف مجبور کریگا اور آئندہ بھی آپ اسی کارخانہ کو بجا آوری خدمات کا موقع دیں گے۔

نوٹ — ہمارے کارخانہ میں اصل سٹیل رنگ اعلے درجہ کے ہر قسم فیشن کے تیار ہوتے ہیں جو ہندوستان بھر میں قدر و عظمت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ آہنی اور چرمی سامان کی ضرورت ہو تو [illegible]

[illegible]

[illegible]

آؤ ہم بتلائیں تجھے ہزار مریض کس طرح صحت یاب ہوتے ہیں

سرمہ کراماتی — مقوی بصر، محافظ بینائی، دافع نزول الماء، دھند، غبار، آب، ڈھلکی وغیرہ۔ قیمت فی تولہ دو روپے ۔ عہ ۔

[illegible] — پیشاب کا بار بار آنا اور شکر رک کر تندرستی نصیب ہو۔ فی تولہ عہ

[illegible] قبض — ایک گولی سے دائمی قبض دور اور تمام عوارض درد سر، ہیجان، تبخیر کا فور آجاتی ہے۔

[illegible] — مصفائی خون، رنگ نکھرتا، گندہ خون کو زہر کو صاف کرتا ہے۔ دافع پھوڑا، پھنسی، ناسور، چنبل، خارش شیشی کلاں، شیشی خورد عہ

[illegible] — [illegible] ۱۲ تولہ ایک روپیہ عہ

[illegible] مرہم [illegible] — درد اعضا رحم و درد کا درد دور ہو۔ [illegible] ۔ عا

[illegible] — [illegible] وغیرہ کے لئے تریاق ہے۔ ۲ ہفتہ [illegible] دور [illegible] عا

[illegible] — دل کو خوشبو کر، علاوہ بال ہر وقت سفید [illegible] ہو [illegible] زکام کو دور کرتا ہے۔ [illegible] فی شیشی ع

[illegible] — اس کے لگانے سے بال بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے عہ ۔

دوائی خارش — رانوں کی خارش اور بدن کے دانے دنوں میں خشک ہو جاتے ہیں۔ ۲ تولہ عا

تریاق استعمال — اخراج بلغم، درد سینہ، سرفہ، کہنہ اور خارش گلو، نزلہ کا بہجانا ہر گز اس کے استعمال سے بند ہو جاتا ہے اور ہر موسم میں کار آمد۔ ایک تولہ کی قیمت دو روپے ۔ ۔ ۔ ۔ عا

حب قائم مقام افیون — چاندو، افیون بلا تکلف اس سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ایک تولہ ع

روغن اعجاز — برسوں کا زخم بھر جاتا ہے۔ بھگندر، ناسور کے لئے اکسیر اور عجیب الاثر ۲ تولہ ع

دوائی درد کان — دو قطرے ڈالنے سے آرام ہوتا ہے۔ ایک شیشی دو سو مریض کو کافی ہے۔

چورن مقوی معدہ — خوش ذائقہ، بھوک لگاتا اور کھانا ہضم کرتا ہے۔ ۴ تولہ ایک روپیہ ع

سنون مستحکم دندان — ہلتے دانت مضبوط اور سفید کرتا ہے۔ ایک روپیہ ع

بڑا الله دافع بخار — دور ہی بخار بخار کا زور ٹوٹے اور پسینہ خوب آتا۔ قیمت ۲ درجن

دمہ یا ضیق النفس — سانس رکنا اور بلغم دور ہو کر صحت ہو جاتی ہے۔

رعنا — چہرہ کے بدنما داغ وغیرہ دور ہو جاتے ہیں۔ ۴ تولہ

سفوف درد گردہ — دورہ درد دور اور ریگ [illegible] خارج ہو جاتی ہے ۴ تولہ

اکسیر شفا — دوائی طاعون بطور علاج و حفظ ما تقدم اس مرض کے حملہ سے محفوظ رہتا ہے۔ غربا کو مفت فی شیشی ایک روپیہ ع

حکیم ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما ایڈیٹر رسالہ حافظ صحت لاہور (موچی دروازہ)